

انیسویں صدی میں

اردو کے ترقیاتی ادارے

محمد امجد علی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

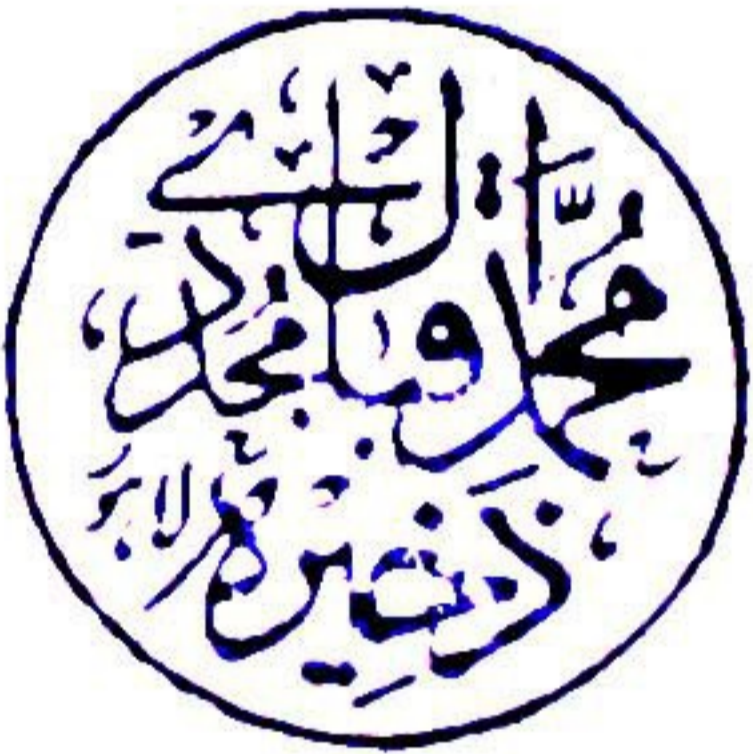
پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ





انیسویں صدی میں

اُردو کے تصنیفی ادارے



ڈاکٹر سید جمیع اللہ

شعبہ اُردو

رانا پرتاپ پوسٹ گزٹجویٹ کالج

سلطان پور

تمام حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

134705

پہلی اشاعت _____ اکتوبر ۱۹۸۸ء

تعداد _____ چھ سو

کتابت _____ ایم عادل ٹانڈوی

طباعت _____ نشاط پریس ٹانڈہ فیصل آباد

پبلشر _____ ڈاکٹر سمیع اللہ

قیمت _____ 48 روپے

:- ملنے کے پتے :-

- ۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶
- ۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ شمشاد مارکیٹ علیگڑھ
- ۳۔ دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ
- ۴۔ نصرت پبلیکیشنز امین آباد پارک لکھنؤ

انتساب

استاذ گرامی

ڈاکٹر سید حنیف احمد نقوی صاحب

کے نام

سمیع اللہ

اس مقالے پر مصنف کو بنارس ہندو یونیورسٹی نے
۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو) کی ڈگری تفویض کی۔

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش
لکھنؤ کے مالی تعاون سے
شائع ہوئی۔

سپاس گزاری

کسی تحقیقی مقالے کی ترتیب کوئی آسان کام نہیں۔ بہ کام جوئے شیر لانے کے مرادف نہ سہی لیکن ہفت خوان رسم کا ہم پہ ضرور ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ یکسوٹی، جگر کاوی اور ان تھک محنت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر مقالہ تاریخی ہو تو بعض اوقات دانتوں پسینہ آنے لگتا ہے اور اگر اس کام سے کسی کا پہلا پہلا سابقہ ہو تو کبھی کبھی ہیچہ منہ کو آنے لگتا ہے، اور کبھی ایسے مراحل بھی پیش آتے ہیں کہ فرار کی راہ ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اس کا سابقہ اور تجربہ ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ مجھے ان سارے حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن خدا کی رحمت اور میرے کرم فرماؤں کی اعانت شامل حال رہی ہے جس کی وجہ سے یہ مقالہ پانچ تیکل کو پہنچ سکا۔ چنانچہ اس موقع پر میرا یہ اولین اور خوش گوار فریضہ ہے کہ میں ان سارے کرم فرماؤں کا شکر ادا کروں جنہوں نے اپنے کمال خلوص سے اس کی ترتیب میں میری اعانت کی ہے۔ سب سے پہلے میں خدا کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جس نے اس مقالے کی ترتیب کے دوران مجھے صحت مند رکھا۔

یہ مقالہ جو آپ کے پیش نظر ہے، استاذ گرامی ڈاکٹر سید حنیف نقوی صاحب ریڈر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر نگرانی تیار کیا گیا ہے۔ ان کی شفقتوں کو رت سے ہی انفا کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا اور نہ شکرینے کا کوئی لفظ میرے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ انہوں نے جس فاضلانہ انداز سے قدم بہ قدم میری رہ نمائی کی، موضوع سے متعلق نہایت مفید کارآمد کیا اب اور نادرہ طلبوعات و مضامین کی فراہمی میں مدد دی اور پھر مقالے کو معتقانہ نظر سے دیکھا اور تصحیح فرمائی دراصل یہ انہی کا حصہ ہے۔ اگر موصوف کی رہ نمائی شامل نہ ہوتی تو یہ کام

اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا تھا۔

استاذی المحترم ڈاکٹر ملک چند نیپر پروفیسر و صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کا بھی میں صمیم قلب سے ممنون ہوں، جن کی بے پناہ محبت و خلوص، فیضان و ہمت افزائی نے مجھے اس کام پر مستعد اور کمر بستہ رکھا۔ موصوف نے اپنی مشنولیتوں اور ذمہ داریوں کے باوجود وقتاً فوقتاً اس مقالے کو دیکھا اور گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

ڈاکٹر قمر جہاں صاحبہ استاذ شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے نہ صرف میرے موضوع سے متعلق کتابوں کی فراہمی میں میری مدد کی بلکہ اس کے ایک حصے کو دیکھا اور تصحیح فرمائی اس لیے میں تہہ دل سے ان کا احسان مند ہوں۔

ماسٹر اکرام الدین احمد مرحوم و مغفور اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا بھی بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے بعض دشواریوں میں میری حتی المقدور مدد کی ہے۔

اس مقالے کی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں مجھے لکھنؤ، الہ آباد اور اعظم گڑھ کا سفر کرنا پڑا۔ الہ آباد میں بیگم ڈاکٹر نکشی ساگر وارشی نے سابق صدر شعبہ ہندی الہ آباد یونیورسٹی اور اعظم گڑھ میں جناب ضیاء الدین صاحب رفیق دار المصنفین نے میری مدد کی ہے اسے میں حین حیات فراموش نہیں کر سکتا، میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس موقع پر مجھے محترمی آغا جمیل صاحب کاشمیری برادر زادہ آغا حشر کاشمیری اور اپنے دوست سید مہدی جید صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے، جنہوں نے میرے لیے اپنی ذاتی لائبریری کا دروازہ ہمیشہ وارکھا۔

پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت میں گھر کا ماحول، والدین کی شفقت اور بھائیوں کا سلوک اور پھر ان کے نقطہ نظر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ خاص طور سے میرے بڑے بھائی جناب صدیق اللہ صاحب نے اوائل عمری ہی سے میری تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رکھا۔ بلا مبالغہ اگر مجھے ان جیسا شفیق بھائی نہ ملا ہوتا تو شاید میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ ان کی شفقتوں کو میں صرف رسمی الفاظ تشکر کے ذریعے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

سمیع اللہ، اکتوبر ۱۹۸۸ء

پیش آہنگ

انیسویں صدی اردو نثر کا عہد رزیا کہی جاتی ہے۔ اس صدی سے قبل اردو نظم ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اور اس کا معیار بھی متعین ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں نثر جمود کے عالم میں پڑی تھی اور کبھی اس کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ ترقی کے میدان میں یہ نظم سے کوسوں دور تھی۔ انیسویں صدی سے قبل اردو نثر کی جتنی کتابیں تصنیف کی گئیں وہ عموماً مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ان کے مصنفین اپنی تصانیف کے چارچھ نسخے کتابت کر کے اپنے اعزہ واقربا اور کتب خانوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ نثر نویسی کا یہ کام انفرادی طور پر سرانجام پاتا تھا۔

دراصل اردو نثر کی ترویج و ترقی کا سہرا ان تصنیفی اداروں کے سر ہے جو انیسویں صدی میں معرض وجود میں آئے۔ ان اداروں نے اردو نثر کے فروغ و اشاعت میں مہینر کا کام کیا۔ یہ ادارے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ ان اداروں کے تذکرے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ بعض کتابوں میں انیسویں صدی کے بعض اداروں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کتاب میں ان کے حالات و خدمات کا کا حقہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس کم کا احساس کرتے ہوئے استاذ گرامی ڈاکٹر سید حنیف نقوی صاحب نے یہی تحقیق کے لیے ”اردو کے تصنیفی ادارے“ کا موضوع تجویز کیا، جس میں ان تمام اداروں کا مطالعہ شامل تھا جو ۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک معرض وجود میں آئے۔ کام کے آغاز کے بعد جب میں نے بعض اداروں سے متعلق فراہم شدہ مواد کا جائزہ لیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ تذکرہ عہد کے تمام تصنیفی اداروں کے تفصیلی مطالعے کے لیے ایک مقالے کے محدود صفحات ناکافی ہیں۔

ڈراشنا مجھے اس موضوع پر جموں یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب دیو ایندر کمار گپتا کے پیش کردہ مقالے کے مطالعے کا موقع ملا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ گپتا صاحب نے ہندو پاک کا دورہ کر کے ۱۸۰۰ء سے ۱۹۲۷ء تک کے تصنیفی و تالیفی اداروں کے حالات اور ان کی تصانیف کی فہرست فراہم کی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انھوں نے تحقیق سے بہت کم سروکار رکھا ہے، مثلاً فورٹ ولیم کالج کے ضمن میں انھوں نے گل کرسٹا کو اس کالج کا پرنسپل لکھا ہے، جبکہ ہمدانکشان سے یہ بات پائیے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں پرنسپل کا کوئی عہدہ ہی نہیں تھا۔ پرنسپل کی جگہ پر پروووسٹ ہوا کرتے تھے، لیکن اس عہدے پر بھی گل کرسٹا کبھی متمکن نہیں رہا۔ اس کے علاوہ کالج کے حالات اور اس کی تصانیف کی فہرست بھی نامکمل ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گپتا صاحب کے مقالے میں انیسویں صدی کے بعض اہم اداروں کے نام بھی ذکر ہونے سے رہ گئے ہیں۔

اب مجھے اس کا احساس ہوا کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۲۷ء تک کے تصنیفی اداروں کے حالات، ان کی تصانیف کی فہرست، ان سے وابستہ مصنفین کے حالات و کوائف نیز ان کے تنقیدی تجزیے کے مباحث کو کسی طرح بھی ایک مقالے میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اپنے نگران کارڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے مشورے سے میں نے ریسرچ کمیٹی میں اپنے مقالے کے زمانے کو محدود کرنے کی درخواست کی۔ کمیٹی نے مجھے اپنے دائرہ کار کو انیسویں صدی کے اداروں تک محدود کرنے کی اجازت دے دی جس کا میں ممنون ہوں۔ اس مقالے کی تصنیف کا مقصد انیسویں صدی کے تصنیفی و اشاعتی اداروں کے حالات و خدمات اور ان کے مصنفین کے حالات اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا پہلا باب فورٹ ولیم کالج پر مشتمل ہے۔ یہ کالج برصغیر ہندو پاک کا وہ عظیم و وسیع ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے باقاعدہ اور منظم طور پر اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا۔

باب کے شروع میں اس کا بچ کے قیام کا پس منظر پیش کرتے ہوئے اس کے قیام کے اغراض و مقاصد پر بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں زمانہ قیام کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد "مالہ و ما علیہ" کے عنوان سے کا بچ کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد کا بچ کے تصانیف کی فہرست درج کی گئی ہے اور آخر میں اس کے مصنفین کے مختصر لیکن جامع حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو مصنفین کے حالات میں طوا لبتا کا احساس ہو کیونکہ اردو ادب کے تقریباً سبھی مورخوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات قلم بند کیے ہیں، خاص طور پر مولوی سید محمد اور ڈاکٹر جاوید نہال نے بالترتیب "آرٹس نثر اردو" اور "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کے عنوان سے اس کے مصنفین کے منسل حالات لکھے ہیں۔ میرے خیال سے مصنفین کے ذکر کے بغیر کالج کا ذکر شہ نہ رہ جاتا۔ مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ میں نے ماقبل کے مورخین کی تحقیق کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور بعض مصنفین کے حالات زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، جن پر اب - کتا تاریکی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

دوسرے باب میں دلی کالج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بندوستان کی پہلی درس گاہ تھی، جس میں مشرقی علوم والسنکے پہلو پہ پہلو سائنس اور جدید علوم و فنون کی تعلیم کا مکمل انتظام کیا گیا تھا۔ اس باب کے شروع میں کالج کے قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں، اس کے بعد قیام کے زمانے کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے، اب ازاں اس کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد کالج میں تصنیف شدہ کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کتابوں کی بھی فہرست درج کی گئی ہے جو انصافی اور ریاست کے پیش نظر کالج کی جانب سے شائع کی گئی تھیں اور آخر میں اس کا بچ کے اساتذہ اور مصنفین کے حالات اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے حالات تیسرے باب کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بندوستان کا پہلا ادارہ تھا جس کا قیام بندوستانیوں کی فکر و سازگار رہن منت ہے۔ اس کا قیام سنہ ستاون کی جنگ آزادی کے بعد عمل میں آیا تھا، اس لیے اس منظر کے نلو پر جناب صاحب نے کافی

کے بعد کے بدلے ہوئے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کی ترتیب بھی متذکرہ بالا ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے۔ مثلاً پہلے قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد کا ذکر ہے۔ بعد ازاں زمانہ قیام کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے، اس کے بعد اس کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر سوسائٹی کی ترجمہ شدہ کتابوں کی فہرست اور آخر میں اس کے بانی سر سید احمد خاں اور سوسائٹی سے متعلق ان کے رفقاء کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں انیسویں صدی کے ان تمام باقی ماندہ اداروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو علم و ادب کی ضیا پاشیوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چونکہ ان سارے اداروں کا ذکر ایک ہی باب میں سمیٹا گیا ہے اس لیے ان پر تفصیلی بحث نہیں آسکی ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی تاریخ اور خدمات کا کوئی گوشہ نظر انداز نہ ہونے پائے۔ مثلاً قیام کے مقاصد، مختصر تاریخ اور ان کی تصنیفی سرگرمیوں کی نشاندہی وغیرہ۔

پانچویں باب میں پورے مطالعے کا حاصل نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو نشر کی ترویج و ترقی ان اداروں کے بغیر محض دو تہائی صدی میں ممکن نہ تھی۔

ضمیمے کے تحت شروع کے تین اداروں سے متعلق وہ معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مضمون کی طوالت کے خوف کی وجہ سے درج نہیں کی جاسکیں۔ "ماخذ و مصادر" کے ضمن میں ان کتابوں اور اخبارات و جرائد کی فہرست (Bibliography) پیش کی گئی ہے، جن کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دیا گیا ہے۔

سمیع اللہ

۱۱۔ جولائی ۱۹۸۱ء

۹۷	ایسٹ انڈیا کالج ہیل بری کا قیام اور کالج	۵۹	(الف) انگریز مصنفین
۹۷	کاچھوٹا روپ		جان بار تھوڈک گل کرسٹا
۱۰۹	موسٹا کا استعفا	۶۰	تھامس روک
۱۱۲	ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے صدر اور پرفیسر	۶۱	فرانسس گلیڈون
۱۱۳	اردو ہندی میں تفریق	۶۲	ولیم ٹیلر
۱۱۳	کالج کونسل کے سکریٹری کی حیثیت سے لاکٹ کا تقرر	۶۳	ولیم ہنٹر
۱۱۶	ہندوستانی شعبے میں اہم تبدیلیاں	۶۴	ولیم پرائس
۱۱۷	کالج کے دستور میں تبدیلی	۶۵	(ب) ممتاز ہندوستان مصنفین
۱۱۷	ٹیلر کی کالج سے سبکدوشی	۶۵	بہادر علی حسینی
۱۱۹	کالج کے نر وال کا زمانہ	۶۵	میر شیر علی افسوس
۱۲۳	پرائس ہندوستانی شعبے کے صدر اور پرفیسر	۶۵	تارنی چرن متر
۱۲۶	اورنٹل انسٹی ٹیوٹ کا قیام	۶۶	مرزا کاظم علی جواں
۱۲۸	اردو ہندی تنازعے کا عروج	۶۷	مظہر علی خاں ولا
۱۳۲	منشیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام کا تقرر	۶۹	میر امن
۱۴۰	کالج کا برائے نام وجود	۶۹	حیدر بخش حیدری
۱۴۴	کالج میں پروفیسروں اور منشیوں کے عہد ختم	۷۰	خلیل علی خاں اشک
۱۴۹	کالج میں جدید طریقہ تعلیم	۷۱	امانت اللہ شیدا
۱۵۰	پروفیسروں اور منشیوں کو نیشن	۷۱	للولال کوی
۱۵۲	پرائس اور رڈول کی کالج سے کنارہ کشی	۷۲	مولوی اکرام علی
۱۵۶	کالج کا خاتمہ	۷۳	مولوی معین الدین
۱۵۷	فورٹ ولیم کالج: مالہ و ماعلیہ	۷۵	لالہ کاشی راج
۱۵۷	فورٹ ولیم کالج کی ایفات	۸۳	منصور علی
۱۵۹	کالج کے ملازم مصنفین اور ان کے کارنامے	۹۶	مرزا محمد فطرت

۲۰۹	اشپینگر دلی کالج میں	۱۵۹	منیر بخش علی
۲۱۰	گارگل پرنسپل	۱۶۰	سدل مسرینڈت
۲۱۱	۱۸۵۷ء کا بنکامہ	۱۶۲	میر مدین الدین فیض
۲۱۲	کالج کی نشاۃ الثانیہ	۱۶۲	سید علی جعفری
۲۱۳	کالج کا زوال اور خاتمہ	۱۶۵	(ج) غیر معروف مصنفین
۲۱۴	دلی کالج دوسرے نام اور شکل میں	۱۶۶	(الف) کالج کے غیر ملازم مصنفین
۲۱۵	دلی کالج کی تاریخ کے دیگر گوشے	۱۶۶	رائے بنی نراین دہلوی
۲۱۸	دلی کالج کے اجتہادی اور تعمیری کارنامے	۱۷۱	مرزا علی لطف
۲۲۵	دلی سوسائٹی کی تالیفات اور تراجم	۱۷۳	نبال چند لاہوری
۲۳۵	دہلی کالج کے مصنفین	۱۷۴	مرزا جان پیش
۲۳۷	الف نامور اساتذہ اور ائمہ کے نام	۱۷۶	باسط خاں
۲۳۷	ڈاکٹر الایز اشپینگر	۱۷۷	اب غیر معروف مصنفین
۲۴۲	مولانا مملوک العلی نالوتوی	۱۷۹	دوسرا باب دلی کالج
۲۴۵	مولانا امام بخش ستبانی	۱۸۱	قیام کے حرکات اور اغراض و مقاصد
۲۵۱	پنڈت رام کش	۱۹۵	زمانہ قیام کی مختصر تاریخ
۲۵۲	جوزف منری ٹیلر	۱۹۵	کالج کی مجالس انتظامیہ
۲۵۳	مولوی حسن علی خاں	۱۹۷	کالج میں انگریزی یا مغربی شعبے کا قیام
۲۵۴	میر اشرف علی	۱۹۷	اعتاد الدولہ کا سداقہ جاریہ
۲۵۴	منشی حسین	۱۹۹	تعلیمی تاریخ کا نیا دور
۲۵۵	منشی وزیر علی	۲۰۱	لارڈ آکلینڈ کی آمد
۲۵۵	مولوی احمد علی	۲۰۲	بوٹر و پرنسپل
۲۵۶	مولوی بیوان بخش	۲۰۹	مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام
۲۵۶	پروفیسر سجاد	۲۰۹	بوٹر و کامیونٹی اسٹاف

۳۱۰	زمانہ قیام کی مختصر تاریخ	۲۵۷	ماسٹر نور محمد
۳۱۰	سوسائٹی کی علی گڑھ منتقلی	۲۵۷	راوہا کشن
۳۱۱	کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے منتقلی	۲۵۸	اجودھیا پر شاد
۳۱۳	سوسائٹی کے بلڈنگ عمارت کی تجویز اور نمبر		(ب) ممتاز طلبہ اور ان کے کارنامے
۳۱۴	عمارتن، بٹرن، افتتاح	۲۵۸	ماسٹر رام چند
۳۱۵	کتب خانے کی تنظیم	۲۶۵	مولوی ذکار اللہ
۳۱۵	کتابوں کی تصنیف کے لیے گورنمنٹ سے امداد	۲۷۰	مولوی کریم الدین
	کی اپیل	۲۷۸	مولانا محمد حسین آزاد
۳۱۶	سوسائٹی کے جلسوں میں لکچروں کا سلسلہ	۲۸۲	ڈپٹی نذیر احمد
۳۱۶	سوسائٹی کی امداد	۲۸۷	پی ایسے لال آشوب
۳۱۶	سرکس کا عطیہ	۲۸۹	میر ناصر علی
۳۱۷	گورنمنٹ کی امداد	۲۹۲	مولوی شیخ ضیاء الدین
۳۱۷	نوابین اور مہاراجوں کے عطیات	۲۹۳	موتی لال دہلوی
۳۱۸	سوسائٹی کی طرف سے بٹرن انڈین	۲۹۵	پنڈت دھرم نارین
	ایسوسی ایشن کا قیام	۲۹۵	حکم چند
۳۱۹	سوسائٹی کی طرف سے اخبار کا اجرا	۲۹۶	منشی شیونرائن اور پنڈت سروپ رائن
۳۲۲	راجہ جے کشن داس: سوسائٹی کے	۲۹۷	پتھر
	نگراں اور سرکریٹری	۲۹۷	مدن گوپال
۳۲۳	سوسائٹی کی آمدنی کی ایک اور تدبیر	۲۹۸	پیرزادہ محمد حسین
۳۲۵	کتابوں کی تصنیف کے لیے گورنمنٹ سے	۲۹۸	مولوی محمد باقر ولی کالج کے معلم تھے نہ حالی معلم
۳۲۵	امداد کی مکرر اپیل	۳۰۰	مفتی صدر الدین آزرہ اور ولی کالج
۳۲۶	راجہ جے کشن داس کا استعفا		تیسرا باب: سائنٹسک سوسائٹی
۳۲۶	سوسائٹی کا زوال اور خاتمہ	۳۰۵	قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

۳۷۵	مطبع نول کشور لکھنؤ	۳۲۸	سائنٹفک سوسائٹی: تنقیدی جائزہ
۳۷۷	منشی نول کشور کا اخبار	۳۳۲	سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم
۳۷۸	اخبار کے چند اہم ایڈیٹر	۳۳۳	سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا
۳۷۸	مطبع نول کشور کا شعبہ تصنیف و تالیف	۳۳۴	سر سید احمد خاں
۳۷۹	شعبہ تصنیف و تالیف کے چند اہم ملازمین	۳۳۱	سر سید کے نامور رفقا
۳۸۰	مطبع نول کشور کی چند ادبی کتابیں	۳۳۲	نواب محسن الملک
۳۸۲	محمد ن لٹریچر سوسائٹی، کلکتہ	۳۳۵	نواب وقار الملک
۳۸۵	انجمن پنجاب لاہور	۳۵۰	نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی
۳۸۷	دہلی سوسائٹی	۳۵۲	مولانا وحید الدین سلیم
۳۸۸	سوسائٹی کے اہم جلسے	۳۵۸	مولوی سمیع اللہ
۳۹۱	کتابوں کی ترتیب و طباعت سوسائٹی کا اتحاد	۳۶۰	راجہ جے کشن داس
۳۹۵	جلسہ تہذیب لکھنؤ	۳۶۱	حاجی محمد اسماعیل خاں
۳۹۶	یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور		چوتھا باب
۴۰۱	انجمن اسلام بمبئی	۳۶۲	متفرق ادارات
۴۰۶	سندھ مدرسہ اسلامیہ کراچی	۳۶۵	فورٹ سینٹ جارج کالج، دہلی
۴۰۷	انجمن حمایت الاسلام	۳۶۶	تعلیمی شعبہ
۴۰۸	محمد ن ایجوکیشنل کونفرنس ملی گڑھ	۳۶۶	کالج کے اساتذہ
۴۰۹	اردو لٹریچر پروڈکٹس سوسائٹی بمبئی	۳۶۷	کالج کا کتب خانہ
۴۱۲	پانچواں باب۔ حال مطالعہ	۳۶۸	اساتذہ و طلبہ کو انعام
۴۲۱	ضمیمہ: (الف)	۳۶۹	کالج کا خاتمہ
	ضمیمہ: (ب)	۳۷۱	کالج کی تصانیف
	ضمیمہ: (ج)	۳۷۲	ایجوکیشنل کمیٹی کلکتہ
	ماخذ و مصادر	۳۷۴	آرکیولوجکل سوسائٹی دہلی

پہلا باب

فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

انگلینڈ کے چند سوداگروں نے باہمی شرکت سے تیس لاکھ روپیے کا سرمایہ جمع کیا اور ہندوستان میں تجارت کرنے کی غرض سے ۱۵۹۹ء میں ایک کمپنی قائم کی جس کے لئے انہوں نے اسی سال ملکہ ایلزبتھ سے چارٹر حاصل کیا اور اس بات کی بھی سند حاصل کی کہ پندرہ برس تک بغیر ان کی اجازت کے انگلینڈ کا کوئی شخص بلادشرقی میں تجارت نہ کرنے پائے۔ ۱۶۱۵ء میں شاہ برطانیہ جیمس اول کا سفیر سر ٹامس روشا ہیجاں کے دربار میں آیا اور اپنی عیاری و چرب زبانی سے سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی جس کے لئے انگریز تاجروں نے تین روپیے آٹھ آنے فی صد محصول دینا منظور کر لیا۔ اس طرح سے وہ اپنی ہوشیاری اور حکمت عملی سے سورت کو اپنی تجارت کا صدر مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۶۲۲ء میں ایک اور کارخانہ موسلی ٹم میں قائم کیا گیا، اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک قلعہ "سینٹ جارج" کے نام سے مدراس میں تعمیر کیا گیا۔ چارلس دوم کی تاج پوشی کے بعد اس کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہو گئی اور شہزادی اس کو جہیز میں ملا۔ ۱۶۶۸ء میں شاہ چارلس نے سو روپیے سالانہ خراج پرتگالی کے انتظام کے ذمہ داری کمپنی کے سپرد کر دی۔ اس طرح سے جنوبی ہند کے تین اہم مقام سورت، مدراس اور بمبئی پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ چونکہ بنگال ہندوستان کا سب سے زرخیز علاقہ تھا اس لیے انگریزوں

۱۔ شیو پرتھو راجہ ستارہ ہند، آئینہ تاریخ، ترجمہ اتھاس امرنا شک ص ۵
۲۔ ایضاً ص ۵

کی نظریں اس پر بھی پڑیں، اور وہ وہاں بھی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔
ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی نبرد آزمانی میں انگریزوں کو کامرانی و کامیابی حاصل
ہوئی تو ان کے حوصلے اور بڑھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ بنگال پر کسی طرح سے ان کا تسلط
و اقتدار قائم ہو جائے۔ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) میں نواب سراج الدولہ کی شکست فاش
سے انگریزوں کی یہ مراد بھی برآئی۔

اورنگ زیب کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور صولت و دولت
روز افزوں زوال پذیر تھی۔ ملک میں ہر طرف انار کی اور طوائف الملوکی چھائی ہوئی تھی۔
”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ جس کو جہاں موقع ملتا وہ وہاں کا بادشاہ بن جاتا اور اپنے
حریفوں کو قتل کر ڈالتا۔ پروفیسر حکم چند نیر نے اس عہد کے ہندوستان کا مختصر لیکن جامع
نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”... اورنگ کی وفات (۱۷۰۷ء) اور بہادر شاہ ظفر کی معزولی

(۱۷۵۷ء) کے درمیان کا زمانہ مغلیہ سلطنت کا نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ اس
ڈیڑھ صدی میں متل شہنشاہوں کی حالت چند در چند وجہ سے حکومت کی
بساط پر شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ کی نہ تھی جس کی نقل و حرکت وزیر کے تابع
ہوتی ہے۔ سلطنت کا شیرازہ بکھربا تھا۔ اس زمانے میں کیسی کیسی تبدیلیاں نہیں
ہوئیں کیا کیا انقلاب نہیں آئے۔ بہادر شاہ اول کی تجبیز و تکفین کا اہتمام ایک ماہ
تک نہ ہو سکا۔ جہاں دارشاہ کی عیاشیوں نے لال کنور نام کی طوائف کو درباری
اعزاز عطا کیا۔ فرخ سیر کی آنکھوں میں لوگوں نے سلائیاں پھرتی دیکھیں۔ محمد شاہ
زنگیلا تو رنگیلا ہی تھا۔ نادر شاہ کے قتل عام اور لوٹ مار نے سلطنت کی زندگی
پر کاری ضرب لگائی اور شاہان ہند کو اب تخت طاؤس کی بجائے تختے پر چڑھنا
پڑا۔ احمد شاہ کو عماد الملک کے اشارے پر اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔ شاہ عالم
کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے نکال لیں۔ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک کے درمیان
احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر نو حملے کیے۔ طاقت و امرانے اپنی خود مختاری

اور بادشاہیت کا اعلان کر دیا تھا۔ روہیلوں، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے دلی کی رہی رہی آبرو بھی لوٹ لی۔ مرکزی سلطنت کا اندازہ ”سلطنت شاہ عالم از دلی تاپالم“ کی مشہور کہاوت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ دکن اودھ اور بنگال کے صوبے دار بادشاہ بن چکے تھے۔ پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ باقی ملک مرہٹوں اور کمپنی بہادر کے زیر نگیں تھا۔^۱

۱۸۵۶ء تک کمپنی کو ملک فتح کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ کمپنی کے ڈائریکٹر گورنر جنرلوں

کو بارہا متنبہ کرتے کہ وہ ہندوستان کے اندرونی معاملات میں مغل نہ ہوں، لیکن ملک کے بگڑے ہوئے حالات اور ان کی حرصیں نگاہیں دخل اندازی کے لیے انہیں مجبور کرتی تھیں۔ آخر کار ۱۸۵۶ء میں ایک قانون پاس ہوا جس میں گورنر جنرل کو سپہ سالار اعظم تسلیم کر لیا گیا۔^۲ علاوہ بریں کونسل کی کثرت رائے کو رد کرنے کا اختیار بھی گورنر جنرل کو دے دیا گیا اس قانون سے ایسٹ انڈیا کمپنی صرف ایک تجارتی کمپنی ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بن گئی۔ اب ایسے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں اس داں کرنے کا قانونی اختیار بھی حاصل ہو گیا۔

بکسر کی جنگ (۱۸۵۷ء) میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور دلی کے بادشاہ شاہ عالم نے بنگال کے نواب میر قاسم کو نہ صرف عسکری کمک پہنچانی تھی بلکہ کھل کر اس کا ساتھ بھی دیا تھا۔ اس لیے اس شکست کے بعد انگریزوں نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی گوشمالی کی۔^۳ بن کے گیڈر جاتے کدھر۔ دونوں نے طوعاً و کرہاً اور چار و ناچار انگریزوں کی شرطیں قبول کر لیں اور ان کے کیمپ میں داخل ہو گئے، جس سے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد اور مستحکم ہو گئی۔ انگریزوں کی حکمت عملی اور جارحانہ رویے سے اب ان کی سلطنت کا حلقہ اثر بنگال سے بڑھ کر دلی تک پہنچ گیا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت

^۱ سرور جہان آبادی جیات اور شاعری ص ۱۰

^۲ ڈاکٹر ایشوری پرشاد، اے بیو ہسٹری آف انڈیا ریویوز ڈیپارٹمنٹ (دردو) ص ۱۱

^۳ ایضاً ص ۱۱۲

اور میسور پر آمرانہ و بہیمانہ قبضہ اور دوسری فتوحات نے حالات اور بدل دیے۔ یہاں کے رجواروں کے باہمی تصادم، نوابوں اور بادشاہوں کے آپسی تنازعوں اور ملک کی سیاسی تاریخ کے غائر مطالعہ نے انگریزوں کو یقین دلادیا کہ ہندوستان میں ان کی سیاسی قوت نہ صرف روز افزوں ترقی پذیر ہے بلکہ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف ہمیں ہم ہوں گے اور عنان حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں ہوگی۔ کسی اجنبی ملک میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے وہاں کی زبان سے کما حقہ واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ پھر کمپنی کے سول ملازمین ایک تجارتی ادارے کے ایجنٹ ہی نہیں رہ گئے تھے جیسا کہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کی یادداشت میں کہا تھا۔ ”کمپنی کے انگریز سول سرورٹس کو محض ایک تجارتی ادارے کا ایجنٹ نہیں سمجھا جاسکتا، وہ اب دراصل ایک طاقت ور شہنشاہ کے وزیر اور افسر ہیں۔ چنانچہ ولزلی نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ ملازمین دیسی زبانوں سے واقف ہوں تو انھیں یہاں کے انتظام میں مزید سہولتیں بہم پہنچ سکتی ہیں۔ جہاں تک مشرقی زبانوں کا تعلق تھا کمپنی فارسی کا استعمال کرتی تھی۔ اچھی یا کام چلاؤ فارسی جاننے والوں کو کمپنی کے اعلیٰ افسر سرانکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ لیکن بنگال پر قبضہ کے بعد انھیں ملکی زبان سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے مالی اور فوجی شعبوں میں پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ دیسی سپاہی اپنے صوبے کی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں سمجھ پاتے تھے۔ ایسی حالت میں ملک کی مروجہ زبان کی تعلیم کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شروع میں کمپنی کے گنے چنے ملازم دیسی زبانوں کی طرف مائل ہوئے لیکن ۱۵ جنوری ۱۸۰۲ء کو ایشیا تک سوسائٹی آف بنگال کے قیام کے ساتھ یہ رجحان تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ خود وارن ہیٹنگز نے فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبان کی تعلیم بڑی حد تک حاصل کر لی تھی۔ کمپنی کے مشہور ملازمین ولفورڈ، شور، گرک پیٹرک، گلیڈون، گلٹن، ڈاکٹر ہیرس وغیرہ نے ملک کی عوامی زبان سے بقدر استطاعت و ضرورت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن باقاعدہ اور منظم طور پر کمپنی نے ابھی تک دیسی زبانوں کی تعلیم کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تو اس غرض سے ایک مستقل تعلیمی

۱۰ بحوالہ مقدمہ گنج خوبی از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۱۱۱ اور *Crichnistan the Language of Hindoostan P. 15*

ادارہ فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ولزل کے نزدیک کمپنی کے ملازموں کے لیے دیسی زبانوں کی تعلیم کی زیادہ اہمیت اس لیے بھی تھی کہ وہ ملازمین کم سنی میں ہندوستان آتے تھے جن کو کوئی سیاسی شعور اور تجربہ نہیں ہوتا تھا۔ بقول خواجہ احمد فاروقی

”... یہ ملازم عام طور پر ۱۵ اور ۱۶ برس کی عمر میں ہندوستان بھیج دیے جاتے تھے اور اکثر و بیشتر بد شوق یا بد اطوار طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ جن کی کھپت گھر میں نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے لارڈ ولزل نے یہ تجویز پیش کی کہ انگلستان سے آنے والے کمپنی کے یہ ملازمین ہندوستان پہنچنے کے بعد کم سے کم تین برس ایک ایسے ادارے میں تعلیم حاصل کریں جو انھیں ہندوستانی زبانوں سے، یہاں کی تاریخ و تہذیب اور یہاں کے قوانین سے آشنا کر سکے۔ ساتھ ہی مغربی دستور کے مطابق وہ تعلیم بھی دی جائے جس سے وہ اس لیے بھی محروم ہو جاتے ہیں کہ انھیں کم سنی میں انگلستان کو خیر باد کہہ کر ایک اجنبی دیس میں آنا پڑتا ہے۔“

رام بابو سکسینہ نے فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دو مقاصد بتائے ہیں۔ اولاً سیاسی ثانیاً اخلاقی وہ لکھتے ہیں۔

”انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلے میں بڑے بڑے قلعے ملک حاصل کر لیے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ ان کے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ ان کے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تجارتی تعلقات یونانیوں نام ہوئے جاتے تھے مگر انتظامی، املاات بڑھتے جاتے تھے مترجم جن کے ذریعے سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال یا تاجر سمجھ سکتے تھے اب بے کار ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی قوم تا وقتکہ مفتوح قوم کی زبان اور رسم و رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کما حقہ

۱۷ - مقدمہ گنج خوبی ص ۱۷ - ۱۸

بلا واسطہ واقف نہ ہوگی اس پر پورے طور پر حکومت نہیں کر سکتی۔ اور انہ
سب باتوں کے لئے ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہذا۔
... یہ اکیدی حکم دے دیا کہ آئندہ سے ان کے حکام مقامی اپنے عمال کے
واسطے ویسی زبانوں کے (کذا) کا حقہ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔“

اخلاقی مقصد کے متعلق ان کا بیان ہے کہ

”چونکہ بڑے بڑے قطععات ملک انگریزی عمل داری میں داخل
ہوتے جاتے تھے۔ لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا
کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے چنانچہ
اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں سے
کی وجہ سے لوگوں کے اندر تعلیم میں پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت
صدمہ پہنچ رہا تھا اب دور ہو جائے۔“

رام بابو سکسینہ کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس
ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ
فورٹ ولیم کالج کے قیام میں برطانوی پارلیمنٹ کا سر مو بھی دخل نہ تھا۔ اور ڈاکٹر کٹر بھی تعلیم
پر کیے گئے اخراجات کو پسند نہیں کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء سے پہلے انگریزوں نے ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے سلسلے
میں کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا۔ کیوں کہ ان دنوں تعلیم خود انگلستان میں اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں
نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے وقت اگر کمپنی کے پیش نظر کچھ اخلاقی پہلو بھی ہوتے
تو اس کے آئین و ضوابط میں ان پہلوؤں سے چشم پوشی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کالج کا آئین

۱۔ تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۲

۲۔ ایضاً ص ۵-۴

۳۔ نور اللہ و نایک، تاریخ تعلیم ہند ص ۸۳

اور قواعد و ضوابط منضبط کرتے وقت تمہید کے طور پر کالج کے اغراض و مقاصد کا با تفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی پہلو کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ اس تمہید کے مطالعے سے بخوبی کہا جاسکتا ہے۔ جسے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

”ہر گاہ کہ پاک پروردگار کو منظور تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کے منصوبوں اور

فوجوں کو انگلستان میں مسلسل خوشحالی اور شان و شوکت کے راستے پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور ہر گاہ کہ پے پے کئی جنگوں کی فتح مندی پر منتج ہونے سے اور ایک منصفانہ، دانش مندانہ اور معتدل پالیسی سسٹم کے خوشگوار نتیجے کے طور پر ہندوستان میں اور دکن میں وسیع و عریض علاقے پر برطانیہ عظمیٰ کے زیر نگیں اور آئرلینڈ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے تحت آگئے ہیں۔ مرور وقت سے ایک عظیم اور طاقت ور ایمپائر کی بنیاد پڑ گئی ہے جو متعدد کثیر آبادی رکھنے والے اور مال و زر سے معمور صوبجات پر مشتمل اور متحد اتوام کو محیط ہے، جو مذہبی اعتقادات میں، زبان میں، اطوار و عادات میں اختلاف رکھتی ہیں اور اسی ترتیب سے وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے مخصوص رواجوں، اصولوں، نظریوں اور قوانین کے مطابق ان پر حکمرانی کی جائے۔

اور ہر گاہ کہ برطانوی قوم کا مقدس فرض، حقیقی مفاد، وقار اور پالیسی اس کے متقاضی ہیں کہ تمام زمانوں کے لیے ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کی عمدہ طور پر حکومت کے لیے اور اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی مسرت اور خوشحالی کے لیے ایک ٹوٹا ہوا اہتمام کیا جائے، چنانچہ بہت سے دانشمندانہ اور سود مندانه ضوابط وقتاً فوقتاً گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے اس کریمانہ عزم و ارادہ اور غرض و مقصد سے جاری کیے جاتے رہے ہیں کہ لوگوں کو جن کا ذکر ہوا ان کے اپنے قوانین، رواجات اور رسوم، برطانوی آئین کی نرم مزاج اور مشفقانہ اسپرٹ کے ساتھ حکومت زیر انتظام و انصرام

لایا جائے۔ اور ہر گاہ کہ یہ ناگزیر طور پر ضروری ہے کہ ان مذکورہ دانش مندانہ، سود مندانہ اور کھیمانہ ضوابط کی آنے والے ہر زمانے میں مناسب تعمیل اور انتظام و انصرام کو محفوظ بنایا جائے، نیز ایسے ضوابط اور قوانین کی مناسب تعمیل اور انتظام و انصرام کو بھی جو آئندہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے جاری کیے جائیں اور یہ کہ آئرلینڈ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے وہ سول ملازمین جو حکومت ہندوستان کے اعلیٰ اور اہم کارہائے منصبی انجام دے رہے ہیں، اپنے مناصب اور مقامات تقرر کے دشوار فریض کی انجام دہی کے لیے مناسب طور پر لیاقتوں کے حامل ہوں، ادبیات اور سائنس کے عمومی اصولوں میں کافی طور پر تعلیم پائے ہوئے ہوں، نیز برطانیہ کے قوانین، حکومت اور آئین سے اور ہندوستان اور دکن کی متعدد دیسی زبانوں سے بھی واجب طور پر واقف ہوں اور ان اصولوں کے قوانین، رواجات اور رسوم سے بھی واقف ہوں جہاں یہ مذکورہ سول ملازمین حاکم مقرر کیے جا سکتے ہیں۔

اور ہر گاہ کہ جن اشخاص کو آئرلینڈ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول ملازمت کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم اور مطالعے کا ابتدا ہی میں خلل پذیر ہو جانا انھیں محروم کر دیتا ہے کہ وہ ہندوستان پہنچنے سے قبل ایسی تحصیلات کی بنیاد ڈال سکیں کہ ادبیات اور سائنس کے عمومی اصولوں سے واقفیت یا برطانیہ عظمیٰ کے قوانین، حکومت اور آئین کی کافی معلومات حاصل کر لیں اور ہندوستان میں سول ملازمت کے دشوار اور اہم فرائض کی مناسب طور پر انجام دہی کے لیے درکار لازمی لیاقتیں پوری طرح حاصل نہیں ہو پائیں، جو بہ صورت دیگر ہندوستان میں تعلیم و مطالعہ کے ایک باقاعدہ نصاب کی تکمیل سے ہو سکتی ہے، جسے ان مقبوضات کی حکومت اعلیٰ ترین مقدرہ کی نگرانی، ہدایت و رہنمائی اور کنٹرول میں رو بہ عمل لارہی ہو۔

اور ہر گاہ کہ ہندوستان میں کوئی پبلک ادارہ ایسا موجود نہیں ہے جس کے تحت آئرلینڈ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمت میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں مقرر ہونے والے جو نیر ملازمین، ان اعلیٰ اور مشکل فرائض

منصبی کے لحاظ سے آگے چل کر انھیں مامور کیا جانا ہے، ضروری لیاقتوں کی تحصیل کر سکیں اور کوئی نظام، ڈسپلن کا یا تعلیم کا ہندوستان میں اس غرض سے قائم نہیں کیا گیا ہے کہ مذکورہ جو نیر ملازمین کی تعلیم میں رہنمائی کی جائے اور اسے باقاعدہ بنایا جائے، یا اول اول ہندوستان پہنچنے پر طور طریق کے باب میں ان کی رہنمائی کی جائے یا ان کے اخلاقیات کی تعمیر، اصلاح اور حفاظت کی جائے یا سعی و محنت، دیانت اور مذہب کی باقاعدہ اور منظم راہ و روش پر چل کر ہندوستان میں برطانیہ کے نام کی عزت کو بحال و برقرار رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اشرف الاشراف، رچرڈ مارکولیس ویلزی، نائٹ آف دی اسٹریٹس آف آرڈر آف سینٹ پیٹرک وغیرہ وغیرہ، گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کے استحکام اور عمدہ حکومت کے لیے ڈسپلن تعلیم اور مطالعے کے ایک ایسے ادارے اور نظام کے قیام کو ناگزیر باور کیا ہے اور اس لیے ہزلارڈ شپ نے حکم جاری کیا ہے۔

دستور کے محولہ بالا تمہیدی کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد ویسی زبان و ادب کی ترویج و ترقی تھی نہ ہندوستانی رعایا کی فلاح و بہبود، بلکہ اسے ہندوستان پر حکم رانی کرنے، اپنی معاشی حالت بہتر بنانے اور اپنی سیاسی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ صدیق الرحمن قدوائی لکھتے ہیں۔

”فورٹ ولیم کالج کے مقاصد کے بارے میں دورائیں نہیں ہو سکتیں، اس کے قیام کا مبینہ مقصد ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود نہ تھی، بلکہ برطانوی سول اور فوجی افسروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم تھا۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے ہندوستانی رعایا کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ہندوستان میں برطانوی

اقدار کو مستحکم بنانے میں مدد کر سکیں۔ کالج کے قیام کی مہم کو مفید اور قابل قبول بنانے کے لیے جو انسانی فلاح و بہبود کی بجائیں چھڑی گئی تھیں ان کا واحد مقصد برطانوی شہنشاہیت کو استحکام بخشنا اور اس کے نقائص کو دور کرنا تھا۔

شانتی رجن بھٹا جاریہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے متعلق لکھتے ہیں۔
 ”انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں کی ترقی سے کوئی دل چسپی نہ تھی، نہ وہ ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اور نہ ہی ہندوستان کی ترقی سے انھیں کوئی دل چسپی تھی۔“
 وفاراشدی رقم طراز ہیں۔

”کالج کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعے امور سیاست اور تنظیم اور ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں اور انقوی کا دو ٹوک فیصلہ ہے کہ

”فورٹ ولیم کالج کانٹری و بستان ایک سیاسی منفعت کی خاطر معرض وجود میں آیا۔“

پھر دلزلی کے نزدیک فورٹ ولیم کالج کی سیاسی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ کورٹ کے طرف سے اس کے توڑ دینے کا حکم دیے جانے کے بعد اس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ”اس معاملے میں کورٹ کے حکم کی اگر تعمیل کی جاتی تو اس وقت جو فتنے برپا ہوتے ہیں بیان نہیں کر سکتا، کالج کو قائم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی۔“

Christ and the Language of Hindoostan p 28

۱۸۷۸ء بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۸-۷

۱۹۰۷ء بنگال میں اردو ص ۱۶

۱۸۷۸ء مقدمہ اخوان الصفا ص ۵

۱۸۷۸ء بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۱

بہر حال فورٹ ولیم کالج کا مقصد ایسے انگریز حکمران اور کارپرداز پیدا کرنا تھا جو ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مضبوط و مستحکم بنانے کے اہل ہوں جن کے لیے ہندوستانی زبان وادب کے علاوہ ہندوستانی رسم و رواج، تاریخ و جغرافیہ اور مذاہب و قوانین کی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری تھا تاکہ ہندوستان کے جن علاقوں میں وہ مامور کیے جائیں وہاں کے لوگوں سے رابطہ قائم کر کے وہاں کا نظم و نسق بہتر طور پر انجام دے سکیں۔

لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل محرک گل کرسٹ اور اس کا اور نیل

سمنری *Oriental Seminary* یا مدرسہ ہندی تھا۔ کیوں کہ گل کرسٹ نے ہندوستان میں وارد ہوتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستانی زندگی سے اس وقت تک پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک کہ یہاں کی زبان سے واقفیت حاصل نہ کی جائے۔ اس لیے ہندوستانی زبان سیکھنے میں وہ ہمہ تن مصروف ہو گئے جس کے لیے انھوں نے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز سے اجازت بھی حاصل کر لی تھی۔ دس پندرہ برس کی عرق ریزی و جفاکشی کے بعد انھوں نے ہندوستانی زبان پر کامل عبور حاصل کر لیا تھا۔ اس درمیان میں انھوں نے ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت اور اس کا ضمیمہ اور "مشرقی زبان داں" مرتب کر لیا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے گل کرسٹ کو صرف ہندوستان ہی میں شہرت نہیں ملی بلکہ سات سمندر پار انگلینڈ تک ان کا نام مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ہندوستانی زبان میں مزید شہرت اور اس کی خدمت کے لئے ذرائع تلاش کرنے لگے۔ اس زمانے میں سول ملازمین کو فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی جسے ہندوستانی منشی انجام دیتے تھے۔ لیکن نہ تو وہ منشی انگریزی زبان سے واقف ہوتے اور نہ تو انگریز سول ملازم دیسی زبانوں سے جس کی وجہ سے اس تعلیم میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی تھیں اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا۔ اس لیے گل کرسٹ نے گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ان سول ملازمین کو پہلے دیسی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ منشیوں سے ان کی زبان میں بات کر سکیں تو وہ آسانی سے اور کم وقت میں فارسی سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ دیسی زبان کی مجوزہ تعلیم کے لیے وہ خود سول ملازمین کو روزانہ درس دیا کریں گے اور

ساتھ ساتھ فارسی بھی بڑھایا کریں گے۔ لہٰذا ولزلی نے گل کرسٹ کی اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے اپنی کونسل کے سامنے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی۔

”مسٹر گل کرسٹ کی پیشکش کو قبول لینا ہی مناسب ہوگا۔ کیوں کہ ویسی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے میں یہ تجویز عمدہ ثابت ہوگی۔ میری رائے ہے کہ اس کو منظور کر لیا جائے۔ اور آئندہ جنوری سے اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے۔ کلکتے میں جو نووارد اسٹریٹس وقت موجود ہیں ان کو ایک سال تک گل کرسٹ سے درس لینے کی ہدایت کی جائے۔ اس معینہ مدت کے بعد ان کا امتحان لیا جائے گا۔ جن کے اصول بعد میں متعین کیے جائیں گے، تاکہ مجوزہ طریق تعلیم کی موزونیت کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔“

مندرجہ بالا یادداشت کی روشنی میں ۲۱ دسمبر ۱۸۹۸ء کو گورنر جنرل کی کونسل نے یہ تجویز منظور کی کہ بنگال میں کمپنی کی حکومت کو کامیاب بنانے کے پیش نظر یکم جنوری ۱۸۰۱ء کے بعد اہم عہدوں پر وہی لوگ مقرر کیے جائیں گے جو لوگ گورنر جنرل کی کونسل کے پاس کیے گئے قانون کے مطابق ملک کی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۸۹۹ء کو اس منصوبہ کو عملی شکل دی گئی۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۹۸ء کو سرکاری سکریٹری جی۔ ایل۔ بارلونے گل کرسٹ کے پاس تقرری کا خط بھیجا۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو انھوں نے

Origin of Modern Hindustan Literature p. 70

۱۔ پہلے سول ملازم کوراسٹر (writer) کہا جاتا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں جب ملازمتوں کے عہدوں کی از سر نو تنظیم ہوئی تو یہ اصطلاح ترک کر کے انھیں سول سرونٹ کہا جانے لگا۔

۲۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۱

۳۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۱

۴۔ دارشنی، فورٹ ولیم کالج ص ۶۰

نے تدریس کی ذمہ داری باقاعدہ طور پر قبول کر لی۔ جس کے لیے رائیٹرس بلڈنگ میں ان کو ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اس طرح اس مکتب یا ادارے کی بنیاد پڑی جو اورینٹل سمٹری اور گل کرسٹ کا مدرسہ یا مدرسہ ہندی کے ناموں سے مشہور ہوا۔ کمپنی کے ملازمین کے لیے ہندوستانی زبان کی تعلیم کی یہ پہلی باقاعدہ منظم کوشش تھی۔ اس خدمت کے لیے گل کرسٹ کو الگ سے تنخواہ مقررہ نہ تھی بلکہ فارسی زبان کی تعلیم کے لیے سول ملازمین کو جو تیس روپے ماہانہ بھتے دیے جاتے تھے اورینٹل سمٹری میں تعلیم حاصل کرنے والے ملازمین کے وہ بھتے گل کرسٹ کو دیے جانے لگے۔ ۲۹ جنوری ۱۷۹۹ء کے خط کے ساتھ ۳۱ طلبہ کی فہرست گل کرسٹ کو موصول ہوئی اور فروری کے اوائل سے باقاعدہ تعلیم و تعلم کا کام شروع ہوا۔

۹ جنوری ۱۸۰۰ء کو گورنر جنرل نے طلبہ کا امتحان لینے کے لیے ایک حکم جاری کیا اور اس غرض سے ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی جس کے سکریٹری گل کرسٹ ہی مقرر ہوئے۔ امتحان کے بعد کمیٹی نے طلبہ کی زبان سے متعلق ترقی کی بڑی تعریف کی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ۲۹ جولائی ۱۸۰۰ء کو کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کر کے گورنر جنرل کے پاس بھیج دی۔ جب وہ رپورٹ گورنر جنرل کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے گل کرسٹ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اسے خیالات کا اظہار کیا۔

”ہندوستانی کی اہم قواعد اور لغت کی تصنیف سے ہندوستان کی عام

مروجہ زبان کی تعلیم حاصل کرنے میں طلبہ کو آج جو آسانی بہم پہنچی ہے اس کے

گل کرسٹ اور اس کا عہد

۱۷۹۵ء میں کلکتہ میں میٹیا برج کے علاقے

سے متصل ایک قلعہ (فورٹ ولیم) کی بنیاد ڈالی۔ یہ ۱۷۹۳ء میں تیار ہوا اس کے بعد ایک شاندار تین منزلہ

عمارت رائیٹرس بلڈنگ کے نام سے ۱۷۸۰ء میں بنائی گئی۔ فورٹ ولیم کالج بھی اسی رائیٹرس بلڈنگ میں جاری تھا۔ یہ عمارت آج بھی موجود ہے۔

۱۷۹۵ء میں رائیٹرس بلڈنگ کی تعمیر مکمل ہوئی اور اس کا عہد

لیکن جاوید نبال نے ان کے پاس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گل کرسٹ کا یہ مدرسہ بھی تھا۔ لیکن اس کے متصل بدیع اعجاز بھی کہا ہے کہ بلاشبہ حکومت کی سرپرستی اس مدرسہ بنی کو حاصل تھی (انیسویں صدی میں کالج اور ادارے)

لیے ہم گل کرسٹ صاحب کی قابلیت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے جس حوصلے، قابلیت اور محنت سے کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دینے میں اپنی فرض سے شناسی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے وہ صد شکر بے کے مستحق ہیں۔^۱

یہ بھی مختصر روداد اور نیٹیل سمز کی جو ہندوستانی زبان کی تعلیم کے لیے تجربے کے طور پر قائم کی گئی تھی اور جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی سامنے آیا یہی وہ ادارہ تھا جس کے اچھے نتائج اور تحریک نے فورٹ ولیم کالج کو جنم دیا، بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اور نیٹیل سمز فورٹ ولیم کالج کا پیش خیمہ تھا۔

اور نیٹیل سمز جیسے معمولی ادارے کے قیام سے لارڈ ولزلی کو اطمینان نہ ہوا بلکہ جس عظیم ادارے کے قیام کا خیال اس کے دماغ میں تھا اسے علمی جامہ پہنانے کے لیے وہ ہمہ وقت بے چین رہنے لگا تھا۔ اسی اثنا میں اسے ٹیپو سلطان سے معرکہ آرائی میں حصہ لینے کے لیے مدارس جانا پڑا۔ لیکن جنگی مصروفیات میں بھی اس نے کمپنی کے ملازمین کی تعلیمی ضروریات کو فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ مدارس سے واپسی کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو اس نے رائٹ آنریبل ہنری ڈنڈال کے نام ایک خط لکھا اور اپنے اس خیال کی وضاحت کی، جس میں کالج کا شاید پہلا بین اشارہ بھی تھا۔ بارلو کیٹی برائے امتحان کی رپورٹ موصول ہونے پر وہ جلد سے جلد اپنے منصوبے کو رو بہ عمل لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ ۹ جولائی ۱۸۰۰ء کو اس نے کالج کے قیام کی تجویز کونسل کے سامنے پیش کر دی۔ اور منطقی استدلال سے کونسل کے ارکان کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنا کر اس منصوبے کو ڈائریکٹروں کی منظوری کے لیے بھیجنے پر آمادہ کر لیا۔^۲

۱۔ J. Roebuck, Annals of fort william College ۱۷۱۵

۲۔ یعنی اور نیٹیل سمز کے طلبہ کے امتحان کے لیے جو کیٹی مقرر کی گئی تھی مسٹر بارلو اس کے ہیڈ تھے

اس لیے یہ کیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔

۳۔ لکشمی شاگر وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۱

زمانہ قیام کی تاریخ

کالج کا قیام :-

ولزی نے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد کالج کے قیام سے متعلق جو فیصلہ کیا تھا، اسے روبہ عمل لانے کے لیے وہ اس قدر بے تاب تھا کہ اس نے ڈائریکٹروں کی منظوری کا انتظار کیے بغیر کونسل میں اس تجویز کی منظوری کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ، ۴ ساون، ۱۸۵ سمیت، ۴ رسا دن ۱۲۰۷ فصلی سمیت، ۲۸ سارٹھ ۱۲۰۷ بنگالی سمیت کالج کی باقاعدہ داغ بیل ڈال دی۔ کالج کا دستور بھی اسی روز مرتب کیا گیا۔ لیکن گورنر جنرل کے حکم خاص سے قانونی دستاویز پر قیام کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۰ء ڈالی گئی، جو میسور کی راج دھانی سرنگا پٹم پر برطانوی افواج کی فتح کی پہلی سال گرہ کی تاریخ ہے۔ طلبہ کو بطور انعام دینے کی غرض سے جو تمغے تیار کرائے گئے تھے ان پر اس یادگار کو دوام بخشنے کے لیے ایک طرف دارالخلافہ سرنگا پٹم کی خوب صورت تصویر اور دوسری طرف فتح کی تاریخ کندہ تھی۔

کالج کا دستور :-

کالج کے آئین و دستور کے تمہیدی حصے پھلے اوراق میں دیے جا چکے ہیں۔ یہاں اس کے

دفعات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۰ دانش، فورٹ ولیم کالج مر۱۲

۱۱ ایضاً۔ ڈاکٹر نجم الاسلام، نقوش دسمبر ۸۶ ص ۶۱۹۔ اور

۱۲ A. S. Dalrymple, Origin of Modern Hindustani Literature P. 102

۱۳ A. S. Dalrymple, The Language of Hindustani - p. 14

۱۔ بذریعہ ہذا، فورٹ ولیم کالج میں ایک کالج قائم کیا جاتا ہے تاکہ کمپنی کے جو نیرس بول ملازمین کو ادبیات، سائنس اور مہ لومات (ناٹج) ایسے شعبوں میں بہتر طور پر تعلیم دی جائے جو ایسٹ انڈیز میں برطانوی مقبوضات کے انتظام حکومت سے متعلق، مختلف عہدوں کے فرائض کی انجام دہی کے لیے درکار یا قوتوں کی تحصیل میں ضروری باور کیے جائیں۔

۲۔ ایک موزوں و مناسب عمارت کالج کے لیے تعمیر کی جائے جو حکام بالا کے لیے طلبہ کے لیے ایک کتاب خانے کے لیے اور ایسے دوسرے مقاصد کے لیے جو ضروری سمجھے جائیں، کمروں پر مشتمل ہوگی۔

۳۔ گورنر جنرل کالج کے سرپرست (Patron) اور وزیٹر (Visitor) ہوں گے۔
۴۔ سپریم کونسل کے اراکین اور صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت کے جج صاحبان کالج کے گورنر ہوں گے۔

۵۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کالج کے مالی ذرائع کے بندوبست کے متولی (ٹرسٹی) ہوں گے اور اس حیثیت میں باقاعدگی سے اپنی کاروائیوں کی روداد آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کو پیش کریں گے۔

۶۔ سرکاری خزانے کی کامپروٹنگ کمیٹی (Comptrolling Committee) کالج کے خزانچیوں کا کام کرے گی۔

۷۔ اکاؤنٹنٹ جنرل اور سول آڈیٹر بالترتیب کالج کے اکاؤنٹنٹ اور آڈیٹر ہوں گے۔
۸۔ ایڈووکیٹ جنرل اور آنریبل کمپنی کے معینہ مشیر قانونی کالج کے لاء افسران ہوں گے۔
۹۔ کالج کی بلاواسطہ سربراہی مستظلاً ایک پروفیسر اور ایک وائس پروفیسر کے ذمے ہوگی۔ اور اسی نوعیت کے ان دوسرے افسروں کے ذمے جن کے تقرر کو سرپرست اور وزیٹر مناسب خیال کرے گا۔ ان تنخواہوں کے ساتھ جن کو وہ مناسب حال خیال کرے۔ پروفیسر اور وائس پروفیسر اور کالج کے جملہ دیگر حکام، سرپرست اور وزیٹر کی مرضی کے مطابق قابل برطرفی ہوں گے۔

۱۰۔ پروفیسر و وائس پروفیسر ہیشہ کلیسا کے انگلستان کا پادری (Clergy man) ہوگا۔ جیسا

کہ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۱۔ سرپرست اور وزیٹر کا ہر اجرائے کار اور ایکٹ آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور ان کی مرضی و منشاء کے تابع ہوگا۔

۱۲۔ پرو۔ ووسٹ کے ادین فرائض یہ ہوں گے کہ فورٹ ولیم پہلی مرتبہ پہنچنے پر جو نمبر ہوں ملازمین کا استقبال کرے، ان کے عمومی چال چلن اور طرز عمل کی نگرانی کرے اور ان میں باقاعدگی لائے، اپنی نصیحت و ملامت اور تنبیہ و ہدایت سے ان کی مدد کرے اور کلیسائے انگلستان کے عقیدے، ڈسپلن اور مذہبی رسوم کے مطابق، جیسا کہ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کے اصولوں کی تعلیم دے انھیں پکا پیر و کار (کنفرم) بنا دے۔

۱۳۔ سرپرست اور وزیٹر پر دفتری کی ایسی اسامیاں، ایسے حقوق و مراعات کے ساتھ قائم کرے گا جنہیں مناسب خیال کیا جائے۔

۱۴۔ جوں ہی قابل عمل ہو، پروڈیوسری کی اسامیاں قائم کر دی جائیں اور باقاعدہ لیکچروں کے کورس، ادبیات، سائنس اور معلومات (نابالغ) کی حسب ذیل برانچوں میں شروع کر دیے جائیں گے۔
زبانیں: عربی، فارسی، سنسکرت (کذا)، ہندوستانی، بنگالی، (بنگالی)، تیلنگا (تلنگی)، مرہٹہ (مرہٹی)، تامل اور کنارا (کنڑ)

قوانین:۔ محمد لا، ہندولا، اخلاقیات، سول فلسفہ، قانون (جیورس پروڈنس) اور قانون اقوام، انگلش لا، ہندوستان کی برطانوی عملداریوں میں سول حکومت کی غرض سے گورنر جنرل باجلاس کونسل یا بالترتیب فورٹ سنیت جارج اور بمبئی کے گورنر صاحبان باجلاس کونسل کے جاری کردہ ضوابط و قوانین۔

دیگر:۔ اقتصادیات (پولی ٹیکل اکانومی)، اور بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی ادارت و مفادات، جغرافیہ اور ریاضیات۔

یورپ کی جدید زبانیں، یونانی، لاطینی اور انگریزی ادب (قدما کلاسکس) تاریخ عمومی،

قدیم و جدید۔ ہندوستان اور دکن کی تاریخ اور باقیات سلف (انٹی کوٹیز)

سائنس:۔ تاریخ طبعی (نیچرل ہسٹری) نباتات، کیمیا اور علم ہیئت۔

۱۵۔ سرپرست اور وزیٹر، ایک ہی پرفیسر کو مطالعے کی شمار کردہ بالا برانچوں میں سے ایک سے زیادہ پیکچروں کے پڑھنے دینے (To read lectures in) کا مجاز و ممتاز بنا سکتا ہے اور کسی بھی وقت، یکجا یا جدا جدا، مذکورہ پروفیسروں میں سے کسی کو بھی مجاز و ممتاز بنا سکتا ہے یا ان برانچوں میں جن میں ضروری معلوم ہو پروفیسر کی مزید کامیاں قائم کر سکتا ہے۔

۱۶۔ پرو۔ دوست اور وائس پرو۔ دوست کالج کے نظم و نسق میں رہ کر سات سال مدت پوری کر لینے پر، اور ایک پروفیسر کالج میں پورے سات سال کی مدت تک پیکروں کی خواندگی کر لینے پر، یا اٹھائیس مینٹالوں کی مدت اور سرپرست اور وزیٹر کے اپنے قلم اور اپنی مہر سے بالتزیم اس مدت و وقت کے دوران عمدہ طرز عمل کا صداقت نامہ جاری ہو کر موصول ہونے پر تاحیات سالانہ وظیفہ حسن خدمت (پینشن) کے حقدار ہوں گے، جو یورپ میں یا ہندوستان میں، فریق جہاں کا انتخاب کرے، ادا کی جائے گی۔ وظیفہ حسن خدمت کسی حالت میں بھی اس سالانہ تنخواہ کے ایک تہائی سے کم نہیں ہوگا جو یہ پرو۔ دوست یا وائس پرو۔ دوست کالج کا نظم و نسق چلاتے رہنے کے دوران، یا کوئی ایسا پروفیسر اپنے باقاعدہ پیکروں کی مدت کے دوران وصول کرتے رہے ہوں۔ بہر حال، وظیفہ حسن خدمت میں سرپرست اور وزیٹر کے اختیار تمیزی سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۷۔ کمپنی کے وہ تمام سول ملازمین جن کا آئندہ سے بنگال کی پریزیڈنسی کے عملے میں تقرر کیا جائے۔ بنگال میں پہنچنے کے بعد پہلے تین سال کالج سے وابستہ رکھے جائیں گے اور اس مدت و وقت کے دوران کالج کے اندر منظور شدہ نصابیات کا مطالعہ ہی ان کی واحد پبلک ڈیوٹی قرار پائے گی۔

۱۸۔ بنگال کی پریزیڈنسی کے عملے کے وہ سب سول ملازمین جن کی بنگال میں اقامت تین سال کی مدت سے زیادہ نہیں بڑھ گئی ہوگی، اس ضابطے کی تاریخ سے تین سال کی مدت کے لیے فی الفور کالج سے وابستہ کر دیے جائیں گے۔

۱۹۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حکم سے، ایسی شرائط پر اور ایسے ضوابط کے تحت جنہیں قرین مصلحت باور کیا جائے، ہندوستان میں کمپنی کا کوئی بھی جو نیر سول ملازم ادارے سے استفادے

کے لیے داخل ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ اس پریزیڈنسی کے عملے سے تعلق رکھتا ہو یا فورٹ سینٹ جارج یا بمبئی کے عملے سے۔

۲۰۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حکم سے، ایسی شرائط پر اور ایسے صوابط کے تحت جنہیں قرین مصلحت باور کیا جائے، ہندوستان میں کمپنی کے جو نیر فوجی ملازمین میں سے کوئی بھی اس ادارے سے استفادے کے لیے داخل ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ اس پریزیڈنسی کے عملے سے تعلق رکھتا ہو یا فورٹ سینٹ جارج یا بمبئی کے عملے سے۔

۲۱۔ فورٹ ولیم کالج میں ہر سال چار میقاتیں (Terms) ہوں گی، ہر میقات کی مدت دو مہینے ہوگی۔ ہر سال چار بڑی تعطیلات (vacations) دی جائیں گی ہر بڑی تعطیل کی مدت ایک مہینہ ہوگی۔

۲۲۔ سالانہ دو پبلک امتحانات منعقد کئے جائیں گے اور انعامات و اعزازات پرو ووسٹ کے ہاتھوں علی الاعلان سرپرست گورنروں کی موجودگی میں ایسے طلبہ میں تقسیم کئے جائیں گے جو ان کے اہل نظر آئیں گے۔

۲۳۔ ڈگریاں دی جائیں گی اور انھیں بنگال، فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کی سول حکومتوں کے بعض عہدوں کے لیے لازمی یا قوتوں میں شمار کیا جائے گا، اور سول ملازمت میں ترقی کالج میں ڈسپلن اور ادارات کے مطابق علانیہ تسلیم شدہ اہلیت کا لازمی نتیجہ ہوگی۔

۲۴۔ کالج کی داخلی باقاعدگی، ڈسپلن اور نظم و نسق کے متعلق آئین و قوانین (Statutes) کالج کے گورنروں کی نگرانی میں کالج کے پرو۔ ووسٹ کو بنانے ہوں گے لیکن کوئی قانون (Statute) نافذ العمل نہیں ہوگا تا وقتیکہ سرپرست اور وزی ٹرنے اس کی منظوری نہ دی ہو، جن قوانین کی اس طور پر منظوری دی جائے گی انھیں ایک فارم کے مطابق طبع کیا جائے جس کی حتمی تجویز و ہدایت سرپرست اور وزیٹر کی طرف سے ہوگی۔

۲۵۔ سرپرست اور وزی ٹرنے اپنے تنہا اور بلا شرکت غیرے اختیار (اقتدار) کے ہر زمانے میں، کسی بھی موجودہ قانون (کے) رد و بدل کا یا اسے منسوخ کرنے کا یا کالج کی باقاعدگی ڈسپلن اور نظم و نسق کے لیے کسی نئے قانون کے جاری کرنے کا مجاز و مختار ہوگا۔

۲۴ کالج کے حکام کی تمام تنخواہوں، تقریروں یا علاحدگیوں کا ایک باقاعدہ گوشوارہ ہر میقات کے اختتام پر کالج کے سرپرست اور وزی ٹرکی طرف سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے آریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کو پیش کیا جاتا ہے گا، سرپرست اور وزی ٹرکی کے جاری کردہ تمام آئین و قوانین (Statutes) کی مطبوعہ کاپیاں بھی ان ہی عرصہ ہائے وقت کے دوران اور بعینہ اسی طریقے پر، گورنر جنرل باجلاس کونسل اور آریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کو پیش کی جائیں گی۔ فقط۔

داخلی دستور :-

ار طلبہ کے داخلے سے متعلق:

ہر طالب علم کو داخلے سے پہلے مندرجہ ذیل اعلان تحریراً داخل کرنا ہوگا کہ ” میں فلاں نام، ہمیم قلبی اور اخلاص کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں کالج (جس میں اب میں بطور ممبر داخلہ پانے والا ہوں) کے جملہ ضوابط و قوانین کا پابند رہوں گا، یہ کہ میں ہمیشہ اس کے وقار اور مفادات و مراعات کا لحاظ رکھوں گا، اور یہ کہ میں ان جملہ احکامات کے باب میں جو ضابطے کے مطابق جاری ہوں گے پرو۔ ووسٹ کا وائس پرو۔ ووسٹ کا اور کالج کے جملہ حکام بالا کا تابع دار رہوں گا۔ دستخط:“

یہ قرار نامہ پیش کرنے کے بعد طالب علم کا نام کالج کے رجسٹر میں درج کر لیا جاتا تھا۔ اس میں اس کی عمر، ملازمت کی نوعیت، تفریح کی تاریخ، ہندوستان آمد کی تاریخ بھی درج کی جاتی۔ نیز اس کا اندراج بھی ہوتا کہ اس کا اصل وطن مع ضلع کے کیا ہے اور اس کی تقرری بنگال، فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی میں کس پریزیڈنسی میں اور کہاں ہوئی ہے۔ اور اگر وہ کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ ہوتا تو رجسٹر میں اس کی نشاندہی بھی کی جاتی تھی۔

۱۲ اعلیٰ حکام اور پروفیسروں کے تقرر کے متعلق؛

”چونکہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد عیسائی مذہب کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اور اس ارادے سے قائم کیا گیا ہے کہ نہ صرف مشرقی ادبیات سے آگہی کو بڑھائے اور طلبہ کو ان مختلف مناصب کے فرائض کی تعلیم و ہدایت دے جن پر آگے چل کر انھیں ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کی حکومت میں مقرر کیا جانا ہے، اور ان مقبوضات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمین کے اندر برطانیہ عظمیٰ کے عاقلانہ قوانین اور پرمسرت آئین سے ان کے تعلق کو مضبوطی کے مضبوط تر بنائے، بلکہ کرہ ارض کے اس حصے میں عیسائی مذہب کو بلند و برقرار رکھے، تو یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس ادارے میں اس وقت تک کسی اعلیٰ منصب کا حامل نہیں ہوگا یا اس میں بہ حیثیت پروفیسر یا لکچر تقرر نہیں پائے گا جب تک کہ بادشاہ معظم سے وفاداری کا حلف نہ اٹھائے اور مندرجہ ذیل اعلان تحریری طور پر داخل نہ کر دے۔“

”میں فلاں (نام)، صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں نہ تو ایسے اصولوں یا رايوں کی تعلیم دوں گا نہ پبلک یا پرائیویٹ طور پر ایسے اصول یا ایسی رائیں رکھوں گا جو عیسائی مذہب کے خلاف ہوں یا جیسا قانوناً مسلم ہے، کلیسائے انگلستان کے اصول اور ضابطے کے خلاف ہوں۔“

”میں فلاں (نام)، صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ کلیسا یا مملکت کے باب میں ایسے اصولوں یا رايوں کی نہ تو تعلیم دوں گا اور نہ پبلک یا پرائیویٹ طور پر ایسے اصول یا ایسی رائیں رکھوں گا جو برطانیہ عظمیٰ کے قانوناً جائز آئین کے خلاف ہوں، یا اس فریضے کے منافی ہوں جو ہنر محض کی ذاتِ شہانہ، شاہی خاندان اور حکومت کے لیے ایک نخمس اور وفادار رعایا کی حیثیت سے مجھ پر عاید ہوتا ہے۔“

”میں فلاں (نام)، صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ کالج (جس میں اب میں بطور ممبر داخلہ پانے والا ہوں) کے آئین و قوانین اور داخلی ضابطوں کا پابند ہوں گا اور یہ کہ میں قول و عمل سے اس ادارے میں نظم، ضبط اور اچھے اخلاق کو بحال و برقرار رکھوں گا۔“

دیکھنے اور ترقی دینے میں کوشاں رہوگا۔ دستخط۔“

۳. میقاتوں کے متعلق؛ ہر سال کے اندر چار میقاتیں ہوں گی۔

پہلی میقات ۴ فروری کو شروع ہوگی اور مارچ کے آخری دن ختم ہوگی۔

دوسری میقات ۴ مئی کو شروع ہوگی اور جون کے آخری دن ختم ہوگی۔

تیسری میقات یکم اگست کو شروع ہوگی اور ستمبر کے آخری دن ختم ہوگی

چوتھی میقات یکم نومبر کو شروع ہوگی اور دسمبر کے آخری دن ختم ہوگی۔

۴. لیکچروں اور مشفقوں کے متعلق:

ہر میقات کے دوران پروفیسر صاحبان، لیکچرر صاحبان اور معلمین طلبہ کو اس طور پر تعلیم دیں گے جس کی منظوری کالج کونسل نے دی ہوگی۔

ہر طالب علم کو ہر میقات کے دوران مشرقی زبانوں کے مطالعے کی کم سے کم ایک جماعت میں ضروری حاضری دینی ہوگی۔ طالب علم جس جماعت یا جماعتوں میں بھی داخلہ لے، یہ ضروری ہوگا کہ میقات کے اختتام تک وہیں حاضری دے کر منظور شدہ نصاب کا مطالعہ جاری رکھے۔

مختلف لیکچروں کو جا کر سننے کی اجازت پر دو۔ دو سٹوڈنٹس دے گا۔

کالج کونسل طے کرے گی کہ طلبہ کو ہر میقات کے دوران کیا پبلک مشقیں کرنی ہیں

۵. امتحانات کے متعلق؛ ہر سال دو پبلک امتحانات منعقد کیے جائیں گے

پہلا امتحان دوسری میقات کے اختتام پر ہوگا۔

دوسرا امتحان چوتھی میقات کے اختتام پر ہوگا۔

ان میں سے ہر امتحان میں مشرقی زبانوں میں ہر طالب علم کی استعداد برسر عام جانچا جائے

۱۔ اس طرح وقفے علی الترتیب اپریل، جولائی، اکتوبر اور جنوری متعین تھے۔

134705

گا اور اس کی استعداد کے مطابق درجہ دیا جائے گا۔

طلبہ کی تقابلی استعداد کا اندازہ ہر ممکن صورت سے لگایا جائے گا تحریری مشقوں سے بھی اور ممتحنوں کے تحریری طور پر تجویز کردہ سوالوں کے تحریری جوابات سے بھی۔ جس زبان یا سائنس میں طالب علم کا امتحان ہوا ہے اس زبان یا سائنس کا پروفیسر امتحان میں موجود ضرور رہے گا اور اس کے انقادیں ممکنہ معاونت بھی کرے گا جس کی ممتحن حضرات کو ضرورت ہو۔ لیکن طلبہ کی فرداً فرداً استعداد کا تعین کرنے میں یا انعامات و اعزازات کا فیصلہ کرنے میں اس کی رائے کو دخل نہ ہوگا۔ اس خیال سے طلبہ کو عمومی تعلیم کے باب میں اور ان زبانوں کے سلسلہ میں بھی جو اس ادارے کا قوری مقصد نہیں، استعداد کی حوصلہ افزائی ہو اور یقین کیا جاسکے۔ (یہ اجازت دی جاتی ہے کہ کوئی بھی طالب علم ان منظور شدہ امتحانات کے موقع پر علوم مفیدہ، سائنس یا ادبیات کی کسی بھی شاخ میں امتحان دے سکتا ہے۔

ہر سال کے انعامات و اعزازات کا اعلان سہ ماہی کو کیا جائے گا اور ان کا فیصلہ ممتحن حضرات ہر سال دوسرے امتحان میں کریں گے اور ان کی تقسیم ہر عام آئندہ ۶ ذوری کو ایسے طلبہ کے حق میں عمل میں آئے گی جو ممتحنوں سے خصوصی بہارت کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

علوم کے مختلف شعبہ جات میں امتحانات کمیٹی کا تقریر کا بہت کونسل کرے گی۔ ممتحن حضرات کو مندرجہ ذیل اعلان نامہ تحریراً داخل کرنا ہوگا۔
میں فلاں نام) صحیح قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ اب جن طلبہ کا امتحان لیا جانا ہے میں ان کی تقابلی یا قوتوں کے بارے میں سے غیر جانبدارانہ فیصلہ دوں گا۔ دستخط۔

۴۔ مشرقی زبانوں کے مباحثوں اور تقریر کی مقابلوں سے متعلق :-

چونکہ یہ ضروری ہے کہ طلبہ جن کو آگے چل کر ہندوستان میں اہم اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنا ہے مشرقی زبانیں روانی اور محنت و درستی کے ساتھ بولنے کے قابل ہوں۔ اس لیے یہ

اعلان کیا جاتا ہے کہ مقررہ وقتوں میں (جن کا تعین کابح کونسل کرے گی) مشرقی زبانوں میں پبلک
مباحثے اور تیار شدہ تقریروں کے جلسے منعقد کئے جائیں گے۔

۷۔ انگریزی مضمون نویسی کی مشقوں سے متعلق:

ہر طالب علم بریقات کے دوران ایک مضمون یا تیار شدہ لکھی ہوئی تقریر انگریزی
زبان میں کرے گا۔

ان مضامین یا تیار شدہ تقریروں کا عنوان کابح کونسل تجویز کرے گی اور ایسے مضامین
جو امتیازی یا اقت کے حامل متصور ہوں گے، برسر عام پڑھے جائیں گے۔

۸۔ سرٹیفکیٹ اور ڈگریوں سے متعلق:

کسی طالب علم کے بارے میں اس وقت تک یہ تصور نہیں کیا جائے گا کہ اس نے
فورٹ ولیم کالج میں اپنا نصاب تعلیم مکمل کر لیا ہے جب تک کہ اس نے بارہ میقاتوں یا تین
سال اس طور پر پورے نہ کر لیے ہوں جیسا کہ داخلی قوانین کا تقاضا ہے۔ اس مدت وقت
کے اختتام پر طالب علم کو کابح کونسل کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ ملے گا، جس میں اس
استعداد و مہارت کی صراحت ہوگی جسے کابح میں اپنی نصابی تعلیم کے دوران اس نے
حاصل کیا ہوگا اور کالج میں قیام کے عرصے کے دوران اس کے عمومی چال چلن کے رنگ و
روش کی بھی۔

ایسے تمام سرٹیفکیٹوں کی تصدیقیں وزیر (گورنر جنرل) کی خدمت میں پیش کی جائیں گی
جو انھیں حکومت کے پبلک رکارڈس میں داخل فرمائیں گے۔

ایک اعزازی ڈگری وزیٹر کی طرف سے ایسے اشخاص کو عطا کی جائے گی جو مشرقی
زبانوں میں سے کسی میں یا قانون محمدی میں یا ہندوؤں کے قانون میں یا مشرقی ادبیات کے علم
میں خصوصی مہارت کا اعزاز حاصل کریں گے۔

یہ ڈگری ایسے طالب علم کو نہیں دی جائے گی جس نے کابح کونسل سے داخلی قوانین

کے تحت منظور شدہ سرٹیفکیٹ حاصل نہ کر لیا ہو۔

۹۔ پرو۔ ووسٹ کا دائرہ اختیار:

پروفیسر صاحبان، حکام، طلبہ، معلمین اور کالج کے ملازمین پرو۔ ووسٹ کے فوری دائرہ اختیار کے تحت ہوں گے۔

مقدس سروس (عبادت) کالج کے گرجا میں ان اوقات میں ہوگی جن کا تعین پرو۔ ووسٹ کرے گا اور اس میں تمام طلبہ کو شریک ہونا پڑے گا۔

یہ فورٹ ولیم کالج کے نظم و نسق کے سربراہ پرو۔ ووسٹ کا مخصوص دائرہ کار اور مقدس فرض ہوگا کہ ادارے کے اخلاقی، مذہبی مفادات اور مزاج و منہاج (کیریکلر) کی نگرانی کرے اور مستعدی کے ساتھ اس کے جملہ اراکین کے طرز عمل اور اصولوں کی نگہداشت کرے۔ اس معترف ذمے داری کو بطور خاص اس طرح انجام دے گا کہ کالج کے ایسے پروفیسروں اور افسروں کو تنبیہ و ہدایت کرے گا جو اپنی ڈیوٹی سے غفلت برتیں گے یا طلبہ کے لیے ایسی موزوں مثال بننے میں ناکام رہیں گے جن کا وہ پیروی کر سکیں اور اگر اس کی تنبیہ و ہدایت غیر موثر ثابت ہوگی تو اس معاملے کی صورت حال سے وزیٹر کو مطلع کرے گا۔

جو طلبہ غیر شائستہ طرز عمل کے مرتکب ہوں گے یا جو کالج کے اصولوں کو یا آئین و قوانین کو نظر انداز کریں گے یا دانستہ عدول حکمی کریں گے، ان کو پرو۔ ووسٹ کی طرف سے نجی طور پر یا کالج کی کونسل کی طرف سے معاملے کی نوعیت اور صورت حال کے لحاظ سے تنبیہ کی جائے گی۔ جب خلاف ورزی کا ارتکاب ایسا سنگین ہو کہ اس قسم کی کارروائی ضروری ہو جائے تو کالج کے آئین و قوانین یا اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے یا نظم و ضبط، اخلاقیات یا انداز کے اصولوں کو پامال کرنے والے طالب علم کا نام کالج کی طرف سے وزیٹر کے علم و اطلاع میں لایا جائے گا۔

کالج کی کونسل سے متعلق کالج کی کونسل پانچ اراکین پر مشتمل ہوگی، جن میں سے

پرو۔ ووسٹ اور وائس پرو۔ ووسٹ فی الوقت دو ہوں گے۔ باقی تین اراکین وزی ٹرکی طرف سے مقرر کیے جائیں گے۔ کوئی بھی چار یا تین اراکین مل کر کونسل (کے کورم) کی تشکیل کریں گے، بہ شرطیکہ پرو۔ ووسٹ یا وائس پرو۔ ووسٹ موجود ہو۔

کابج کے نظم و نسق کے لیے کابج کی کونسل کسی نئے قانون (Statute) کے اجراء یا کسی موجودہ قانون میں رد و بدل یا اس کی منسوخی کی تجویز وزی ٹر کو پیش کرنے کی مجاز ہوگی۔

کابج کی کونسل کابج کے داخلی نظم و نسق اور ڈسپلن کے لیے قواعد اور نجی مذاہلے جاری کرنے کی مجاز ہوگی۔ ایسے تمام قواعد و قوائد وقتاً معاً معائنہ کے لئے وزی ٹر کو پیش کیے جاتے ہیں گے اور تنہا اس کے اختیار (اٹھارٹی) سے قابل منسوخی ہوں گے۔

کابج کی کونسل عمومی حالت کی تحقیق و تفتیش کیا کرے گی جس میں تمام ادائیگیاں اور چارجز، پروفیسروں، لیکچروں، منشیوں، مولویوں اور پنڈتوں کے عملے شامل ہیں یا اسی میں وزی ٹر کو ایسی تبدیلیوں کی تجویز بھی پیش کرے گی جو مقضائے حالات کے موافق معلوم ہوں کابج کی کونسل میں تمام مسائل و Questions (کثرت آراء) Majority of Voices سے طے کئے جائیں گے۔ کسی ایسی صورت میں کہ آراء مساوی طور پر منقسم ہوں، پرو۔ ووسٹ یا اس کی غیر موجودگی میں وائس پرو۔ ووسٹ کابج کی کونسل کی جملہ کارروائی باقاعدگی سے وزی ٹر کو پیش کی جایا کرے گی۔

۲۔ پبلک میز اور کمروں سے متعلق فورٹ ولیم کابج کے طلبہ کو کابج کے خرچ پر کمرے لے کر ایک پبلک میز بھی رکھی جائے گی۔

دوران میقات کوئی طالب علم ہفتے میں دو بار سے زیادہ خود کو پبلک میز سے غیر حاضر نہیں رکھے گا۔

۳۔ قرضوں سے متعلق ہر گاہ کہ فورٹ ولیم کابج سے وابستہ ہر طالب علم تین سو سیکڑ روپے (تین سو روپے سیکڑ رائج الوقت) کا ماہانہ الاؤنس پائے گا۔ اور

کالج کے خرچ پر مشترک میز اور کمرے بھی فراہم کیے جائیں گے۔ (دریں صورت) یہ اعلانات کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم کالج میں اپنے قیام کے دوران (جسے داخلے کے وقت سے آخری امتحان تک شمار کیا جائے گا)، قرضہ اپنے سر لے گا تو وہ کالج کی کونسل کی طرف قانونی طور پر باہر میں تجویز کردہ سرٹیفکیٹ وصول نہیں کر سکے گا، ناآں کہ وہ کالج کی کونسل کو اس قرضے کی رقم کے بارے میں ایک اطمینان بخش بیان حل کر دے، جس بیان کو سرٹیفکیٹ مذکورہ کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔

ویزی

سرپرست اور ویزی ٹر کے حکم سے
ڈیوڈ براؤن

کالج کمیٹی کالج کے دستور کے مطابق کالج کے انتظامی اور تعلیمی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کے اعلان میں مندرجہ ذیل ارکان کے نام شائع ہوئے تھے۔

۱۔ پرووسٹ پادری روزنڈ ڈیوڈ براؤن

۲۔ وائس پرووسٹ پادری روزنڈ کلورڈیس بکن

۳۔ رکن جارتا بے روبارلو

۴۔ " این۔ بی۔ ایڈمونسٹن

۵۔ " لفٹنٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک

کالج کا نصاب: فورٹ ولیم کالج دراصل گل کرسٹ کی فکر رسا کی پیداوار تھا۔ اس کی مشرقی

ادب السنہ سے دل چسپی اور تشویق و ترغیب ہی نے لارڈ ولزلی کے

ذہن کو ایک مشرقی کالج کے قیام کی جانب مبذول کیا تھا۔ لیکن ولزلی نے کالج کا جو شاندار

وسیع وسیع وسیع ہیولا تیار کیا وہ حقیقتاً ایک یونیورسٹی کے تصور سے مطابقت رکھتا تھا اس نے وہ

ملکی زبانوں کی تعلیم کے انتظام پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ یورپی ادب السنہ اور جدید علوم و

لہ نقوش لاہور دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۶ تا ۵۱

۲۔ یہ فورٹ ولیم کالج کافرٹ چلپن ۱۱، غلا پوری، اور کلکتہ ہائل سوسائٹی کا بانی تھا۔ اس کی رسائی کو آف ڈاکٹر نے
مبغز تک جس تھی۔

فنون کے ساتھ ساتھ قانون و علم تمدن کے مضامین بھی شامل نصاب کیے تھے۔ درسیات کے اس وسعت اور تنوع کا اندازہ مضامین کی مندرجہ ذیل فہرست سے کیا جاسکتا ہے۔

الف۔ مشرقی زبانیں۔ عربی، فارسی، ہندوستانی، سنسکرت، بنگلہ، تلگو، مرہٹی، تامل اور کنڑ۔

ب۔ یورپی زبانیں۔ یونانی، لاطینی اور انگریزی

اسلامی فقہ، ہندو دھرم شاستر، علم اخلاق، علم قانون، قوانین اقوام، قانون ۲ قوانین انگلستان، گورنر جنرل کی کونسل، قلعہ سینٹ جارج اور بمبئی پریسیڈنس کی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین۔

۳۔ تجارتی و کاروباری مضامین

معاشیات، تجارتی اداروں خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کی تعلیم، جغرافیہ اور علم حساب۔

۴۔ تاریخ

قدیم و جدید تاریخ (عالم) ہندوستان اور دکن کی قدیم و جدید تاریخ

۵۔ سائنس:۔ علم نباتات، علم کیمیا (Chemistry)، علم نجوم اور تاریخ طبعی (نیچرل ہسٹری) کان لچ میں پروفیسروں کا تقرر:

۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کے ایک سرکاری اعلان میں حسب ذیل پروفیسروں کا تقرر عمل میں

آیا۔

۱۔ جان بلی (John Baillie) شعبہ عربی زبان و اسلامی فقہ

۲۔ ولیم کرک پیٹرک W. Kirkpatrick

۳۔ فرانسس گلیڈون France Gladwin شعبہ فارسی زبان و ادب

۴۔ ایڈمونسٹن N.B. Edmonstone

۵۔ گل کرسٹ Gilchrist شعبہ ہندوستانی

۶۔ جارج ہلے روبرو G.H. Barlow شعبہ قانون

۴۔ رپورٹنگ کے لئے Rev. Buchanan شعبہ یونانی، لاطینی اور انگریزی

معلمین کا تقرر:

ڈیم کیری	Mr. W. Carey	بنگالی اور سنسکرت، زبانوں میں
جیمس ڈنوڈی ایل ایل ڈی	Mr. J. Dinwiddie LL.D.	ریاضیات میں
ڈیو پلے سی	Mr. Du Plessy	جدید زبانوں میں
لٹمن ڈن	Mr. Lumsden	فارسی میں مددگار معلم
روٹھ مین	Mr. Rothman	کالج کونسل کے سکریٹری
ہارنگٹن	Mr. Harnygan	قانون میں

اس کے بعد ۶ جنوری ۱۸۰۱ء کو ایڈورڈ اسکاٹ وارنگ کا تقرر بحیثیت مددگار معلم شعبہ

ہندوستانی میں عمل میں آیا۔

مشییوں کا تقرر:

کالج کے دستور کی رو سے پروفیسروں اور معلمین (ٹیچروں) کے عہدے صرف یورپی
عالموں کے لیے مخصوص تھے۔ پروفیسروں سے عہدہ سنبھالنے وقت عیسائیت کی تبلیغ و حفاظت
کا حلف لیا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کے لیے صرف ہیڈ ماسٹر، نائب ماسٹر، مترجمین اور سرٹیفکیٹ

لے یہ بھی ایک پادری تھا، جو میرام پور مشنری کا سربراہ تھا۔ اس کا نام اس کے مذہبی
جنبات کے پیش نظر کیا گیا تھا۔

۲۔ نقوش، دسمبر ۱۹۸۶ء ۱۹۸۶-۵۲ اور فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

۳۔ ایشیاٹک اینول رجسٹر، ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء ص ۲۲۲)

بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

منشی کی جگہیں تھیں۔ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کے اجلاس میں کونسل نے عربی، فارسی، ہندوستانی اور بنگلہ شعبوں میں ایک ایک ہیڈ منشی ایک ایک نائب منشی اور طلبہ کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق دیگر منشی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن کل ملا کر پچاس منشیوں سے زیادہ نہیں رکھے جاسکتے تھے۔ اس کے مطابق ۲۴ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کونسل کے اجلاس میں فارسی، عربی، ہندوستانی اور سنسکرت و بنگلہ کے ہیڈ اور سکند منشیوں اور مولویوں کا تقرر عمل میں آیا۔ چونکہ ہمارے مطالعے کا دائرہ ہندوستانی شعبے تک محدود ہے اس لیے صرف اس شعبے کے منشیوں کی فہرست سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-

۱۔ میر بہادر علی حسینی	ہیڈ منشی	ماہانہ تنخواہ ۲۰۰ روپیے
۲۔ تارنی چرن مشر	سکند منشی	" ۱۰۰ " "
۳۔ مرتضیٰ خاں	منشی	" ۲۰ " "
۴۔ غلام اکبر	"	" " " "
۵۔ نصر اللہ	"	" " " "
۶۔ میر امن	"	" " " "
۷۔ غلام اشرف	"	" " " "
۸۔ بلال الدین	"	" " " "
۹۔ محمد صادق	"	" " " "

۱۔ یہ کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے تھے لیکن جب کبھی کالج کو ضرورت پیش آتی انھیں رکھ لیا جاتا تھا۔ وہ جتنے دن کام کرتے تیس روپے ماہانہ کے سب سے انھیں اتنے دن کی تنخواہ دی جاتی تھی۔

۲۔ سرٹیفکیٹ منشی انھیں اس لیے کہا جاتا تھا کہ انھیں باقاعدہ کالج کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، جو لوگ کامیاب ہوتے تھے انھیں سرٹیفکیٹ دیا جاتا تھا۔ انھیں سدی یا سدیافتہ منشی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت منشی اور ماتحت منشی سے کم ہوتی تھی۔ انھیں طلبہ کو اپنے گھر پڑھانے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

۳۔ سید ظہیر الحسن، نوائے ادب اکتوبر ۱۹۴۵ء

۱۰۔ رحمت اللہ خاں	منشی	ماہانہ تنخواہ	۴۰ روپیے
۱۱۔ غلام غوث	"	"	"
۱۲۔ کنڈن لعل	"	"	"
۱۳۔ کاشی راج	"	"	"
۱۴۔ میر حیدر بخش حیدری	"	"	"

اکتوبر ۱۸۰۱ء تک ہندوستانی شعبے کے چار منشیوں محمد صادق، رحمت اللہ خاں، کاشی راج اور غلام غوث نے یا تو استفادے دیا یا انھیں برطرف کر دیا گیا تھا۔ ان کی جگہوں پر جن چار منشیوں کا تقرر ہوا ان کے نام ہیں سید جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی خاں ان کا مشاہرہ بھی چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔

ہیڈ اور سکند منشیوں کو اتوار کے علاوہ باقی تعطیلوں میں بھی دس بجے صبح سے ایک بجے دن تک کالج میں حاضر رہنا پڑتا تھا تاکہ طلبہ جب چاہیں ان سے استفادہ کر سکیں۔ کالج میں تعلیم کے اس انتظام کے علاوہ طلبہ کو باہری مدرسوں سے بھی استفادے کی اجازت حاصل تھی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ان ہی منشیوں سے رجوع کریں جنہیں کالج کی طرف سے پڑھانے کے سندی گئی ہو۔

کالج کی عمارت کے لیے جگہ کا انتخاب:

ولزی کے منصوبے کے مطابق کالج کا احاطہ (Campus) ایسا ہونا چاہیے تھا جہاں پانچ سو طلبہ سارے اساتذہ، ایک پبلک ہال، ایک کتب خانہ اور گرجا گھر کے لئے جگہ ہو۔ اس کے لیے ولزی نے گارڈن ریج کا انتخاب کیا۔ کالج کی عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے سرکاری طور پر اس کا سروے بھی کر لیا گیا تھا۔ اس میں بسنے والے کاشت کاروں کی نہرست سازی، ان کی باز آبادگی اور ان کی زمینوں کی قیمت متعین کرنے کی کارروائی بھی عمل میں آچکی تھی۔ لیکن کالج

لے گارڈن ریج فوٹ ولیم کی دوسری جانب واقع ہے جو خضر پور سے متصل ہے۔ اس کے بعد میا براج کا علاقہ

مشکلات حائل نہ ہوں۔

کالج میں طلبہ کا داخلہ:

۱۶ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو مطلع کیا گیا کہ ۱۷۹۸ء میں آئے ہوئے کمپنی کے ملازمین میں سے جو لوگ فورٹ ولیم کالج میں داخلے کے خواہش مند ہوں انہیں اس کی اجازت دے دی جائے۔ ۲۰ اکتوبر کو گورنر جنرل نے ایک قرارداد کے ذریعے سول ملازمین کا منشی الاؤنس بند کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ ۳ نومبر ۱۸۰۰ء کو ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ ۳ مئی ۱۷۹۸ء اور دسمبر ۱۷۹۸ء کے درمیان آئے ہوئے بنگال پریسڈنسی کے جو ملازمین چاہیں وہ کالج میں داخلے سکتے ہیں۔ ان اعلانوں کے بعد کلکتہ، راج شاہی، مین سنگھ، جون پور، پٹنہ بھاگل پور، سارن، چاٹ گام، مالہ، ڈھاکا، مرشد آباد، زنگ پور، مدراس، بمبئی اور کمپنی کے دیگر مقبوضات سے سرکاری ملازمین داخلے کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اور پہلے سال میں چونستھ (۶۴) طلبہ کا داخلہ ہوا۔

کالج میں تعلیم کی ابتدا:

کالج کی داغ بیل ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو ڈالی گئی۔ لیکن درس و تدریس کا سلسلہ ۲۲ نومبر سے پہلے شروع نہ ہو سکا۔ پروووسٹ نے ۱۵ نومبر ۱۸۰۰ء کو بی فارسی اور ہندوستانی زبانوں پر لکچروں کے آغاز کا نوٹس جاری کیا۔ یہ لکچرز ۲۲ نومبر ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر دسمبر کے آخر تک چلتے رہے۔ لیکن باقاعدہ طور پر درس و تدریس کا آغاز ۶ فروری ۱۸۰۱ء سے کیا گیا۔

۱۷ دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

۱۸ سلیم اختر، مقدمہ باغ و بہار ص ۱۸۔ دارشنے کا یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ "کالج کا پہلا مشن باقاعدہ طور پر ۶ جنوری ۱۸۰۱ء سے رکھا گیا۔ (فورٹ ولیم کالج ص ۱۹-۱۸) کیوں کہ دستور کے مطابق کالج کی پہلی بیعتات ۶ فروری سے شروع ہوتی تھی اور جنوری کا مہینہ وقفے کا ہوتا تھا۔

طلبہ کے کردار کے لیے کالج میں خاص اہتمام:

لارڈ ولزلی کو سول ملازمین کے لیے ویسی زبانوں کی تعلیم کے انتظام کے ساتھ ساتھ ان کے کردار و اخلاق درست کرنے کی فکر بھی لاحق تھی۔ کیوں کہ وہ طلبہ کم سنی میں انگلینڈ کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آتے تھے اور سماجی شعور اور علمی تجربے کے اعتبار سے بالکل نا پختہ ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی تہذیب و تربیت اور اخلاقی حیثیت سے انھیں وسیع بنانے کے لیے کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی پروگرام کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔

بہ قول صدیق الرحمن قدوائی

” کالج کے ذمہ داروں نے طلبہ کے کردار اور نظم و نسق کی اصلاح پر بہت زیادہ توجہ صرف کی۔ ان کے سارے کام نجی ہوں یا سرکاری پروویسٹ کے زیر نگرانی ہوتے تھے۔ اس طرح پروویسٹ کی وساطت سے گورنمنٹ کی نگرانی ہوتی تھی۔ باری باری سے سہ طلب علم ایک ہفتہ کے لیے ہاسٹل کے ٹیبل (طعام گاہ) کے صدر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اپنے ساتھی طلبہ کی حرکتوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور ان طلبہ کی پروویسٹ کو رپورٹ دینے کا ذمہ دار تھا جو دو مرتبہ سے زیادہ طعام گاہ سے غیر حاضر ہوتے تھے۔ پروفیسر بھی باری باری سے طلبہ کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ انھیں دوران لکچر بھی طلبہ کی حاضری لینے کی ذمہ داری سپرد تھی۔ ہیڈ اور نائب منشیوں کا یہ فرض تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کی عملی مدد کرتے رہیں۔۔۔ جو طالب علم ضابطے کی خلاف ورزی کرتا اس پر جرمانہ عاید کیا جاتا تھا۔ کالج کے رکاڈز ظاہر کرتے ہیں کہ اس قسم کی سخت نگرانی سے طلبہ کے کردار میں ایک مثالی اصلاح ہوئی تھی۔“

۱ Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 22-23

گورنر جنرل اور کورٹ کے درمیان کش مکش:

قیام کالج کے متعلق گورنر جنرل کے فیصلے پر کورٹ کے مخالفانہ رد عمل کو مالی مشکلات پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ جہاں تک مالیات کا تعلق تھا گورنر جنرل نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا بار کمپنی پر نہیں پڑنے دیں گے۔ ڈائریکٹروں کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہونی کہ کالج کے قیام سے ملازمین کی تقرری ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہندوستانی ملازمین کے تقرری ڈائریکٹروں کی پیشگی ام زدگی پر ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان میں ملازمت کرنے کا مطلب دولت کمانے کا ایک لائسنس تھا۔ کمپنی کی سول ملازمت کا کھلا اشتہار ہوتا تھا جو قیمتاً فروخت ہوتی تھی۔ دوسری بات، جو ڈائریکٹروں کو کھٹکتی تھی وہ یہ کہ مختلف پریسڈنسیوں کے نوجوان جب ایک جگہ طالب علم کی حیثیت سے جمع ہوں گے تو ان کے اندر حریت اور سرکشی کے جذبات، خیالات پرورش پائیں گے اور پروان چڑھیں گے جس سے برصغیر میں برطانوی اقتدار کی بنیاد پر کاری ضرب لگے گی اور کمپنی کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ انگلینڈ کے غیر جانب دار لوگ سول ملازمین کی تربیت کے لیے ایک ادارے کے قیام سے تو متفق تھے لیکن ان کے خیال کے مطابق اس طرح کی تعلیم و تربیت کے لیے انگلینڈ ہی بہتر جگہ تھی کالج کی مخالفت میں چاہے کتنے ہی منطقی دلائل پیش کئے جائیں لیکن سچی اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں صالح خیالات کا ابھرا ڈائریکٹروں کو پسند نہیں تھا۔ ولزلی نے کالج قائم کرنے سے پہلے کورٹ کو اس لیے مطلع نہیں کیا کہ اخراجات کے پیش نظر ڈائریکٹرناس کی اجازت نہیں دیں گے اور کالج کا قیام کھٹانی میں پڑ جائے گا۔ لیکن انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ کالج کے قیام کے بعد ڈائریکٹروں سے توڑنے سے پہلے اپنے فیصلے کے نتائج و عواقب پر سوچیدگی سے غور کریں گے اور توڑنے کا حکم بہر حال نہیں دیں گے۔

Editorial and the
Language of Hindoo-
stan P. 19

کابج توڑنے کا حکم!

کابج کا نظم بہتر طور پر چلانے کے لیے ولزلی نے کابج کے پہلے دستور کا پہلا باب (chapters) منظور کیا۔ جسے وزی ٹر کی اجازت سے پروڈسٹا نے ۱۰ اپریل ۱۸۰۱ء سے نافذ کیا۔ ان ہی دنوں ڈائریکٹروں کی ایک بڑی تعداد ولزلی کے خلاف خفیہ سازش کرنے لگی تھی۔ ایسی حالت میں ان کا اپنے عہدے پر قائم رہنا مشکل تھا۔ انھوں نے ڈائریکٹروں کو لکھا کہ ۱۸۰۲ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں وہ انگلینڈ واپس چلے جائیں گے۔ لیکن کچھ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کورٹ نے ان سے جنوری ۱۸۰۳ء تک رکنے کی درخواست کی۔ اس پر ولزلی نے ۱۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو رائٹس آنریبل ہنری ایڈنگٹن کے نام ایک خط میں لکھا کہ جو وقت میں نے ہندوستان میں رکنے کا متعین کیا ہے اس سے زیادہ میرا رکناسی طرح بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ ڈائریکٹروں کا اعتماد مجھ پر ختم ہوتا جا رہا ہے اور برٹش انڈیا کی فلاح و بہبود کے لیے فورٹ ولیم کابج کا جو منصوبہ میں نے بنایا ہے وہ ڈائریکٹروں کو باطل پسند نہیں۔ بالآخر انھیں ڈائریکٹروں کی طرف سے ۲۷ مایچ ۱۸۰۱ء کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا جس نے ان کے خرمین امید پر بجلی گرا دی۔ اس خط میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا ان کا خلاصہ یہ ہے

” فورٹ ولیم میں ایک کابج کے قیام کے سلسلے میں مارکوس ولزلی کی تجاویز پر ہم نے کافی غور و خوص کیا، اگرچہ ہمیں ولزلی کی تجاویز کا جو وسیع النظری، بلند خیالی اور اعلیٰ قابلیت سے مملو ہیں، مبنی بر انصاف ہونا تسلیم ہے۔ تاہم موجودہ حالات میں جب کہ کمپنی قرضے کے بھاری بوجھ کے تلے دبی ہوئی ہے اور روپیے کی کمی کی وجہ بہت سے کاموں میں یا تو تخفیف کر دی گئی ہے یا انھیں بالکل بند کر دیا گیا ہے، ہم اپنے فرض کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ادارے کے فوری قیام کے منصوبے کو جس کے کچھ حصے ہمیں پسند ہیں اپنی منظوری سے نہیں دے سکتے۔ ادارے کے قیام پر خرچ کی جانے والی رقم کسی دوسرے منفعہ بخش

کام میں لگائی جاسکتی ہے۔“

”پیشگی اطلاع اور منظوری کے بغیر کالج قائم کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل کے توجیہات پر ہم نے بطور خاص غور کیا ہے۔ ان کے جذبات قابل تحسین ہیں لیکن ایک مسلمہ ضابطے سے انحراف کی اجازت ہم کبھی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ اس رجحان سے اس ملک میں قانونی طور پر قائم شدہ اقتدار کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“

گورنر جنرل کی تجاویز پر کسی قسم کی بحث کیے بغیر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کمپنی کی موجودہ حالت کے پیش نظر ان تجاویز کو رد بہ عمل لانا بس کے باہر کی چیز ہے۔“

”دسمبر ۱۹۸۸ء میں گل کرسٹ نے علوم کی تدریس کے لیے ایک سمٹری ادارہ قائم کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ اسی کے اصولوں کی روشنی میں بڑے پیمانے پر ایک ادارے کے قیام سے ہمارے نزدیک ان مقصد نتائج کا حصول ممکن ہے جن کی توقع گورنر جنرل اپنے مجوزہ ادارے سے کرتے ہیں۔ اس سمٹری میں پڑھنے والوں کے جون ۱۹۸۰ء کے امتحان کے نتیجے سے ہمارے اس قیاس کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو اس ادارے کی تجدید پر غور کرنے کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ ہماری رائے میں اسے کمپنی پر اخراجات کا زیادہ بوجھ ڈالنے بغیر بحسن و خوبی چلایا جاسکتا ہے۔“

”لہذا اس خط کے موصول ہوتے ہی کالج سے متعلق جتنے بھی اخراجات ہوں فوراً بند کر دیے جائیں اور ساتھ ہی دیگر علاقوں سے بلائے گئے طلبہ جلد سے جلد واپس بھیج دے جائیں۔“

ولزلی نے کورٹ کے حکم کی تعمیل میں ۲۳ جون ۱۹۸۰ء کو کالج توڑنے کی ہدایت تو جاری کر دی، لیکن اپنے خاص اختیار سے سلسلہ تعلیم کے اختتام کی قطعی تاریخ مانتی رکھی اس کا خیال تھا کہ یہ کام بہ تدریج ہونا چاہیے اور کسی بھی حالت میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۰ء سے قبل کالج کا بند کرنا مناسب نہ ہوگا کیوں کہ دستور کے مطابق ۱۹۹۹ء اور ۱۹۸۰ء میں بیٹی اور مدد اس سے آئے ہوئے طلبہ دسمبر ۱۹۸۰ء تک اور ۱۹۸۰ء میں آئے ہوئے طلبہ ۱۹۸۰ء کے

لے بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۲۲-۲۳

آخر تک اپنی تعلیم مکمل کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اساتذہ اور نمشیوں سے جو معاہدے ہو چکے ہیں ان کا پورا کرنا بھی فرض ہے۔ ولزلی کے لیے یہ بات باعث شرم و عار تھی کہ اہل علم حضرات جو در دراز علاقوں سے مدعو کیے گئے ہیں انھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا جائے اور وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جا کر یہ کہتے پھریں کہ برطانوی حکومت ان اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتی جنہیں اس نے علم و ادب کی توسیع و ترقی کے لیے اپنے ذمہ لیا تھا۔

۱۵۔ اگست ۱۸۰۲ء کو ولزلی نے اپنے ایک مراسلے میں ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۰۳ء سے قبل کالج توڑ کر کے میں آپ کی وفاداری کا فریضہ تو انجام دے سکتا ہوں لیکن یقین کیجئے کہ اس کے لیے مجھے اپنے مستحکم اعتماد کو خیر باد کہنا پڑے گا اور اپنے دلی جذبات کی آگ کو بجھا دینا پڑے گا اور اگر اس بات پر غور کروں کہ اس کالج کی بقا سے عوام کو کتنے فائدے پہنچ سکتے ہیں اور اسے توڑ دینے سے انھیں کتنی پریشانیاں لاحق ہوں گی تو میرے دل کو بڑا اٹھ پیچھے گا۔

کورٹ نے کالج توڑنے کے جواز میں مالی مشکلات کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔ اس کے جواب میں گورنر جنرل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پچھلے نو مہینوں کے حساب سے کورٹ کو اندازہ ہو گا کہ کمپنی کے اوپر قرض اب بہت کم رہ گیا ہے۔ بنگال۔ بمبئی اور مدراس میں جو رقوم خرچ ہو رہی ہیں ان سے اب فائدہ ہی فائدہ ہو گا اور ہندوستان کے سیاسی حالات بھی اب اعتدال پر ہیں جس سے کمپنی کے خزانے میں اضافے کی قوی امید ہے۔ ٹیکس کا ذکر کرتے ہوئے ولزلی نے لکھا تھا کہ ۱۸۰۲-۱۸۰۱ء میں نئے ٹیکس سے بارہ لاکھ ستر ہزار روپیے کی مزید آمدنی ہوئی ہے جبکہ اگلے سال چودہ لاکھ کی امید ہے۔ کالج پر کیے گئے اخراجات کی معقولیت کا اندازہ اس کے اغراض و مقاصد اور اس سے ہونے والے فوائد سے کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ بحوالہ P. 21 Gilchrist and the language of Hindoostan

۲۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۳۲

اس کے علاوہ ولزلی نے اپنے ہم خیال اور ہمدرد افراد کا ایک حلقہ بنانے کے لیے انگلینڈ کے دوسرے بااثر لوگوں سے بھی مراسلت شروع کی۔ ۵۔ اگست ۱۸۰۲ء ہی کو اس نے رائٹ آنریبل دی ارل آف ڈارٹ متھ کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ کورٹ کو لکھے گئے خط کی ایک نقل بھی منسلک کر دی۔ ولزلی نے اس خط میں ان سے گزارش کی تھی کہ کالج کی تجدید کے لیے آپ سے جو کچھ ہو سکے کریں ورنہ میرے فیصلے کے بموجب کالج توڑ دیا جائے گا۔ اس طرح کی خط و کتابت سے ولزلی نے متعدد اعلیٰ افسروں اور انگلینڈ کے معزز لوگوں کو اپنا ہم خیال وہم نوا بنایا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بورڈ آف کنٹرول بھی ہر طرح سے اس کی معاونت و مساعدت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

کالج میں عارضی ہنگامہ:

ولزلی چاہتا تھا کہ جب تک اس قضیے کا قطعی اور آخری فیصلہ نہ ہو جائے تب تک اس خبر کو صیغہ راز میں رکھا جائے لیکن ایسی خبروں کو تو پر لگ جاتے ہیں چناں چہ یہ خبر بھی کونسل تک ہی محدود و محصور نہ رہ سکی بلکہ جنگل کی آگ کی طرح کالج تک جا پہنچی جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے اساتذہ و طلبہ میں بے چینی پھیل گئی۔ نائب پروفیسر پادری بک نے ۱۴۔ جون ۱۸۰۲ء کو طلبہ کے نام ایک نوٹس جاری کر کے بمشکل ان کے براہ کھمتہ جذبات کو ٹھنڈا کیا۔

کورٹ اور ولزلی میں مصالحت اور کالج کی تجدید کا حکم:

کورٹ اور ولزلی کے تصادم میں انگلینڈ کے وہ سبھی لوگ ملوث ہو گئے تھے جو ولزلی کے ہم خیال تھے۔ ولزلی اور بورڈ آف کنٹرول نے اس معاملے کو پارلیمنٹ میں لے جانے کی دھمکی دی۔ اس دھمکی نے کورٹ کو ایک حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا۔ کیوں کہ پارلیمنٹ میں لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی کے سارے معاملات کھل کر سامنے آئیں۔ اس سے ڈائریکٹروں

کے ذاتی مفاد پر پانی پھر جاتا اس لیے انھیں صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ چارلس گرانٹ نے اس کا حل یہ نکالا کہ کالج کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کا دائرہ عمل کچھ فروعات کو کم کر کے دیسی زبانوں اور قوانین کی تعلیم تک محدود کر دیا جائے۔ اس تجویز کے بعد ڈائریکٹروں نے ۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں تاعلم ثانی کالج کو بدستور قائم و جاری رہنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

ولزلی کی انگلینڈ واپسی اور کالج کی حیثیت!

اس صفائی اور مصالحت کے باوجود گورنر جنرل اور کورٹ کے درمیان تلخیوں کا سلسلہ جاری رہا تاہم اپنی ناگزیر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ولزلی کو کچھ دنوں تک ہندوستان میں رکنا پڑا۔ ۱۸۰۵ء میں کورٹ نے اس پر تین الزامات عاید کیے۔

۱۔ کورٹ کی حکم عدولی، اور انتہائی ضروری معاملات میں حکومت کی منظوری حاصل نہ کرنا۔

۲۔ ملازمین کی غیر قانونی تقرری کرنا۔^۴

۳۔ قانون کی خلاف ورزی اور عوام کے سرمائے کا بے جا مصرف۔

اس پر ولزلی اپنے غصے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور اسی سال ۱۵ اگست ۱۸۰۵ء کو استعفا دے کر انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل پرووسٹ ڈیوڈ براؤن کو کالج کو محدود پیمانے پر چلانے کا حکم مل چکا تھا، جو ڈائریکٹروں کے منشا کے عین مطابق تھا۔ پرووسٹ نے ۱۸۰۶ء میں کالج کے لیے دوسرا دستور مرتب کر کے گورنر جنرل کی کونسل میں پیش کیا، اور ۲۱ دسمبر ۱۸۰۶ء کو گورنر جنرل بارلونے اس کی منظوری عطا کی۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج صرف نام کا کالج رہ گیا۔ اس کی حیثیت گھٹ کر صرف بنگال سول سروس کے لیے ایک سمٹری کی رہ گئی۔

۱۔ چارلس گرانٹ دو مرتبہ ہندوستان آچکے تھے۔ اب وہ مستقلاً انگلینڈ میں رہ کر سیاست کی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے اور اباب سیاست سے بھی ان کے خوش گوار تعلقات تھے۔

۲۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہدہ ۱۲۲۔

جان گل کرسٹ: صدر شعبہ ہندوستانی: (اگست ۱۹۱۸ء تا فروری ۱۹۱۸ء)

یہ ایک عجیب سوہ اتفاق تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے معرض وجود میں آتے ہی اس کے اندر اور باہر تصادم اور کشاکش کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف ولزلی اور کورٹ کے درمیان رسہ کشی جاری تھی تو دوسری طرف کالج کے اندر گل کرسٹ اور کالج کونسل کے مابین اختلاف رائے اور ناخوش گو اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور جس طرح ولزلی اور کورٹ کی نبرد آزمائی، ولزلی کے استعفیے اور اس کی انگلینڈ مراجعت پر ختم ہوئی، اسی طرح گل کرسٹ اور کونسل کا تصادم بھی گل کرسٹ کے استعفیے اور اس کی انگلینڈ واپسی پر منتج ہوا۔

کالج کے قیام سے قبل اُردو نثر میں کوئی ایسی عام فہم کتاب تصنیف نہیں ہوئی تھی جسے انگریز طلبہ آسانی سے پڑھ سکتے۔ اور جو کتابیں موجود تھیں وہ بھی چھاپے خانے کی عدم موجودگی کی وجہ سے زیادہ تعداد میں دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے ہندوستانی نثر میں عام فہم اور سلیس کتابوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ شروع میں کتابوں کے دستی نسخے تیار کر کے کسی طرح کام چلایا گیا۔ لیکن نقل کرانے میں کافی غلطیاں رہ جاتی تھیں اور اس میں خرچ بھی زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ کالج کونسل نے نومبر ۱۹۱۸ء میں یہ طے کیا کہ صدر شعبہ مختلف کتابوں کے مضید انتخابات مرتب کر کے انھیں چھپوائیں تاکہ آسانی سے کتابیں فراہم کی جاسکیں۔ لیکن کونسل نے یہ شرط بھی رکھی کہ شائع کرانے سے پہلے ان کتابوں کے مسودے کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیجا ضروری ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد ہندوستانی شعبے کے صدر مسٹر گل کرسٹ نے ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء کو کالج کونسل کے نام ایک خط لکھا کہ

”ہندوستانی میں ایسی کتابیں دستیاب نہیں ہیں جن سے تھوڑی بہت

بھی مدد لی جاسکے۔ اس لیے مجھے حسب ذیل کتابیں مختلف شرح پر چھاپنے کے

لیے مجبور ہونا پڑا۔ اس کام کے لیے میں نے کلکتے کے تقریباً سبھی چھاپے

خانوں کی مدد حاصل کر لی ہے، تاکہ کم وقت میں ہم اپنے گوہر مراد کو حاصل

کر سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ کالج کونسل اس اقدام کو قطعاً ناگزیر سمجھ کر ممکنہ طور

پر میری حوصلہ افزائی کرے گی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ برسوں تک ان سے کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کی ضرورت نہ پڑنے سے کالج کا مزید خرچ بھی نہ ہوگا اور آدھے نسخوں کی فروخت ہی سے کتاب کی پوری قیمت نکل آئے گی۔ چھپائی کا خرچ کم کرنے کی غرض سے نسخوں کی تعداد پانچ سو کر دی گئی ہے۔ اگر کالج کونسل ان کتابوں کی فروخت برٹش انڈیا کی فلاح و بہبود کے لیے مفید سمجھے تو میں مستقبل میں پانچ سو کی بجائے ایک ہزار نسخے چھپوانے کی سفارش کروں گا۔

گل کرسٹ نے اس خط کے ساتھ کتابوں کی جو فہرست مع اخراجاتِ طباعت کے تھینے کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیجی تھی، وہ حسب ذیل ہے۔

نام کتاب	تعداد	رسم خط	مطبع	تھینے اخراجات (روپیوں میں)	کیفیتِ طباعت
۱۔ مسکین کے مرثیے	۵۰۰	ناگری	ہرکارہ پریس	۳۴۳	طباعت مکمل ہو چکی ہے
۲۔ سنگھاسن بتسی	"	"	"	۲۵۰۰	۲۶ صفحات چھاپے جا چکے ہیں
۳۔ شکنتلا نامک	"	"	کلکتہ گزٹ	۲۰۰۰	"
۴۔ اخلاق ہندی	"	"	ٹیلی گراف	۲۵۰۰	طباعت شروع
۵۔ مادھونل	"	"	"	۳۰۰۰	ابھی طباعت شروع نہیں ہوئی
۶۔ بیتال پچپی	"	"	"	۸۵۰۰	"
۷۔ چاردریش	"	فارسی	ہرکارہ پریس	۸۸۰۰	۵۸ صفحات چھپ چکے ہیں
۸۔ مثنوی میر حسن	"	"	کلکتہ گزٹ	۵۰۰۰	"
۹۔ گلستاں (اردو ترجمہ)	"	"	میرر پریس	۸۵۰۰	طباعت شروع
۱۰۔ توتا کہانی	"	"	ٹیلی گراف	۵۵۰۰	"

لے بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۴۲

۱۱۔ گلشن (ہفت گلشن)	۵۰۰	فارسی	۳۰۰۰	ابھی طباعت شروع نہیں ہوئی
۱۲۔ ہندوستانی پریس	۵۰۰	انگریزی مارنگ پوسٹ	۳۰۰۰	۴۰ صفحات چھپ چکے ہیں
۱۳۔ مشقیں	۲۰۰	تینوں زبانوں میں	۱۰۰۰	طباعت شروع نہیں ہوئی

۵۹۲۹۲

ان کتابوں کے متعلق گل کرسٹ نے لکھا تھا کہ ان میں کالج کے منشیوں اور طالب علموں کے لیے سبھی سوالوں کے جوابات موجود ہوں گے۔ فہرست کے آخر میں انہوں نے یہ صراحت بھی کر دی تھی کہ اخراجات کا جو تخمینہ لگایا گیا ہے اس میں منشیوں اور مترجمین کی اجرتا جس کی وہ کالج سے امید کرتے ہیں شامل نہیں ہے۔ سرسری اندازے کے مطابق اس مد پر چار ہزار روپیے سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔

کالج کونسل نے گل کرسٹ کے تخمینے کو دیکھنے کے بعد اس پر قطعی فیصلے کو ملتوی رکھتے ہوئے وقتی طور پر صرف ”مسکین کے مرثیے“ کی پانچ سو کاپیاں چھاپنے کی منظوری دے دی۔ کتابوں کی طباعت کی کل لاگت تقریباً ۶۳ ہزار روپیے آئی تھی۔ اس لیے کونسل نے گل کرسٹ کو لکھا کہ آئندہ جب تک مسودات کونسل کو نہ دکھا دیے جائیں اور چھاپے جانے والے اجزاء ان کی تعداد اور ان پر خرچ کی منظوری نہ لے لی جائے تب تک اس میں کوئی رقم خرچ نہ کی جائے۔ نیز مستقبل میں کالج کی طرف سے طلبہ کو کتابوں کی فراہمی کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس ہدایت کے ساتھ ہی ۲۰ جون ۱۸۰۱ء سے تا وقت تحریر جو کتابیں شائع ہو چکی تھیں ان کے فہرست اور اخراجات کی تفصیلات بھی گل کرسٹ سے طلب کی گئیں۔

گل کرسٹ نے ۱۲ جنوری کے محولہ بالا خط کا حوالہ دیتے ہوئے ۲۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو کونسل کے نام پر ایک خط لکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کونسل ہندوستانی شعبے کے لیے اتنی بڑی رقم منظور کرنا نہیں چاہتی۔ اب تک وہ صرف پندرہ روپیے قیمت تک کی کتابیں پریس بھیج چکے تھے۔ چار رویش کے ساتھ صفحے تیار کرنے میں آٹھ مہینے لگے تھے اور اتنا ہی وقت اسے مکمل کرنے میں انہیں اور صرف کرنا پڑتا۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری بحث و مباحثے میں وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔ ہندوستانی زبان کے اس نہال نونے ابھی جڑ پکڑی ہے۔ اگر اس وقت

کفایت شعاری اور کونسل کے نظم و نسق کی پابندی کی گئی تو اس کے پھولنے پھلنے میں ایک زمانہ لگ جائے گا۔ ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے میرے اوپر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ ہندوستانی زبان میں اچھی اور مفید کتابیں تیار کراؤں۔ اس سے نہ صرف کالج کے طلبہ مستفیض ہو سکیں گے بلکہ برطانوی مقبوضات میں بھی اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ سارے اخراجات کا بار خود اپنے اوپر لیتے ہوئے حسب ذیل شرائط کے ساتھ گل کرسٹ نے اپنا خط ارسال کر دیا۔

۱۔ جو کتابیں میں طلبہ کے لیے چھاپوں ان میں سے ہر کتاب کے سو سو نسخے مصنف اور ناشر کی حیثیت سے میری ہمت افزائی کے لیے بازاری قیمت پر گورنمنٹ خرید لے گی۔
۲۔ ہر کتاب جو میں چھاپوں گا اس کا مواد طباعت سے پہلے کالج کونسل کی منظوری کے لیے پیش کروں گا۔

۳۔ گورنمنٹ کی طرف سے خریدی ہوئی کتابیں دنیا کے مختلف کالجوں میں مفت تقسیم کی جائیں گی، یا پورے ایڈیشن ختم ہونے تک کالج میں محفوظ رہیں گی۔
۴۔ محفوظ شدہ نسخوں میں سے مطلوب نسخوں کی لاگت دیتے ہی وہ میری ملکیت سمجھی جائیں۔

۵۔ ہندوستانی درجے کی ضروری کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہر طالب علم کو بازاری قیمت پر خریدنا پڑے گا۔

۶۔ طلبہ کی ضرورت پوری ہونے پر مجھے وہ کتابیں فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ مصنف کے سبھی حقوق، اصطلاح کے وسیع ترین مفہوم میں مجھے حاصل ہوں گے۔

۷۔ تالیف، ترجمہ اور نقل کا پورا خرچ میں اس شرط پر دوں گا کہ گورنمنٹ میری بہادری کو اپنے مصارف پر ہندوستانی کتابوں کی تصحیح اور مقابلے کے لیے میری ماتحتی میں بحال رکھے گی اور ان کے استعفیے یا انتقال پر ان کی جگہ دوسرا صاحب استعداد شخص مقرر کرے گا۔

۸۔ ہندوستانی شعبے کے ہر طالب علم کو پہلے سال پچاس روپیے ماہوار، دوسرے سال تیس روپیے ماہوار اور تیسرے سال بیس روپیے ماہوار کی کتابیں بہر حال خریدنا ہوں گی۔

۹. ناشر کی حیثیت سے میرے طرز عمل کے احتساب کا پورا حق کونسل کو حاصل ہوگا لیکن طلبہ کے کالج چھوڑنے سے پہلے ان سے میرا قرض وصول کرنے میں گورنمنٹ سہ طرح سے میری معاونت کرے گی۔

۱۰. جو کتابیں اس وقت چھپ رہی ہیں وہ مختلف حالات میں دی گئی ہیں اس لیے ان کا مناسب معاوضہ مجھے دیا جائے۔

گل کرسٹ کالج کونسل کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نئے منصوبے کو قبول کر لینے میں کالج ہی کا فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ بعض طلبہ اتنے لاپرواہ تھے کہ کالج کی طرف سے دی گئی کتابیں کھودیتے تھے یا ان کے دوچار صفحات پھاڑ ڈالتے تھے جس سے چالیس پچاس روپیے قیمت کی کتاب بے کار ہو جاتی تھی۔ اس خرچ کو روکنے کے دو ہی طریقے تھے۔ اولاً یہ کہ گورنمنٹ گل کرسٹ کے منصوبے کے مطابق ان کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری قبول کر لے۔ ثانیاً یہ کہ لاپرواہ طلبہ کو کتابوں کی فراہمی بند کر دی جائے۔ لیکن اس سے طلبہ کی ترقی کی راہ مسدود ہو جاتی، جس کے لیے گل کرسٹ تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تین سال تک کتابوں کے پھپھائی کا انتظام ان ہی کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔

کونسل نے ۲۵ جنوری ۱۸۰۲ء کو ایک خط کے ذریعے گل کرسٹ سے منتخب کتابوں کی فہرست اور ان کی پھپھائی کی لاگت کا حساب طلب کیا۔ لیکن اس خط میں ان کی پیش کردہ شرائط کا سرے سے کوئی ذکر نہیں تھا، بلکہ کونسل نے یہ حکم بھی دیا کہ تمام کتابوں کی طباعت کی بجائے ان کا خلاصہ ایک یا دو جلدوں میں شائع کیا جائے۔ گل کرسٹ نے اس کے جواب میں ۲۴ جنوری ۱۸۰۲ء کو کونسل کو لکھا کہ "ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں جہاں مکھیوں کا ایک چھتہ بھی موجود نہ ہو۔" انھوں نے ۳۱ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہندوستانی شریں قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو میرے طلبہ کے لیے مفید ہو سکے، جہاں تک ہندوستانی شاعری کا تعلق ہے تو اسے محض اس زبان کے عالم ہی پڑھ اور سمجھ سکتے

Understand the language of Hindoo stars, p. 50

ہیں۔ کالج کے طلبہ کے لیے وہ دن ابھی دور ہے۔ دو تین سال کے بعد وہ اس لائق ضرور ہو جائیں گے کہ ہندوستانی شاعری سے استفادہ کر سکیں۔ مالی نقطہ نظر سے کتابوں کی نقلیں کرانے کی بہ نسبت ان کی طباعت سے کالج کو فائدہ تھا کیوں کہ شروع کے اخراجات بہت جلد پور ہونے کی امید تھی۔

اسی خط میں گل کرسٹ نے کونسل سے دس سے بیس ہزار تک روپیہ ابتدائی خرچ کے طور پر اس شرط کے ساتھ مانگا تھا کہ کتابوں کی طباعت میں اتنے مصارف کے بعد بھی کوئی مضید نتیجہ نہ نکلا تو ہندوستانی شعبے میں کفایت شعاری سے کام لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ اگر اب بھی کونسل میری تجویز قبول نہیں کرتی تو میں ان کتابوں کے چھپائی کا کام فوراً بند کر دوں گا۔ اور ایک ایسی زبان میں جس میں طلبہ کے لیے ایک بھی مناسب کتاب موجود نہیں ہے بطور انتخاب ایک یا دو جلدیں مرتب کر کے طباعت کے لیے کونسل کے پاس بھیج دوں گا۔

اس خط کے جواب میں یکم فروری ۱۸۰۲ء کو کونسل نے گل کرسٹ کو مکرر ہدایت کی کہ ”کتابوں کے جو حصے باقاعدہ چھپ چکے ہیں ان کا ایک انتخاب تیار کیا جائے۔“ اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی عاید کر دی گئی کہ یہ انتخاب پانچ سو صفحے سے زیادہ کا نہ ہو، اور پانچ سو نسخوں کی طباعت میں پانچ ہزار روپیے سے زیادہ خرچ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس رقم میں ”مسکین کے مرثیے“ کے اخراجات طباعت بھی شامل تھے۔ ضرورت کے پیش نظر گل کرسٹ کی تصنیف ”ہندوستانی پرنسپلس“ (ہندوستانی صرف و نحو) اور مشقوں کی طباعت کے لیے پانچ ہزار روپیے کی علاحدہ سے منظوری دی گئی۔ علاوہ بریں کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر چنڈے سے ”چار درویش“ اور گلستاں“ (اردو ترجمہ) کی چھپائی ممکن ہو تو کونسل حکومت سے سفارش کرے گی کہ ان کے سو سو نسخے کالج کے لیے خرید لیے جائیں۔

بہر حال ہندوستانی زبان کی ترویج و ترقی میں گل کرسٹ کے منصوبے کو رو بہ عمل لانے

میں کونسل نے بخل سے کام لیا، جس کی وجہ سے گل کرسٹ کی سمیت افزائی نہ ہو سکی۔ آخر میں کونسل نے کالج کے لیے چھاپی گئی اور زیر طباعت کتابوں کا انتخاب اور ان کی لاگت کا تفصیلی نقشہ بنا کر گل کرسٹ کے پاس بھیج دیا۔ اس نقشے میں جس رقم کا تعین کیا گیا تھا وہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کے خط میں گل کرسٹ کی مجوزہ رقم سے بہت کم تھی۔ کونسل کی اس سرد مہری کی وجہ سے گل کرسٹ کے حوصلے اور جذبات کو ٹھیس لگی۔ اس کے بعد انھوں نے کتابوں کی طباعت سے متعلق کونسل سے کسی قسم کی خط و کتابت مناسب نہیں سمجھی۔

گل کرسٹ کے دیگر مطالبات:

جس زمانے میں گل کرسٹ ہندوستانی نثر کی کتابوں کی طباعت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اسی زمانے میں اپنے شعبے میں منشیوں، قصہ خواں اور خوش نویسوں کی تعداد میں اضافے کے لیے بھی ان کے مطالبات جاری تھے۔ نومبر ۱۸۰۱ء تک ہندوستانی شعبے میں تقریباً ساٹھ طلبہ تھے جنہیں پڑھانے کے لیے بارہ منشی مامور تھے۔ لیکن کام بڑھ جانے کی وجہ سے گل کرسٹ نے غلام اشرف کو، جو کالج سے برطرف کر دیے گئے تھے مکرر اپنے شعبے میں بلا لیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بارہ سند یافتہ منشیوں کو جنہیں ہندوستانی زبان میں مہارت نہ ہونے کی بنا پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا دوبارہ ملازم رکھ لیا۔ اور ۱۵ دسمبر ۱۸۰۱ء کو کونسل سے ان بارہ کے علاوہ آٹھ مزید منشیوں کے تقرر کا مطالبہ کیا۔

طلبہ کو خوش نویسی کی مشق کرانے کے لیے کالج میں خوش نویسوں کے تقرر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ان خوش نویسوں کی تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار ہوتی تھی۔ شروع میں فارسی سے خوش نویس کی حیثیت سے کلب علی خاں اور ناگری خوش نویس کے طور پر سند پناہت ملازم

۱۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ الف (۱)

۲۔ ان منشیوں میں سے بعض کو گل کرسٹ رومن اور ناگری رسم خط میں ہندوستانی قواعد کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

رکھے گئے تھے۔ بعد میں اس نظم کو بدل کر ناگری خوش نویس کو برطرف کر دیا گیا تھا اور فارسی خوش نویس کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار مقرر کر کے ان سے فارسی اور ہندوستانی دونوں شعبوں کے طلبہ کی تربیت کا کام لیا جانے لگا تھا۔ ۴ جنوری ۱۸۰۲ء کو گل کرسٹ نے پچاس روپیہ ماہوار پر ناگری خوش نویس کی جگہ دوبارہ بحال کرنے کی مانگ کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک قصہ خواں کا بھی مطالبہ کیا۔ اور اس کی ضرورت اہمیت واضح کرتے ہوئے کونسل کو لکھا:۔

”اپنے طویل تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قصہ خواں سے بھی طالب علم بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو گھروں پر جا کر ان کو قصہ سنائے۔ اس لیے مستدعی ہوں کہ میرے شعبے کے لیے چالیس روپیہ ماہوار کے ایک قصہ خواں کا تقرر منظور کیا جائے۔ نیز اس کی بھی مجھے اجازت دی جائے کہ جب تک کوئی ایسا آدمی مجھے نہ مل سکے جو اس تنخواہ کا اہل ہو اس وقت تک (کے لیے) کم تر درجے کے وہ قصہ خواں بیس بیس روپیہ ماہوار پر رکھ لوں۔“

۱۹ فروری ۱۸۰۲ء کو کونسل نے گل کرسٹ کے مذکورہ بالا تینوں مطالبات منظور کر لیے۔ ناگری خوش نویس کی حیثیت سے للوالال کا تقرر عمل میں آیا جو اس سے قبل اگست ۱۸۰۱ء سے سندھی نشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اور خلیل علی خاں اشک کا تقرر جیتیت قصہ خواں کے ہوا۔

عملے اور اخراجات میں تخفیف اور ہندوستانی شعبے کی تنظیم جدید:

کورٹ اور ولزلی کے تصادم میں کورٹ نے ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج توڑنے کا حکم

۱۵۸ لہ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۸

۱۵۸ لہ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ (دوماہی) اکادمی لکھنؤ شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء)

دیا تھا لیکن ولزلی نے اس حکم کو ۳۱ دسمبر ۱۸۰۳ء تک ملتوی رکھا۔ (گذشتہ صفحات میں اس پر مفصل بحث کی جا چکی ہے) دریں اثنا کونسل نے کالج کے مختلف شعبوں کے اخراجات اور ملازموں میں کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکم جون ۱۸۰۲ء سے کالج میں کام کرنے والے خانساماؤں، طباقوں، منٹلیچیوں، فراشوں، بھشتیوں، دھوبیوں اور مہنروں کی تعداد کم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنخواہوں میں بھی کمی کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فارسی اور ہندوستانی شعبوں کے پروفیسروں سے دریافت کیا گیا کہ ہیڈ اور سکند منشی کیا کام انجام دیتے ہیں؟ اور ان کا متعلقہ شعبوں میں برقرار رہنا کس حد تک ضروری ہے؟ اس استفسار کے جواب میں ایڈمنسٹرن اور جے۔ بیلی نے شعبہ فارسی کی طرف سے اور گل کرسٹ نے ہندوستانی شعبے کی طرف سے بالترتیب ۶ اور ۷ جون ۱۸۰۲ء کو خطوط لکھے۔ ہیڈ اور سکند منشیوں کی ضرورت اور ان کے کام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے گل کرسٹ نے بتایا کہ ان کے فرائض میں تالیف یا ترجمہ ہونے والی کتابوں کے تصحیح، قواعد کے لیے مختلف کتابوں سے مواد کی فراہمی، ماتحت منشیوں کی نگرانی، نووارد منشیوں کا امتحان لینا اور پروفیسروں کے اشکالات میں مدد کرنا شامل ہے۔ اس طرح جب ہیڈ اور سکند منشیوں کی خدمات ضروری اور ناگزیر برقرار پائیں تو کالج کونسل نے دوسری جگہوں میں کمی کر کے، ۷ جون ۱۸۰۲ء کو ہندوستانی شعبے کی از سر نو تنظیم کی۔ اس تنظیم جدید کے تحت مندرجہ ذیل جگہوں کی منظوری دی گئی۔

۲۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ	مترجم	میر شیر علی افسوس
" " ۸۰	"	کاظم علی جوال
" " ۸۰	"	مظہر علی ولّا
" " ۲۰۰	چیف منشی	میر بہادر علی حسینی
" " ۱۰۰	نائب منشی	تارنی چرن متر
" " ۸۰۰	ہر ایک کو ۴۰ روپہ ماہوار	۲۰ ماتحت منشی
" " ۶۰۰	" " ۲۰	۲۰ سندھ منشی
" " ۵۰	"	للولال بھاگھا منشی

۴ روپیہ ماہانہ تنخواہ

قصہ خواں

۵

مہاندنڈت ناگری خوش نویس

میرامن کو انعام :

۴ جون ۱۸۰۲ء کو گل کرسٹ نے ایک خط کے ذریعے میرامن کو "باغ و بہار" کی تصنیف پر پانچ سو روپیے کا انعام دینے کی سفارش کی۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی تصنیف "Tables and principles" کو شائع کرنے کی اجازت مانگی کونسل نے میرامن کو انعام دینا تو منظور کر لیا لیکن گل کرسٹ کی کتاب کی طباعت کے لیے راضی نہیں ہوئی۔

ولا اور قصہ خواں کی برطانی: میکڈیوگل اور موٹ کا تقرر :

کونسل نے ۳۰ ستمبر ۱۸۰۲ء کو ولا اور قصہ خواں کی خدمات کو غیر ضروری قرار دے کر انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا لیکن کام کی زیادتی کے پیش نظر ایک اسٹنٹ پروفیسر کی جگہ بڑھادی گئی جس پر ۲۹ نومبر ۱۸۰۲ء کو میکڈیوگل کا تقرر عمل میں آیا۔ پانچ ماہ بعد ۲ مئی ۱۸۰۲ء کو اساتذہ کے عملے میں فرسٹ اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کیپٹن موٹ کا اضافہ ہوا، جو بعد میں شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔

ہندوستانی مصنفین کو انعامات :

گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست پیش کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی علما اور قلم کاروں کی بہت افزائی کے لیے انھیں انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں

۱۔ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۵۲

۲۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ الف (۲)

نے ایک تجویز کا بھی حوالہ دیا تھا جو کچھ عرصے پہلے کونسل نے منظور کی تھی اور جسے اطلاع عام کے لیے شائع بھی کیا گیا تھا۔

گل کرسٹ کی پیش کردہ سفارشات کا جواب دیتے ہوئے کونسل کے سکریٹری نے لکھا تھا کہ ہمارا مقصد یہ کبھی نہیں تھا کہ جو عالم کالج کے باقاعدہ ملازم ہوں انہیں بھی انعام دیا جائے گا۔ یا نامکمل تصانیف کے لیے پہلے ہی سے انعام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ ۲ نومبر ۱۹۸۰ء کی جس تجویز کی رو سے انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا اس کے زمرے میں صرف وہی جفاکش، ثقہ اور قابل قدر مصنفین آتے ہیں جو بہ حیثیت ملازم کالج سے منسلک نہ ہوں یا جنہیں کالج سے معقول تنخواہ نہ مل رہی ہو۔ مسٹر گل کرسٹ نے تمام ہندوستانی مصنفین کا احاطہ کر لیا ہے اور وہ کتابیں بھی فہرست میں شامل کر لی ہیں جو ابھی زیر تصنیف ہیں اس لیے اس تجویز پر غور نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے معاً بعد گل کرسٹ نے کونسل کے سکریٹری کی تجویز کے مطابق دوسری سے فہرست تیار کر کے بھیج دی۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کی کارروائی میں کونسل نے یہ فہرست کول بروک (Cool Brook) کے سپرد کر دی۔ اور انہیں یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ایسے مصنفین کا انتخاب کریں جو واقعی قدر دانی کے مستحق ہوں۔

کول بروک نے یہ تصانیف دو ہندوستانی علما کے حوالے کر دیں اور انہی کی رائے کے مطابق ایک رپورٹ تیار کر کے ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو کونسل کو بھیج دی۔ کونسل نے اسی تاریخ کو ان کی رپورٹ کے مطابق حسب ذیل مصنفین کو انعام دینے کا اعلان کیا۔

۳۰۰ روپے کا انعام	بوستان (ترجمہ)	۱۔ حاجی مزار منگل
۱۰۰ روپے کا انعام	کلا کام	۲۔ کندن لعل
۱۰۰	گل ہرمنز	۳۔ غلام حیدر
۱۰۰	گل بکاولی	۴۔ بہال چند
۱۰۰	فیروز شاہ	۵۔ محمد بخش

جن کتابوں پر کوئی انعام نہیں دیا گیا تھا وہ ہیں گل صنوبر، الف لیلہ، دل ربا اور

حسن اختلاط ”گل صنوبر“ کے متعلق کول بروک نے لکھا تھا کہ مصنف کی جہالت کی وجہ سے یہ کتاب غلطیوں سے مملو ہے۔ اس کا مصنف اس اعتبار سے بھی انعام کی بجائے سرزنس کا مستحق ہے کہ اس نے ایسی کتاب کا لُح کے لیے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو نہایت غیر مہذب ہے۔

گل کرسٹ کا استعفا اور انگلینڈ واپسی:

یہ صحیح ہے کہ لسانیات کے مطالعے اور کالج کے ناگزیر تعلیمی امور میں منہمک رہنے کی وجہ سے گل کرسٹ کی صحت خراب ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے ۱۱ اپریل ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سکریٹری چارلس روٹھ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ”آپ کونسل کو میرے اس ارادے سے مطلع کر دیں کہ میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اور میرے اس ارادے کے محرک صرف یہ خواہش ہے کہ فرصت حاصل کر کے اپنی صحت بحال کروں، جو متواتر درد سر، بخار اور زکام کی وجہ سے خراب ہو چکی ہے۔ گل کرسٹ کا یہ خط ۲ مئی ۱۸۰۳ء کے اجلاس میں پیش ہوا۔ لیکن کونسل نے کسی آخری فیصلے پر پہنچے بغیر اپنی نشست برخاست کر دی۔ اور ولزلی نے ہندوستانی شعبے کی ضرورت کے پیش نظر گل کرسٹ کو رکنے کی ترغیب بھی دی جس کی وجہ سے انھیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ لیکن ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کو بغیر کسی اطلاع کے یکایک گل کرسٹ کا استعفا پیش کر دینا سب کو حیرت اور شبہ میں ڈال دیتا ہے۔ استعفیے کے اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ

”ناگہانی اور شدید علالت سے مجبور ہو کر پہلے جہاز سے یورپ واپس جانے کے لیے ہنزاکسلیسی گورنر جنرل سے اجازت حاصل کرنے کی مجھے ضرورت پیش آئی ہے، جو میں نے حاصل کر لی ہے اب یہ میرا فرض ہے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے قائم کردہ کالج میں ہنزلا رڈ شپا کی عنایت سے ہندوستانی

لے بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۷۷

Qidwai, "The Christian and the Language P. 54 of Hindoostan ..."

پروفیسر کے جس عہدے پر میں مامور ہوں، اس سے میں باضابطہ مستعفی ہو جاؤں۔ مستعفی ہوں کہ آپ کالج کونسل کو مطلع فرمادیں کہ کلکتہ (نامی) جہاں کی روانگی کی تاریخ سے جس کام میں نے ٹکٹ بھی خرید لیا ہے، میرا استعفا قبول کیا جائے۔

اکثر و بیش تر تاریخ نویسوں نے گل کرسٹ کے استعفی کی یہی وجہ بیان کی ہے جس کا اس نے اپنے استعفی میں ذکر کیا ہے۔ لیکن لکشی ساگر وارثنے اور عتیق صدیقی نے اس میں کچھ قیاس آرائیاں بھی کی ہیں۔ وارثنے لکھتے ہیں ”گورنر جنرل کی سفارش پر انھوں نے یورپا جانا ملتوی کر دیا تھا لیکن چون کہ کونسل نے ان کے کئی مالی مطالبات مسترد کر دیے اس لیے انھیں... مایوسی ہوئی ہوگی۔ خطوں سے ان کی علالت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے ان ہی وجوہ سے انھوں نے یورپ لوٹ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہو۔“

عتیق صدیقی کے مطابق ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گل کرسٹ علالت کی وجہ سے مستعفی نہیں ہوا تھا (بلکہ) حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کی ترویج و اشاعت اور جدید ہندوستانی ادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں کالج کونسل نے اس کی توقعات کے مطابق اس کا ہمت افزائی نہیں کی تھی... گل کرسٹ کو اس باب میں کالج کونسل اور حکومت دونوں سے شکایت تھی۔ لیکن اس نے اپنے آخری خط میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔“

لیکن گل کرسٹ کے استعفی کے خط کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے کچھ دوسرے امور کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ جو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ انھوں نے استعفا کس وجہ سے بنا کر دیا ہوگا۔ انھوں نے اس وقت تک اپنے حسابات بھی کونسل کو پیش نہیں کیے تھے اور اس کا ذمہ داری انھوں نے جاتے وقت اپنے ایٹا مارکن ٹوش فیلٹن کے سپرد کر دی تھی۔ اور

۱۔ بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہدہ ص ۱۹۵

۲۔ فورٹ ولیم کالج ص ۴۱

۳۔ گل کرسٹ اور اس کا عہدہ ص ۱۹۵

کئی کتابیں ابھی پریس ہی میں تھیں جن کی طباعت کی تاخیر پر انھوں نے اپنے خط میں نہایت افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ”میرے استغنے سے میری ان امیدوں پر پانی پھر جائے گا جو میں نے گورنر جنرل کے قائم کردہ کالج میں رہتے ہوئے ایک طویل عرصے کی ادبی خدمات کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے متعلق قائم کی تھی۔“ مالی مشکلات کا تذکرہ انھوں نے اس خط میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

سال گزشتہ یعنی ۱۸۰۳ء میں چھپائی میں میرے ۲۲ ہزار آٹھ سو روپے

سے زیادہ خرچ ہوئے۔ عجلت سے روانہ ہونے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار

نہ ہونے کی وجہ سے میرا جتنا نقصان ہوا ہے۔ اس کا میں اندازہ نہیں لگا

سکتا۔ اس وقت مجھے بہت کم روپے ملیں گے، اور اگر میں ایک سال اور

یہاں رک جاتا تو شاید میرے سب روپے موصول ہو جاتے۔“

گل کرسٹ کے خط کی یہ تفصیلات یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ انھوں نے خرابی

صحت کے علاوہ کسی اور معقول وجہ سے استعفا دیا ہوگا۔ ”Life and time of carver“

کے مصنف کا بیان اس سلسلے میں کسی حد تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ

”۱۸۰۴ء کے اوائل میں کلکتہ میں یورپیوں اور مسلمانوں کے درمیان

زبردست کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کشیدگی کی وجہ ایک موضوع

بحث تھا جو ہندوستانی زبان کے پروفیسر ڈاکٹر گل کرسٹ نے فورٹ ولیم

کالج کے سالانہ جلسے میں اظہار خیال کی غرض سے ہندوستانی شعبے کے طلبہ

کے سامنے پیش کیا تھا۔۔۔ مباحثے کے لئے گل کرسٹ نے یہ موضوع تجویز

کیا تھا کہ ”اگر ہندوستانی باشندے عیسائی اصولوں کا مقابلہ اپنی مذہب سے

کتابوں سے کریں تو وہ عیسائیت کو قبول کر لیں گے۔“ اس موضوع نے ان

۱۔ وارنٹ، فورٹ ولیم کالج ص ۴۲

۲۔ ایضاً ۴۳

منشیوں کو جو کالج میں ملازم تھے سخت برہم کر دیا اور انھوں نے مسلمانوں میں ایک زبردست تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کے خلاف اظہارِ نفرت شروع کر دی اور لوگوں کو حیرت میں ڈالنے اور ان کے خلاف لوگوں کو مشعل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ بڑی تگ و تازا اور دوادوش سے ایک عرصہ داشت تیار کر کے مشہر کی گئی کہ مباحثے کی کاروائی جیوں ہی مکمل ہو جائے گی مسلمانوں کو زبردستی گورنمنٹ ہاؤس لا کر عیسائی بنا دیا جائے گا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی جو رعایت رکھی تھی اس کی کھلی ہونی خلا و رزی کی تائید میں مسلم دوست انگریزوں نے ایک یادداشت مسلمانوں کے لیے تیار کی جس پر بہت سے لوگوں کے دستخط کرانے گئے۔۔۔ جب یہ یادداشت گورنر جنرل کے رو برو پیش ہوئی تو انھوں نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ مجوزہ موضوع میں کوئی قابل اعتراض رجحان نہیں پایا جاتا، لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ ہندوستانیوں کے جذبات اس سے براہِ نگیختہ ہوتے ہیں، حکم دیا کہ بحث کے اس موضوع کو بدل دیا جائے۔ گورنمنٹ کی اس مداخلت سے گل کرسٹ اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ غصے میں آکر اپنی تقریر پھینک دی اور استعفا دے کر انگلینڈ واپس چلا گیا۔

کالج کونسل نے گل کرسٹ کا استعفا اس کی خدمات اور قابلیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے قبول کر لیا۔

”میرے گل کرسٹ نے جس جوش و خروش، یگانگت و قابلیت اور ان تھک محنت کے ساتھ ہندوستانی زبان کے پرنیسہ کی خدمات انجام دی ہیں،

۱۔ لہذا ۲۰ ستمبر ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے میں اس موضوع کو بالکل آزادانہ طور پر بحث لایا گیا تھا، وہ تھا ”مالک ہند کی زبانوں کی اصل بنیاد سنسکرت ہے۔“

۲۔ Max kumar the life and time of carry Vol. 1, P 191-92

ان کا اعتراف کرنا کالج کو نسل اپنا فرض سمجھتی ہے۔ نیز اس کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ گل کرسٹ کی تصانیف نے اور ہندوستانی زبان کی ان کتابوں نے جو انھوں نے چھاپی ہیں کالج کے قیام کے مقاصد کو بدرجہ اتم پورا کیا ہے۔

گل کرسٹ کے عہد تک فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان میں یا اردو زبان و ادب سے متعلق ناگری خط میں تقریباً ساٹھ کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں سے بعض ان کی روانگی کے وقت تک مکمل ہو چکی تھیں اور بعض زیر تصنیف تھیں یہ کارنامے کالج سے متعلق اور غیر متعلق ۲۶ مصنفین نے انجام دیئے تھے۔ خود گل کرسٹ نے اپنے چار سالہ دور میں تیرہ کتابیں تصنیف کیں، جو اس تعداد کے علاوہ ہیں۔

جیمس موٹ ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر:

(جنوری ۱۸۰۶ء تا فروری ۱۸۰۸ء)

گل کرسٹ کی انگلینڈ مراجعت کے بعد ان کے کام کی ذمہ داری سنیر اسٹنٹ کی حیثیت سے موٹ پر آ پڑی۔ لیکن باضابطہ طور پر وہ یکم جنوری ۱۸۰۶ء سے ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولوی سید محمد، نام سید پور، اور محمد سلیم قریشی کا یہ بیان قابل قبول نہیں کہ گل کرسٹ کی انگلینڈ واپسی کے بعد تھامس روبک کو ہندوستانی شعبے کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ جاوید نہال نے سید محمد کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”سید صاحب کو شاید یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ ۱۸۰۸ء میں تھامس روبک کی جتنی کتابیں دوبارہ

۱۱۵ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۸۶

۱۱۶ فورٹ ولیم کالج ص ۴۰

۱۱۷ کہ اربابہ انشا اللہ ص ۲۰

۱۱۸ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۷۶

۱۱۹ مقدمہ ”سکنٹلا“ ص ۱۳

شائع ہوئی تھیں ان میں روبک کو سابق پروفیسر فورٹ ولیم کالج لکھا گیا تھا جیسے موٹا اور ٹیلر کے بعد وہ (روبا) پروفیسر ہو گئے تھے۔

تعبیبے کہ جاوید نہال نے سید صاحب کی جس غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا ہے بالآخر وہ خود بھی اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سید صاحب کے مطابق روبک گل کرسٹ کے فوراً بعد پروفیسر مقرر ہوئے اور جاوید نہال صاحب کے بیان کے بموجب انہیں جیسے موٹا اور ٹیلر کے بعد پروفیسری کے منصب پر مامور کیا گیا۔ ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سرچشمہ بھی روبک کی دوبارہ شائع شدہ کتابوں کا وہی اندراج ہے جس میں انہیں سابق پروفیسر فورٹ ولیم کالج لکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روبک ہندوستانی شعبے کے پروفیسر کبھی مقرر نہیں ہوئے۔ وہ اس شعبے کے نائب ممتحن، نائب پروفیسر اور کالج کونسل کے نائب سکریٹری ہی رہے اپنی کتاب "Annals of the Ford William College" میں انہوں نے خود اپنی حیثیت اسٹنٹ پروفیسر ہی کی لکھی ہے جس کا اعتراف جاوید نہال نے کیا ہے۔ بقول ان کے "اس تاریخی کتاب میں روبک اپنا عہدہ نائب پروفیسر کا بتایا ہے۔"

کالج میں تبدیلیوں کا دوسرا دور:

گورنمنٹ سکریٹری ٹامس براؤن نے کالج کونسل کو ۱۴ مئی ۱۸۰۵ء کو ایک خط لکھا اس خط کے ساتھ انہوں نے گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی کی جس میں کالج کے انتظام میں کچھ تبدیلیوں کا ذکر تھا، ایک نقل بھی منسلک کی تھی۔ خط میں براؤن نے یکم جون ۱۸۰۵ء سے ان تبدیلیوں کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا تھا جس کے مطابق سسکرت، بنگلہ اور اٹلی کے شعبوں کو باہم ضم کر کے ایک شعبہ بنا دیا گیا تھا اور ہندوستانی شعبے میں صرف سند یافتہ

۱۸۰۵ء میں بنگال کا اردو ادب ص ۷۰-۷۱

۱۸۰۵ء میں بنگال کا اردو ادب ص ۷۰

منشیوں کی تعداد کم کر دی گئی تھی۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء کو کالج کونسل کی میٹنگ میں ہندوستانی اور فارسی شعبے کے ملازمین کی تعداد، ان کی تنخواہ وغیرہ کے متعلق غور و خوض کیا گیا اور یہ طے پایا کہ ہیڈ منشی اور نائب منشی کی تنخواہ بالترتیب دو سو روپیے اور سو روپیے ماہانہ قرار دی جائے۔ دو منشی اسی اسی، دو منشی ساٹھ ساٹھ اور بارہ منشی چالیس چالیس روپیے ماہانہ پر رکھے جائیں۔ تیس روپیے ماہوار لہجے بھی کچھ منشی عارضی طور پر رکھے گئے۔ ان کی تعداد طلبہ کی تعداد پر منحصر تھی۔

ان تجاویز کی اطلاع دونوں شعبوں کو دے دی گئی اور ان سے نشیور کی تفصیل طلب کی گئی۔ موٹے سے ہندوستانی شعبے کی مدرسین اور منشیوں کی جو تفصیل ارسال کی تھی، وہ حسب ذیل ہے۔

نام	مشاہرہ (رکھ روپیہ)	کام کی تفصیل
میر شیر علی میر منشی	۲۰۰	تواریخ الخلاصۃ الہند وغیرہ کا ترجمہ
تاری جرن متر نائب منشی	۲۰	ہندوستانی پریس میں
میر بہادر علی	۸۰	مترجم
مرزا کاظم علی	۸۰	"
مظہر علی خاں	۸۰	"
مرزا فطرت	۸۰	"
میر امن	۸۰	ڈورن
محمد واجد	۸۰	مؤکٹن
مر تفضی خان	۴۰	میک ڈیوگل
یوسف علی	۴۰	سررشتہ دار
مہاندینڈت	۵۰	ناگری خوش نویس
سری لال کوی	۵۰	ہندوستانی پریس، وغیرہ

ان کے علاوہ محمد صادق، میر منصور علی، بشر الدین، خلیل علی خاں، محمد تقی، غلام غوث،

غلام علی، نذر اللہ، محب علی، غلام نقش بند، غلام سبحان، مولوی کمال الدین جو کالج کے باضابطہ ملازم تھے چالیس روپیے ماہانہ پاتے تھے۔ دیوی پرساد اور دوسرے چھبیس سرٹیفکیٹ منشی عارضی تھے۔ ہندوستانی شعبے پر کل خرچ دو ہزار دو سو ساٹھ روپیے ماہوار ہوتے تھے۔ کونسل نے یہ نظم منظور کر لیا۔ البتہ فارسی شعبے کے منشی واپس بلا لیے گئے۔

میرامن کی شبکدوشی:

۳۔ جون ۱۸۰۶ء کی نشست میں کالج کونسل نے ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دینے والے عظیم الیاقرت منشیوں کی تنخواہ کم کرنے کی تجویز کی۔ اسی نشست میں میرامن کو ان کے اہما سے چار مہینے کی پیشگی تنخواہ دے کر کالج کی خدمت سے شبکدوش کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کالج ہیل بری کا قیام اور فورٹ ولیم کالج کا چھوٹا روپ:

۲۰ مئی ۱۸۰۶ء کو کورٹ آف ڈائریکٹرز نے گورنمنٹ سکریٹری کو مطلع کیا کہ ہم انگلینڈ میں ایک عظیم ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگلینڈ کے ایک نواتی علاقے ہارٹ فورڈ سٹریٹ میں اسی سال ہیل بری کالج (Harrow College) قائم کر دیا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جو ملازمین ہندوستان بھیجے جائیں انہیں مشرقی زبان اور ادب کی تعلیم اسی ادارے میں دی جائے۔ جو لوگ یہاں کا حقہ طور پر ہندوستانی زبان کی تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے ان کے لیے ہندوستان میں ایک ادارے کی ضرورت ہوگی اور کلکتہ کالج اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔ اس لیے اس کالج کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اب اس پر زیادہ اعتراضات کی ضرورت نہ رہے۔

لہ وارٹن، فورٹ ولیم کالج ص ۶۹-۶۸

لے نادم سیناپوری کی یہ اطلاع درست نہیں کہ "ہیل بری کالج کا قیام ۱۸۰۵ء میں عمل میں آیا۔"

(فورٹ ولیم کالج اور آرام علی ص ۱۸۱)

۱۱ sharp, selected from Educational Records Pt. 1, P. 30

نہیں۔ بلکہ انعام، کرایہ مکان اور مطبخ وغیرہ جیسی مددوں پر مصارف میں کافی کمی کی جاسکتی ہے۔ ان مددات کے ساتھ کورٹ نے تمام شعبوں کے پروفیسروں، منشیوں اور دیگر ملازمین کی تعداد ان کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات سے متعلق تفصیلات بھی اپنے طرز تیار کر دی تھیں۔

گورنمنٹ سیکریٹری ٹامس براؤن نے ۴ دسمبر ۱۸۰۶ء کو کورٹ کا یہ خط کونسل کو ارسال کیا اور کونسل نے اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کالج کانیارگیویشن اور گیویشن کے ساتھ دوسرا دستور مرتب کر کے ۳۱ جنوری ۱۸۰۷ء کو گورنر جنرل ان کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیج دیا۔

۱۲ فروری ۱۸۰۷ء کو گورنر جنرل نے اس کو اپنی منظوری عطا کر دی۔

گل کرسٹ کی روانگی کے بعد تقریباً دو سال تک کالج محض چند تبدیلیوں کے ساتھ پہلے کی طرح چلتا رہا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کالج ہیل بری کے قیام کے بعد نہ صرف اس کے مقاصد اور نظم و نسق میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ اس کا دائرہ اثر بہت محدود ہو گیا جس کے نتیجے میں اس کی اہمیت و عظمت روز بروز کم ہونی لگی۔

موٹ کا استعفا:

۳ فروری ۱۸۰۸ء کو موٹ نے کالج کونسل کے سیکریٹری ولیم ہنٹر کو ایک خط لکھا، جس میں اس نے خرابی صحت کی بنا پر یورپ کی واپسی کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کسی آمادہ سفر جہاز کی روانگی کی تاریخ سے اپنا استعفا منظور کیے جانے کی درخواست کی تھی۔ گل کرسٹ نے بھی سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے یہی طریقہ کار اپنایا تھا۔ لیکن دونوں کے ترک ملازمت کے حقیقی اسباب و محرکات بالکل مختلف تھے۔ گل کرسٹ کے استعفی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کی تجاویز بار بار مسترد کی گئی تھیں۔ اس کے برخلاف موٹ نے محض تنخواہ کے معاملے کو لے کر استعفا دیا تھا۔ اس نے کالج کونسل کے سیکریٹری کو لکھا تھا کہ

”ہندوستانی زبان کے پروفیسر گل کرسٹ کے فروری ۱۸۰۲ء میں

سبکدوش ہو جانے کے بعد ان کے کام کی تمام تر ذمہ داری سینئر اسٹنٹ

کی حیثیت سے میرے اوپر آ پڑی اور میں یہ کام یکم جنوری ۱۸۰۶ء تک جب

کہ مجھے پروفیسر مقرر کیا گیا، تنخواہ میں کسی اضافے کے بغیر انجام دیتا رہا۔ عربی و فارسی کے پروفیسر جس زمانے میں کام کی وجہ سے باہر گئے ہوئے تھے ان شعبوں کے سینئر اسٹنٹس کو پروفیسر کی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن مجھے اس طرح کی کوئی تنخواہ نہیں ملی، پروفیسر مقرر ہونے پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ میرا پہلے کا مالی نقصان پورا کر دیا جائے گا مگر یہ اضافہ شدہ مشاہرہ مجھے صرف سال بھر ہی مل پایا تھا کہ کورٹ کے حکم سے ہندوستانی پروفیسر کی تنخواہ کم کر کے فرسٹ اسٹنٹ کے برابر کر دی گئی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے سابقہ نقصان کی تلافی ہونا چاہیے۔“

کابج کونسل نے موٹو کا یہ مطالبہ قبول نہیں کیا۔ ۵ فروری ۱۹۸۰ء کو کابج کے سکریٹری نے ان کی خدمات سے متعلق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ یہ خط گورنمنٹ سکریٹری ٹی۔ براؤن کی وساطت سے گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا۔ ٹی براؤن نے اسی روز موٹو کی درخواست منظور کرتے ہوئے اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۰ء کو موٹو نے لیڈی کیسی لری (Lady Cass Leveagh) نامی بہانے کے کپٹن بارکھلیٹ کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ اپنا استدعا کونسل کے سکریٹری ولیم بنٹر کے پاس روانہ کیا، جسے اگور نے ۲۲ فروری ۱۹۸۰ء کو گورنر جنرل ان لوئس تک پہنچا دیا۔

ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر: (فروری ۱۹۸۰ء تا مئی ۱۹۸۲ء)

موٹو کی روانگی کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء کو گورنر جنرل ان کونسل نے ان ولیم ٹیلر کو ہندوستانی شعبے کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ایسٹ انڈیا کابج ہیل بری کے زائے کے بعد کمپنی کے ملازمین کے لیے ہندوستان آنے سے قبل اس کابج میں تعلیم حاصل کرنا ضروری

لے وارٹن فورٹ ولیم کابج میں

۷۸ ایضاً

قرار دے دیا گیا تھا اس لیے فورٹ ولیم کالج میں تکمیل نصاب کی مدت تین سال سے گھٹ کر صرف ایک سال رہ گئی تھی۔ لیکن ہیل بری سے جو مطالبہ آتے تھے وہ ہندوستانی کے مبادیات سے بھی ناواقف ہوتے تھے اور ٹیلر کو انھیں سب کچھ ابتدا سے سکھانا پڑتا تھا۔ چوں کہ محدود وقت کے اندر اس کام کو تنہا انجام دینے میں انھیں سخت دشواریاں پیش آتی تھیں اس لیے چند برسوں کے تجربے کے بعد انھوں نے اپنے شعبے میں ایک اور پروفیسر کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ کالج کونسل نے ٹیلر کی یہ درخواست اپنی سفارش کے ساتھ گورنمنٹ سیکریٹری رک ٹس کے پاس بھیج دی۔ سیکریٹری موصوف کے خط مورخہ ۱۹ نومبر ۱۸۱۳ء کے مطابق یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا، اور لٹننٹ آر۔ مارٹن اسٹنٹ پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ اس سے قبل اکتوبر ۱۸۱۲ء میں کیپٹن ویسٹن کو عربی و فارسی کا اور ولیم پرائس کو سنسکرت، بنگلہ اور ہندوستانی کا افسر اسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا جا چکا تھا۔

اردو ہندی میں تفریق:

جہاں تک کالج کے نظم اور دیگر امور کا تعلق ہے ٹیلر کے عہد پر و فیسری میں کئی اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ لیکن جو سب سے زیادہ قابل مذمت اور افسوس ناک مسئلہ رونما ہوا، وہ اردو اور ہندی کی تفریق تھی۔ اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں گرداننے کی تحریک بھی ٹیلر ہی نے شروع کی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں کالج کی تعلیم کا معیار گرتا ہوا دیکھ کر کالج کونسل نے گورنر جنرل کے ایما سے کالج کے پروفیسر دل اور ممتحنوں سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس پر ٹیلر نے جو جواب دیا تھا وہ ”ہندوستانی“ کے تجربے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے مطالعہ سے ٹیلر کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ

آپ نے کالج کے معیار تعلیم میں انحطاط کی وجہ دریافت کی ہے۔ اس کے متعلق میری گزارش ہے اور میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہندوستانی کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی

یلم حاصل کرنے کے لیے عرب گئے ہوئے تھے اس لیے اے۔ گیلوٹی کو قائم مقام سکریٹری سے
قر کیا گیا۔ اور جب جولائی ۱۸۱۲ء میں ابراہیم لاکٹ عرب سے لوٹے تو گیلوٹی کو نائب سکریٹری
اور ممتحن مقرر کیا گیا، اس سے قبل قائم مقام نائب سکریٹری اور ممتحن مسٹر روبک تھے۔

ہندوستانی شعبے میں اہم تبدیلیاں:

اخراجات میں کمی کے نقطہ نظر سے ۱۸۱۶ء کے شروع میں ایک بار پھر شعبہ ہندوستانی
میں کچھ اہم تبدیلیاں کی گئیں جن سے انیس ہزار چار سو روپے سالانہ کی بچت ہوئی۔ لیکن ڈائرکٹرز
اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے ۲۸ جون ۱۸۲۰ء کو گورنر جنرل کے نام ایک
خط لکھا، جس میں فوجی طلبہ کے داخلے، اسٹنٹ پروفیسروں کے عہدے اور دیگر امور
پر متعدد اعتراضات کیے گئے۔ گورنر جنرل نے اس خط کی روشنی میں امتحانات، تعلیم کی مدت اور
اخراجات وغیرہ کے متعلق کونسل سے اس کی رائے طلب کی۔ کونسل نے اپنی ۲ مارچ ۱۸۲۱ء
کی رپورٹ میں یہ اطلاع دی کہ کونسل اسٹنٹ پروفیسروں کے عہدے ختم کرنے، صرف دو
ممتحن رکھنے، ممتحن کے عہدے کو سکریٹری کے عہدے سے الگ رکھنے، قائم مقام ممتحن کو ہٹانے
اور ہندوستانی مدرسین کی تعداد کم کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن فوجی طلبہ کے متعلق کونسل کے
ارکان مختلف رائے تھے۔ کونسل کی ایک نئی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی اور فارسی میں چھ چھ ہنسی
بنگلہ میں چار مدرس اور ایک ہندوستانی مترجم رکھے جائیں۔ اس طرح تیس ہزار نو سو چوالیس
روپے سالانہ کی بچت کی جاسکے گی۔

گورنمنٹ سکریٹری لاشنگٹن نے ۱۳ مارچ ۱۸۲۱ء کے مراسلے میں کونسل کو مطلع کیا
کہ (۱) گورنر جنرل نے فوجی طلبہ کا داخلہ بند کر دیا ہے لیکن فی الحال جو طلبہ زیر تعلیم ہیں انہیں
اپنا نصاب تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے (۲) اسٹنٹ پروفیسروں کو برطرف
کرنے کے لیے اگلے مہینے کی پہلی تاریخ متعین ہوئی ہے اور (۳) ممتحن کی مجوزہ جگہوں کے لیے

پرائس، لفٹننٹ ڈی رڈیل (Ruddell) اور جمیس الکزینڈر آٹن (Aytton) درخواست دی تھی، گورنر جنرل نے ان میں سے پرائس اور رڈیل کے انتخاب کی منظوری دے دی ہے۔

کالج کے دستور میں تبدیلی؛

کالج کا نظم و نسق کالج کے دستور کے مطابق چلتا تھا۔ اس لیے جب کبھی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی لانی جانی تھی تو اس کے مطابق دستور میں ترمیم یا گزیر ہو جانی تھی۔ چنانچہ اتنی بڑی تبدیلی کے بعد کالج کے دستور میں ایک بار پھر ترمیم کی گئی۔ اس سے قبل جولائی ۱۸۱۴ء میں کالج کا جو تھا دستور نافذ کیا گیا تھا، جس میں کافی کاٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ اس پانچویں دستور میں جو تھے دستور کی قریب قریب سبھی دفعات شامل تھیں صرف مالی انعام کو کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی۔

ٹیلر کی کالج سے سبکدوشی؛

فورٹ ولیم کالج میں آنے سے قبل ٹیلر فوج میں کیپٹن تھے۔ کالج کی ملازمت کے دوران انھیں تنخواہ کے ساتھ ساتھ فوجی بھتہ بھی ملتا رہا۔ ۲۳ مئی ۱۸۲۳ء کو انھیں لفٹنٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اس کے بعد ان کی فوجی ذمہ داریوں میں کافی اضافہ ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر وہ کالج کی پروفیسری سے دست بردار ہو گئے۔

کالج کے زوال کا زمانہ

ولیم پرائس ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر (نومبر ۱۸۲۳ء تا دسمبر ۱۸۲۳ء) تیار کی سبکدوشی کے بعد گورنر جنرل ان کو نسل نے ولیم پرائس کو ہندوستانی شعبے کا پروفیسر

در صدر مقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ اس شعبے کے ممتحن تھے۔ انھوں نے ۲ نومبر ۱۸۲۲ء سے آٹھ سو روپیے ماہانہ مشاہرے پر صدر شعبہ اور پروفیسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ پرائس کی جگہ بحیثیت ممتحن جے۔ ڈبلیو۔ جے۔ آوزلے کا تقرر عمل میں آیا۔ درس اشنا ابراہیم لاکٹ ریزڈنٹ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ دنوں تک آوزلے نے ان کی جگہ پر کام کیا۔ اس کے بعد یکم جون ۱۸۲۲ء کو رڈیل باقاعدہ کالج کونسل کے سکریٹری اور لائبریرین مقرر ہوئے جس کے لیے انھیں آٹھ سو روپیے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔

اور نیل انسٹی ٹیوٹ کا قیام:

فورٹ ولیم کالج کی ہنگامہ خیز زندگی کا دور زیادہ سے زیادہ اس کے قیام سے دو دہائی تک محدود رہا۔ ڈائرکٹر اپنے اختیار و اقتدار سے نت نئے منصوبوں اور تبدیلیوں کو رو بہ عمل لاکر اس کے دائرہ اثر کو محدود سے محدود تر کرتے جا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کالج ہیل بری کے قیام سے جب ان کی مراد برہنہ آئی تو انھوں نے ۱۸۱۸ء میں اور نیل انسٹی ٹیوٹ (ادارہ شرقیہ) کے نام سے ایک ادارہ لیسٹر اسکوائر (Leicester square) انگلینڈ میں قائم کیا۔ اسے شہرت و عظمت بخشنے کے لیے ڈائرکٹروں نے اسی سال گل کرسٹ کے لیے پروفیسری کی ایک جگہ منظور کی۔ گل کرسٹ کمپنی کی مالی پالیسی سے بد دل تھے لیکن انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اس ادارے کے لیے اپنی خدمات وقف کریں۔ ایسٹ انڈیا کالج کی طرح یہ انسٹی ٹیوٹ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہونے والے ملازمین کو مشرقی زبان و ادب کی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اور ان دونوں اداروں کے قیام کا بنیادی مقصد فورٹ

لہ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۱۳

لہ سید محمد ارباب نثر اردو ص ۲۵ اور نادم سیتا پوری، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۱

لہ Qidwai 'Gielchrist and the language of Hindustan' P. 58

ولیم کالج کی اہمیت و افادیت کو کم کر کے اسے ختم کرنے کی راہ ہموار کرنا تھا۔ کالج اگرچہ اس کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح چلتا رہا لیکن اس کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں تقریباً بالکل ختم ہو گئیں، اور وہ علمی سطوت و عظمت جو کسی زمانے میں اس کا طرہ امتیاز تھی، رفتہ رفتہ ایک داستان پارینہ بن گئی۔

اردو ہندی تنازعے کا عروج:

کالج میں اردو ہندی کا مسئلہ سب سے پہلے ٹیلر نے کھڑا کیا تھا جس کا مختصر ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کے بعد کونسل کے سکریٹری رڈیل اور ہندوستانی شعبے کے پروفیسر پرائس نے اسے ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان ہی دونوں کی ریشہ دوانیوں سے تنازعے کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ جس کا سلسلہ کالج کے آخری زمانے تک برقرار رہا اور آج بھی باقی ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۲۲ء کو رڈیل نے گورنمنٹ سکریٹری لاشنگٹن کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ہندوستانی زبانوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ

”ہندوستانی جس شکل میں کالج میں پڑھائی جاتی ہے اور جو اردو، دہلوی زبان، یادلی درباری زبان کے نام سے پکاری جاتی ہے، اسے ہندوستانی کے سربر آوردہ لوگ اور بالخصوص مسلمان بول چال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ اسے مغلوں نے رائج کیا تھا اور عربی فارسی اور دوسری شمال مغربی زبانیں اس کا اصل منبع ہیں۔ اس لیے آج بھی یہ ایک غیر ملکی زبان سے سمجھی جاتی ہے۔“

رڈیل نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اردو کی ضروری تعلیم حاصل کر لینے کے بعد

۱۱۵
۱۱۵ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ۱۱۵
F. 12 11 June, 1822 - 15 December, 1824, P.M. Vol. 9, P. 496

بھی ہندوستان کی کم سے کم تین چوتھائی آبادی اس کے عربی فارسی الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اس زبان کی بہ نسبت سنسکرت سے نکلی ہوئی کسی بھی دسی زبانوں کو جس کا اثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر صوبہ جات میں ہے، فروغ دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد کالج کونسل نے گورنر جنرل سے کمپنی میں بھرتی ہونے والے ملازمین کے لیے فارسی کے علاوہ ہندوستانی کی جگہ پر برج بھاشا کی، جسے ہندی اور ہندوئی کہا جاتا ہے مناسب تعلیم کی سفارش کی اور یہ درخواست کی کہ دستور میں مناصب ترمیم کی جائے تاکہ اس زبان کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو سکے۔ گورنر جنرل نے اس تجویز پر صاف کر دیا۔ چنانچہ کالج کانسالوں دستور مرتب ہوا جسے فوراً گورنر جنرل کی منظوری مل گئی۔

کونسل نے اس ترمیم شدہ دستور کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے پاس روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ولیم پرائس کا ایک طویل خط بھی منسلک تھا، جس میں اس نے ہندو کو اردو پر ترجیح دی تھی۔ اور برج بھاشا، کھڑی بولی، ہندوئی یا ٹھیکٹ ہندی کی جگہ پر صرف ”ہندی“ نام رکھنے کی سفارش کی تھی۔ نیز اپنے نام کے ساتھ ہندوستانی پروفیسر کی جگہ پر ”ہندی پروفیسر“ لکھا تھا، حالانکہ دیگر سرکاری کاغذات میں ہندوستانی پروفیسر ہی لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہندی اور اردو کے اس خود ساختہ تنازعے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ افسر برابر ہوا دیتے رہے۔ جولائی ۱۸۲۵ء میں کالج کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے گورنر جنرل ولیم پٹا اور کالج کے ڈائریکٹر ایم۔ ہرسٹ نے اپنے مشترکہ بیان میں اردو سے متعلق بڑی تعصب آمیز اور اشتعال انگیز باتیں کہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ

”ہندی اور بنگلہ زبانیں اب تک غفلت اور بے اعتنائی کا شکار

ہوتی رہی ہیں۔ ہر سالانہ جلسے کے موقع پر اس کرسی سے ان کی تعلیم کے طرف توجہ مبذول کرائی جاتی تھی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب سنئے دستور کے تحت ان کی تعلیم کالج کے افسر اور اساتذہ کا ہرگز نہیں گئی ہے۔ ہندی کے دائرے میں لفظ کے عام مفہوم کے مطابق وہ بولیاں آتی ہیں جو معمولی

مقامی تبدیلیوں کے ساتھ بنا کر، بہار اور مقبوضہ صوبوں کے اکثر و بیش تر ہندو طبقات میں رائج ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس کی بنا پر میں ان زبانوں کی طرف جنھیں میں اس ملک کی زبانیں کہتا ہوں آپ کی توجہ زور دار طریقے پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

نشیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام کا تقرر؛

اس نئی تبدیلی کے ساتھ کالج کے نشیوں کے لیے ہندی زبان کی تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی، کیوں کہ وہ منشی جو کالج میں ملازم تھے ہندی سے بالکل ناواقف تھے۔ اس کام کے لیے سیتارام پنڈت کا تقرر کیا گیا جنھوں نے کالج کے ۲۶ مستقل اور عارضی نشیوں کو ناگری رسم خط اور مہینہ ہندی کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ بعد میں ان نشیوں کا ہندی میں امتحان بھی ہوا۔

کالج کا برائے نام وجود؛

جس وقت ہندوستان میں کالج کے اعلیٰ عہدہ دار ہندی کی برتری اور بالادستی قائم کرنے میں مصروف و منہمک تھے اس وقت انگلینڈ میں کالج کو ختم کرنے کے منصوبے بنا رہے جا رہے تھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو کورٹ نے کالج کے عہدہ داروں کا تہاد اور اس کے مجموعی اخراجات وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کونسل کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس خط سے ایسا ترشح ہوا تھا کہ ڈائریکٹرز کالج کا وجود برقرار رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن کینی کے ہندوستانی ملازمین یہ نہیں چاہتے تھے کہ کالج تو دیا جائے۔ اس لئے ۲۴ جنوری ۱۸۲۸ء کو قائم مقام گورنمنٹ سکریٹری ای۔ مولونی نے کالج کونسل کو لکھا کہ کالج کا خرچ جہاں تک ممکن ہو کم کر دیا جائے۔ اور ٹی۔ آپ۔ پرنسپل نے کالج کونسل سے دریافت

لے بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۵

کیا کہ کالج میں آپ کس طرح کی تعلیم چاہتے ہیں، انہی طور پر نشیوں کے ذریعے یا ۲۔ سرکاری طور پر۔ اس پر کالج کے سکریٹری رڈیل نے آوزے، پرائس، کیرے، ٹوڈ اور ٹی۔ پرائس کو خط لکھ کر ان کی رائیں دریافت کیں۔ اور ۱۔ اگست ۱۸۲۸ء کو کونسل نے گورنر جنرل ولیم بینگ کو اپنی رپورٹ بھیج دی کہ کالج ایک مفید ادارہ ہے، جسے ختم کرنا کسی بھی حالت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔

اس رپورٹ کے جواب میں گورنمنٹ سکریٹری آج۔ پرنسپل نے کونسل کو مطلع کیا کہ کورٹ ابھی تک کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچا ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی گورنمنٹ کا کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کونسل کے صدر سے کالج کی اصلاح سے متعلق ان کی رائے بھی طلب کی۔ کونسل کے ارکان نے اس سلسلے میں اپنے اپنے مشورے ۲۔ فروری ۱۸۲۹ء تک ان کے پاس بھیج دیے۔ ۲۔ جون ۱۸۲۹ء کو پرنسپل کے توسط سے کونسل کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کا یہ حکم موصول ہوا کہ کالج کو علیٰ حالہ برقرار رکھا جائے۔

کالج میں پروفیسروں اور نشیوں کے عہدے ختم:

۲۳۔ فروری ۱۸۳۰ء کو قائم مقام گورنمنٹ سکریٹری آج۔ ام۔ پارک نے کونسل کے صدر شیکسپیر اور دوسرے اراکین کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ فانی نئس کمیٹی نے فورٹ ولیم کالج اور فونڈیشنٹ جارج کالج میں سرکاری خرچ میں کمی کرنے کی غرض سے کچھ مشورے دیے ہیں، جن کی اہمیت اور موجودہ مالی بحران کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنر جنرل ان کونسل نے سرکاری مفاد کے خیال سے فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں، اسٹنڈنٹ پروفیسروں، نشیوں اور پنڈتوں کے عہدے ختم کرنے اور مستقبل میں صرف ایک سکریٹری اور دو ممتحنوں کی مدد سے موجودہ نظم برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے بموجب یکم جون ۱۸۳۰ء کو پروفیسروں اور نشیوں کے عہدے ختم کر دیے گئے۔ لیکن طلبہ کی مدد اور رہنمائی کے لیے تیس روپے ماہوار پر

۱۔ لیکن اس کے بعد جن نشیوں نے کالج میں کام کیا انہیں چالیس روپے ماہوار سے کم نہیں ملتے تھے۔

کچھ سرٹیفکیٹ نمشی بدستور کام کرتے رہے۔

کالج میں جدید طریقہ تعلیم

اس نئے نظم و نسق کے مطابق طلبہ کو مہینے میں دو بار اپنے اپنے ممتحن کے یہاں جا کر نوشتہ و خواندگی کی مشق کرنا ہوتی تھی اور ممتحن وہیں ان کی لکھی ہوئی مشقوں کے غلطیاں درست کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مقررہ امتحانات کی رپورٹ بھی ممتحن ہی کو بھیجا پڑتی تھی۔ رڈیل کی ان تھک کوششوں سے اس طریقہ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ لیکن چونکہ ڈائرکٹرز فورٹ ولیم کالج کے وجود ہی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بہ حیثیت مجموعی ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پروفیسروں اور نشیوں کو پنشن:

کونسل نے گورنمنٹ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جن پروفیسروں اور نشیوں نے خاصی طویل مدت تک کالج کی خدمت کی ہے ان کی پنشن مقرر ہونا چاہیے۔ چنانچہ سبکدوش ملازمین کے لیے پنشن کی مجوزہ رقوم، ان کے حیلے اور دوسری متعلقہ تفصیلات ضابطہ تحریر میں لائی گئیں۔ ہندوستانی شعبے کے جن لوگوں کو پنشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا، ان کے نام اور دیگر تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔ تارنی چرن متر، سو روپے پنشن، عمر اٹھاون سال، پستہ تہ، دور کا چیز نہیں دیکھ سکتے، کچھ جھک کر چلتے ہیں، اوپر کے ہونٹ پر ایک تل بن۔
- ۲۔ میر بخش علی۔ پچاس روپے پنشن، عمر اڑتالیس سال، اوسط قد، رنگ کچھ گورا، دائیں گال پر چیچکا کا ایک داغ۔
- ۳۔ مرتضیٰ خاں۔ چالیس روپے پنشن، عمر ۴۵ برس، دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے، رنگ

کچھ گورا، موٹی اور توٹی آواز، لمبے اور لچیم شجم۔

پرائس اور رڈیل کی کالج سے کنارہ کشی:

کالج کے نئے طریقہ تعلیم سے نہ صرف ہندوستانی منشی ہی ناراض تھے بلکہ بعض انگریز بھی چسپن جبیں تھے۔ چنانچہ پرائس نے ۲۱ دسمبر ۱۸۲۱ء کو کالج کی خدمات سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اس کے چھوٹی دنوں بعد ۱۱ جنوری ۱۸۲۲ء کو رڈیل بھی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر یورپ چلے گئے۔

کالج کا خاتمہ

گذشتہ اوراق میں پیش کردہ تفصیلات سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ گل کرسٹ اور ولزلی کی انگریز مرابست اور ہیل بری کالج کے قیام (۱۸۰۶ء) کے بعد سے فورت ولیم کالج برابر روبہ زوال رہا۔ اس کے باوصف تقریباً بیس سال تک اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا وقار قائم رکھا۔ لیکن ۱۸۱۶ء میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ لیسٹرا اسکوائر کے قیام اور پھر ۱۸۲۱ء میں پروفیسروں اور منشیوں کے بدمعہ ختم کر کے ڈائریکٹروں نے اس کے ساتھ پیر ہی کاٹ دیے جس کے نتیجے میں کالج اس مرع نیم بسمل کی طرح جس کے شہ پر نوچ دیے گئے ہوں سے زندگی کی آخری سانس پوری کرنے لگا تھا۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۲ء تک اس پر نزع و جاں گنی کی یہی کیفیت طاری رہی۔ بالآخر گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کے ترکش کے شر تیرنے اس کا وجود ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اس نے ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۲ء کو اپنی یادداشت میں کہا تھا۔

”کالج کا موجودہ نظام محض ایک کرو فریب اور استہزا کے سوا کچھ نہیں

اس سے کسی مقصد کی تکمیل کی بجائے انوائس پھیلنے کا خدشہ ہے۔ درحقیقت اس وقت کوئی کالج نہیں ہے پہلے کی طرح طلبہ کے لیے کمرے نہیں ہیں، کوئی پروفیسر نہیں، کوئی پروفیسر نہیں اور نہ کوئی لیکچرر ہے۔ کچھ منشی اور پندت شرویں، گورنمنٹ انجینئرز تنخواہ دیتی ہے لیکن ان سے کوئی کام نہیں لیتا۔ کالج کا وجود نہ ہونے پر بھی کالج کا ایک سکریٹری ہے۔ بڈیوں کے اس زندہ ڈھانچے سے کسی قسم کا فائدہ ممکن نہیں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

لہذا میں فورٹ ولیم کالج کا نام مکمل طور پر اور فوراً مٹا دینا چاہتا ہوں۔ اس کی جگہ میرا خیال ایک دوسرا ادارہ قائم کرنے کا ہے۔ سرکاری ملازمت ملنے سے پہلے ہر نوجوان سول ملازم کو ضروری امتحان پاس کرنے کے لیے جس کی مدد کی ضرورت ہوگی اس کے لیے یہ ادارہ فعال اور مفید ہوگا۔

۱۹ نومبر ۱۸۵۲ کو کالج سے متعلق یہ تمام مسائل بندوستانی گورنمنٹ کے ہوم ڈپارٹمنٹ کی سپریم کونسل کے اجلاس میں پیش ہوئے۔ ڈلہوزی بھی بہ حیثیت گورنر جنرل اس اجلاس میں موجود تھا۔ اس نے دوران بحث صرف اتنا کہا کہ میں نے اپنی یادداشت میں جو کچھ کہہ دیا ہے اس کے علاوہ اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے معاونین مجھ سے متفق ہوں گے۔ اسی روز آرمیل ہے۔ اے ڈورین اور جے۔ لوٹ ڈلہوزی کی رائے

۱۰ اگست ۱۸۵۰ کو بنگال کے سکریٹری جے۔ بی۔ گرانٹ نے کالج سے متعلق ایک نوٹ لکھا جس میں اس نے کالج کے وجود کو بے کار محض بتایا تھا۔ گورنمنٹ سکریٹری جے۔ بی۔ ڈی۔ نے بھی ۲۱ اگست ۱۸۵۰ کو اپنے نوٹ میں کالج کی اصلاح سے متعلق متوجہ پیلو بتانے سے

Home Department, Government of India. O. C. No. 8, P. 180-82

حوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۵۵

سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کیے۔ لارڈ ڈلہوزی نے سمجھ لیا تھا کہ کالج ختم کرنے میں اب کسی قسم کی مخالفت نہیں ہوگی۔ لہذا ۲۴ جنوری ۱۸۵۴ء کو اس نے باقاعدہ کالج توڑنے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ حکم نامہ صرف ایک جملہ پر مشتمل تھا۔

"The College of Fort William is abolished."

اس کے معا بعد ایک نئے ادارے "بورڈ آف انزائمینٹس" (Board of Examinations) کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ڈلہوزی نے پہلے ہی اس نئے ادارے کے دستور اور دیگر امور سے متعلق اعلیٰ افسروں سے تبادلہ خیال کر لیا تھا۔ بنگال سکریٹری بیدن اور گورنمنٹ سکریٹری بلاؤڈن نے بھی اس سلسلے میں اسے کچھ مشورے دیے تھے۔

اس ادارے کا مقصد بنگال پریسیڈنسی کے نووارد سول ملازمین کا دیسی زبان سے متعلق امتحان لینا تھا۔ اس کے امتحانات ۱۸۵۸ء تک فورٹ ولیم کالج کے نصاب اور طریقے پر ہوتے رہے۔ اسی بنا پر ال او موے کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ فورٹ ولیم کالج ۱۸۵۸ء تک قائم رہا۔ ال او موے کی تصنیف "The History of Bengal" سے جاوید نہال نے بھی فورٹ ولیم کالج کی مدت حیات ۵۸ سال قرار دی ہے۔ محمد عتیق صدیقی کی تحریر کے مطابق کالج ۵۵ (پچپن) سال تک قائم رہا۔ اور سید محمد اور محمد زبیر کے مطابق اس نے ۵۷ سال تک کام کیا۔ فی الواقع کالج کی مجموعی عمر ۵۳ سال ۶ ماہ اور چودہ دن سے زیادہ نہ رہی۔

Khawaja Ahmad Farugi, "Foreword" *Urdu and the Language of Hindoostan*. P. VII

F.W., 24 January 1854, Public Proceeding, M.D. January 1854, Letter No 308 O.C. No 14, P. 24

بہ حوالہ فورٹ ولیم کالج ۱۵۸

سے بنگال کا اردو ادب ص ۵۶۔ لیکن نشان راہ "عنوان کے تحت اسی کتاب میں فورٹ

ولیم کالج کی زندگی ۵۴ سال تسلیم کرتے ہیں (بنگال کا اردو ادب ص ۵)

۱۸۱۱ء گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۸۱

۵۷ ارباب نشر اردو ص ۱۵۶ اور اردو نثر کا تاریخی سفر ص ۱۳

فورٹ ولیم کالج

ممالہ و ما علیہ

یہ بات اب متحقق طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ کمپنی کے ارباب بست و کشاد نے فورٹ ولیم کالج محض اس غرض سے قائم کیا تھا کہ کمپنی کے نووارد سبوں اور فوجی ملازمین دسی زبانوں کی تعلیم حاصل کر سکیں، تاکہ وہ ہندوستان میں جہاں بھی تعینات کیے جائیں وہاں انھیں مقامی باشندوں سے تعلقات استوار کر کے بہتر نظم و نسق قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج محض سیاسی مصالح کے پیش نظر معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کے قیام کو اگرچہ بنیاد ہندوستانی زبانوں کے سرپرستی کے اقدام سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن در پردہ اس کے توسط سے انقلاب فرانس کے اثرات کو زائل کرنا مقصود تھا۔

لیکن تمام برے ارادے ہمیشہ برے نتائج ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات ان سے اتنے خوش گوار نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ بداندیش اپنے لیے پر خود پشیمیاں اور مبہوت ہو جاتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج جن ارادوں کے تحت قائم کیا گیا تھا وہ یقیناً ہمارے قومی وقار اور تمناؤں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن حسن اتفاق سے کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے جو ہماری زبان اور ادب کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئے اور جو کالج کے موصوفین کو بہتر مطلوب نہ تھے۔ علمی و ادبی اور ثقافتی و سیاسی رجحان کی لہریں جب ایک بار حرکت میں آ جاتی ہیں تو وہ محض اسی سمت میں سفر نہیں کرتیں جو ان کے محرک متعین کر چلے ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ اپنی مخالف لہریں خود بہ خود پیدا کر لیتی ہیں۔

جس طرح کسی مطلق العنان، جابر و ظالم بادشاہ کے دور حکومت میں صرف ظلم و تعدی اور بد اخلاقی ہی پروان نہیں چڑھتی بلکہ کبھی کبھی اس طوفان میں شریفانہ جذبات و احساسات اور منصفانہ خیالات و نظریات بھی پرورش پاتے رہتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ اور مختلف النوع سازشوں کے پہلو بہ پہلو انسان دوستی اور بے نفسی و بے تعصبی جیسی اعلیٰ قدریں بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں، اسی طرح برطانوی فوج کے ساتھ جس نے پورے برصغیر کو یا مال کر دیا تھا، کچھ ایسے افراد بھی ہندوستان آگئے تھے جو نہایت دور اندیش و علم دوست اور زبان و ادب کی جولاں گاہ میں انفرادی شہرت کے متمنی تھے۔ اس زمرے میں وہ مستشرقین سرفہرست ہیں جن کی علمی تشنگی اور ذوق تحقیق و تجسس نے انھیں ہندوستانی السنہ و ادبیات کے مختلف میدانوں میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کاموں میں انھوں نے مختلف النوع دشواریوں کا مقابلہ کیا، نقصانات برداشت کیے اور بہ حیثیت مجموعی علم دوستی اور ادب شناسی کا ایک اعلیٰ معیار اور درخشندہ روایات قائم کر کے خود ہمیں ہماری ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ اٹھارہویں صدی عیسوی ہی سے شروع ہو چکی تھیں، لیکن ان کی حیثیت محض انفرادی تھی اور ان میں اجتماعیت کی وہ روح اور وہ ارتباط و اتحاد موجود نہ تھا جو اس قسم کے کاموں کے لیے اشد ضروری ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کوششوں نے ایک باقاعدہ اور منظم تحریک کی شکل اختیار کی جس کے نہایت خوش آئند نتائج برآمد ہوئے اور کالج کے اندر اور باہر ہندوستانی زبان و ادب کو برگ و بار لانے اور ترقی کی نئی شاہراہوں پر گامزن ہونے کا موقع مل گیا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک اردو شاعری نے ترقی کے اعلامیہ راج طے کر لیے تھے لیکن اردو نثر گہوارہ طفلی سے باہر نہیں نکل پائی تھی اور اس کا بڑی سبب یہ تھا کہ امراد شہ نیا اور علماء و فضلا اپنی تحریر و تقریر میں فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے استعمال کو کسر شان تصور کرتے تھے۔ ذریعہ تعلیم بھی یہی زبان تھی اور سرکار و دربار میں بھی اسی کا سکہ چلتا تھا، علاوہ بریں مذہبی مواعظ اور علمی مباحث میں بھی فارسی ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ روزمرہ کے معمولات میں اس کا استعمال نہ صرف خط و کتابت کے لیے ناگزیر تھا بلکہ

حساب کتاب اور بھی کھاتے بھی بالعموم اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر فارسی کی حکمرانی تھی۔ اسی وجہ سے شعرائے اردو کے بیش تر تذکرے بھی اسی زبان میں قلم بند کیے گئے۔ رواج عام کے برخلاف جن لوگوں نے اس زمانے میں اردو میں لکھنے کے کچھ کوشش بھی کی تو روایات سے مجبور ہو کر نہایت بر تکلف اور فارسی آمیز اسلوب اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، اور یہ ایک بالکل فطری امر تھا۔ چنانچہ محمد حسین عطا خاں تھیں نے جو باقاعدہ اردو شکرگاری کے مدعی ہیں بالکل مصنوعی نثر کا ایک عجیب نمونہ پیش کیا ہے۔ اس سے قبل فضل نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا تھا اور ان کی نثر کی بھی یہی کیفیت ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر کی جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں وہ بہ استثنائے چند بالعموم مذہبیات سے متعلق ہیں۔ یہ کتابیں کم پڑھے لکھے لوگوں کو مذہبی معلومات بہم پہنچانے اور تصوف کے رموز و نکات سمجھانے کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عربی سے اسی کے ادق الفاظ سے گراں بار نظر آتی ہیں۔ ان میں صرف عربی فارسی مشکل الفاظ ہی استعمال نہیں کیے گئے ہیں بلکہ بہ حد امکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ جملے قافیہ بند، مرجز اور جمع ہوں۔ فارسی کے اتباع اور مشکل پسندی کی اس روایت نے اردو نثر کو عوام سے دوسوں دور رکھا اور وہ اردو نظم کے شانہ بہ شانہ کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر پائی۔

فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اردو زبان کی پوشیدہ فنی صلاحیتوں کو نمود کے مواقع فراہم کیے اور اردو نثر کا ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو کے مضمین کے لئے چراغ راہ ثابت ہوا۔ یہ تحریک ہندوستان کی سب سے پہلی شعوری اجتماعی، ادبی و لسانی تحریک تھی جس نے اردو نثر کی رفتار ترقی کے لئے مہمیز کا کام کیا اور وہ قوت و توانائی عطا کر دی کہ نصف صدی کی مختصر مدت میں اردو زبان کے ادبی و فنی مضامین و مباحث کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ کالج کی اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا جو کام شروع ہوا، اس کے لئے بطور خاص مشاہیر علم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کے علاوہ بہترین تصنیفات پر انعام کا اعلان کر کے سے غیر متعلق مضمین کو بھی ان کوششوں میں عملی شرکت کی طرف راغب کیا گیا۔ نتیجے کے طور

پر متعدد ادبی شاہکار وجود میں آئے اور رفتہ رفتہ کالج کے اندر اور باہر ایک ایسی فضا تیار ہو گئی جس نے آئندہ ترقی کے تمام امکانات روشن کر دیے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر فورٹ اولیم کالج قائم نہ ہوا ہوتا تب بھی اردو نثر کا جو ہولنا بعد میں تیار ہوا اس میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ عبداللہ یوسف علی کا یہ قول کہ ”فورٹ اولیم کالج نے اردو نثر کی آئندہ ترقی کے لیے کوئی موثر کوشش نہیں کی۔“ اسی قسم کے غیر حقیقت پسندانہ بیانات کے ضمن میں آتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ شاہد ہے کہ کالج کے قیام سے قبل اردو نثر اپنی صحیح سمت کے عرفان سے یکسر محروم تھی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا یہ زیادہ سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اگر کالج کے موسسین و مصنفین نے اس کا رخ تبدیل نہ کیا ہوتا تو اسے وہ توانائی ہرگز نصیب نہ ہوتی جس کی بدولت اسے نصف صدی سے بھی کم کی مدت میں ایک امتیاز سے حیثیت اور علمی وقار حاصل ہو گیا۔

فورٹ اولیم کالج اردو نثر کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اردو زبان و ادب کو عوام سے قریب تر کر دیا۔ کیونکہ اسی کی بدولت جس اسلوب نگارش کو فروغ حاصل ہوا، اس کی بنیاد عربی و فارسی کے ادق الفاظ کے بجائے ہندوستانی عوام کے روزمرہ اور محاورے پر استوار ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کے جو دور رس نتائج برآمد ہوئے ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ زبان جو علمی حلقوں میں انتہائی پس ماندہ و کم مایہ سمجھی جاتی تھی صرف تیس پینس برس کی قلیل مدت میں فارسی کو مسند اقتدار سے ہٹا کر اس کی جانشین بن گئی اور کاروباری زندگی میں شریک دنیا کی دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔ بعض حضرات کا یہ خیال کہ فورٹ اولیم کالج میں صرف قصوں اور کہانیوں کی کتابیں لکھی گئیں جنہیں بامقصد اور مفید لٹریچر میں شامل نہیں کیا جاسکتا، حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ کالج کی زندگی میں کالج کے اندر اور باہر تقریباً

لے ملاحظہ ہو ”انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ“

ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں قواعد و لغات اور قصص و داستانوں اور انتخابات و دوا دین کے علاوہ تاریخ، تذکرہ اور اخلاق و معاشرت کے موضوعات سے متعلق کتابوں کی خاصی تعداد شامل ہے۔

کالج کا دوسرا اہم کارنامہ ہندوستانی زبانوں کو مشینی دور میں داخل کرنا ہے۔ ہندوستان کی ادبی فضا پر جن چیزوں کا براہ راست اثر ہوا ان میں اُردو چھاپے خانوں کی قیام اور ان کا استعمال غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ چھاپے خانے کے وجود میں آنے سے قبل کتابیں پیشہ ور کتابوں سے نقل کرائی جاتی تھیں اور حسب ضرورت نقل درنقل کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اس سے ایک طرف تو طلبہ اور عام شائقین علم کو کتابوں کے حصول میں کافی دقت پیش آتی تھی اور کسی خاص کتاب کی نقل حاصل کرنے میں وقت اور روپیہ دونوں کی قربانی دینا پڑتی تھی۔ دوسرے کتابوں کی کم سوادگی اور پیشہ ورانہ عجلت اور سہل پسندی کی وجہ سے ان کا متن اکثر ناقابل اعتبار ہوتا تھا۔ چھاپے خانے کی ایجاد اور رواج مانا سے یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا۔ اس پیش رفت سے ضمناً ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صحافت کے فروغ کی راہ کھل گئی جو عوام سے زیادہ سے زیادہ روابط استوار کر کے اصلاحی تحریکات اور ترقی پسندانہ خیالات کو عام کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔

یورپی مفکرین کو مشرقی علوم اور تہذیبی اقدار کی افادیت و اہمیت کا احساس دلانے میں بھی فورٹ ولیم کالج نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مشرقی ادب اور فلسفہ کی کتابوں کے تراجم نے انگریزوں کے احساس کو تیز سے تیز کر دیا کہ علم کے مشرقی سرچشموں کو ٹھیک طور پر سمجھا جائے اور غیر متعصبانہ طور پر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ اس لیے عربی، فارسی اور سنسکرت کی بعض کتابیں انگریزی میں ترجمہ کی گئیں، تاکہ ان کی وساطت سے یورپی مفکرین مشرقی ادب، فلسفہ اور تہذیب سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ ۱۸۱۳ء میں اس کا بیج مشرقی علوم و فنون کے مطالعہ کی روز افزوں ترقی کی رپورٹ دیتے ہوئے لارڈ منٹون نے دوسری کتابوں کی اشاعت کے علاوہ ”میگہ دوت“ کے انگریزی ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے جو اپج۔ اپج۔ ولسن نے کیا تھا۔ سنسکرت کے اس لافانی شاہکار کے انگریزی ترجمے

نے لارڈ منٹو پر یہ واضح کر دیا کہ ہندوستانی قوم کا معیار فکر کس قدر بلند، ادبی مذاق کس قدر شستہ و شایستہ، نظر کتنی وسیع اور کردار کتنا رفیع و اعلا ہے۔ کالی داس ارض وطن سے بے پناہ خبت رکھنے اور فکری طور پر خالص ہندوستانی ہونے کے باوجود ساری دنیا کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ اس سے قبل اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سر ولیم جونس نے کالی داس کی شکنتلا کے انگریزی ترجمے سے علمی و ادبی دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ سنسکرت زبان یونانی سے زیادہ مکمل اور لیٹن سے زیادہ وسیع ہے اور ان دونوں زبانوں سے بلا کسی استثنا زیادہ فصیح بھی ہے۔

اس طرح یورپی فاتحین پر یہ حقیقت کسی حد تک آشکارا ہو گئی کہ ہم نے کسی ایسے ملک پر قبضہ نہیں کیا ہے، جس میں غیر مہذب لوگ بستے ہیں بلکہ ہمارا سابقہ ایک ایسی قوم اور ملک ہے جہاں جو نہایت مہذب و تمدن اور کئی اعتبار سے ہم سے بہتر اور اس کے بعض علاقے تہذیب و تمدن کے اعتبار سے معراج پر پہنچ چکے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے، طلبہ کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا خاص اہتمام ہے۔ کالج کے ذمہ دار اس پہلو کو جتنی اہمیت دیتے تھے۔ اس کا ذکر اجمالاً گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ کالج کے پہلے چار برسوں کی کارکردگی کی رپورٹ میں طلبہ کے اندر بد اخلاقی کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ اس دوران بعض طالب علموں کا کالج سے اخراج ضرور ہوا۔ لیکن ان کے خلاف یہ کارروائی کسی بد اخلاقی کی پاداش میں نہیں بلکہ مطالعہ میں عدم دل چسپی کی بنا پر کی گئی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں سے نگرانی کی انتہائی سختی کا اعتراف کرتے ہوئے اس رپورٹ میں کالج کی قائم کی ہوئی کچھ ایسی مثالیں پر اظہارِ فخر کیا گیا ہے۔ جیسے دن میں سولہ گھنٹے کی پڑھائی اور اس کے بعد کشتی رانی (Swimming) کی مشق، تاکہ صحت بحال رہے۔ رپورٹ کے مطابق

College of Fort William in Bengal P. 164
 Gilchrist and the Language of Hindustan P. 24

ان چار سالوں میں کوئی باہمی تصادم نہیں ہوا جبکہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں اکثر ہوتا ہے۔
 اُردو کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری جدید زبانیں خاص طور سے ہندی
 اور بنگلہ کی توسیع و ترقی میں بھی کالج نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل
 کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی نازک دور سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن کالج کی سرپرستی
 میں ہندوستان کی جدید زبانیں اس پر آشوب دور میں خوب پھولیں پھلیں اور پردان چڑھیں۔
 چنانچہ پریارنج سین نے بنگلہ زبان و ادب کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے احسانات کا واضح طور
 پر اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح کھڑی بولی ہندی کی ترویج و ترقی کے باب میں آچاریہ رام چندر
 شکل، شاردا دیوی ویدلانکر اور لکشمی ساگر وارشنے ارباب کالج کے ممنون مشکور نظر آتے
 ہیں۔

اُردو نثر کی ترقی کے پہلو بہ پہلو بنگال اور خاص طور پر کلکتہ میں اردو شاعری کا مذاق
 عام کرنے میں کالج نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہر سال غالباً ۲۵ جولائی کو کالج میں نہایت
 اہتمام کے ساتھ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں نہ صرف کالج کے ملازم شعرا اپنا کلام پیش کرتے
 بلکہ شہر کے دیگر شعرا بھی اپنے اشعار سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ ان مشاعروں کے
 بدولت طلبہ اور حاضرین محفل میں اشعار کے سن و قبح کی پرکھ اور روزمرہ و محاوروں کے
 معنی کا شعور بیدار ہوا، جس کے خوشگوار نتائج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رائے بنی ناراین
 دہلوی نے ”دیوان جہاں“ کے آخر میں غالباً اس سلسلے کے ایک مشاعرے کی طرحی عزلیں
 نقل کی ہیں۔ یہ مشاعرہ ۲۵ جولائی ۱۸۱۲ء کو منعقد ہوا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کی سالانہ تقریبات کلکتہ کی تہذیبی زندگی میں خاص اہمیت کی حامل
 ہوا کرتی تھیں۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں، ممتاز علماء فضلہ اور ہندوستانی یورپی شہریوں کے
 سامنے گورنر جنرل کا خطاب اور کالج کے طلبہ کی تقریریں جن کی زبان خالص اُردو ہوتی تھی
 پورے سال تک شہر کے ذہنوں پر اپنی تاثیر باقی رکھتی تھیں۔ ان جلسوں میں کلکتہ کے
 ممتاز شہری اور یورپی دانش ور اپنے بہترین لباس میں رونق افروز ہوتے تھے۔
 اُردو زبان و ادب کی ان گراں قدر اور ناقابل فراموش خدمات کے پہلو بہ پہلو

فورٹ ولیم کالج سے کچھ ایسے لسانی تازوں کی بھی ابتدا ہوئی جنہوں نے اردو کے عوام سے کردار پر ناخوش گوار اثرات مرتب کیے اور اس کی مقبولیت و ہر دل عزیز کی نقصان پہنچایا۔ ان اختلافات کی بنیاد اردو اور ہندی کی تفریق کی وہ سوچی سمجھی سازش تھی جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس سازش کے تحت جس تعصب کو ہوا دی گئی اور جو شہرائیگریز بیانات جاری کیے گئے وہ آج بھی مخالفین اردو کے لیے سرچشمہ قیضا اور سامان تقویت بنے ہوئے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات

ابھی تک کسی نے فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کی فہرست مرتب نہیں کی ہے اور نہ تو صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ کالج کے زیر اہتمام کتنی کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں لاکٹ نے ۹ مارچ ۱۸۱۳ء کو کتابوں کی جو تفصیل کالج کونسل کو بھیجی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک نو اسی کتابیں طبع ہو چکی تھیں اور ان کی طباعت پر ۱-۶-۲۶۴۱۰۶ دو لاکھ چوٹھ ہزار ایک سو چھ روپیہ، چھ آنہ اور ایک پائی یا ایک پیسہ خرچ ہوا تھا۔ راقم السطور نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۲۷ ہے، جن میں مطبوعہ (۹۴) اور غیر مطبوعہ (۵۳) کتابیں شامل ہیں۔ لیکن اس فہرست کے بھی مکمل ہونے کا دعوا نہیں کیا جاسکتا۔

فہرست نمبر ۱

مطبوعہ :-

نمبر	نام کتاب	مولف	سال اشاعت	رہم خط	کیفیت
۱	مسکین کے مرثیے	میر جعفر	۱۸۰۱ء	ناگری	یہ عبداللہ مسکین کے مرثیے کا اردو ترجمہ ہے
۲	ہندی مشقیں (Hindie Exercises)	گل کرسٹ	۱۸۰۲ء	اردو، ناگری، رومن	یہ کالج کے نصاب کے لیے تیار کیا گیا ہے
۳	باغ اردو	شیر علی افسوس	"	اردو	
۴	The Strangers East India Guide to the Hindoostanee	گل کرسٹ	"	رومن	اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں بھی شائع ہوا۔

ان کتابوں میں مراٹھی اور اڑیا زبانوں سے متعلق بھی کتابیں شامل تھیں

بجوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۲۰

Hindoostanee Principles ۵
گُل کرست ۶۱۸۰۲ رومن

(مبادیات ہندوستانی)

Practical Outlines ۶

رومن اس کی ترتیب میں تاریخی چرن بھی
شامل تھے

(ہندوستانی علم الہجاء کا نام)

Hindee Manual Vol. ۷ ۷
اردو، اگر یہ کتاب متعدد نمشوں کے تعاون سے

رومن ترتیب دی گئی تھی۔ اس میں باغ و بہار

شکستلا، مرثیہ مسکین، مادھونل کام

(ریاض ہندی)

کندلا، باغ اردو وغیرہ کے اقتباسات

شامل ہیں۔

Hindee Arabie

رومن اردو یہ ۶۱۸۰۳ میں دوبارہ شائع ہوئی تھی۔

Mirror ۸

اردو گُل کرست کی قواعد کا خلاصہ

رسالہ گُل کرست بہادر علی حسینی ۹

The Hindee Story ۱۰
۶۱۸۰۲ رومن اس کا دیباچہ اور اختتامیہ گُل کرست

اردو ناگری نے انگریزی میں لکھا ہے۔
Jeller Vol. 1 متعدد نمشی

(تقلیاتیانقلیات ہندی)

ناگری یہ ۶۱۸۰۳ میں اردو رسم الخط میں بھی شائع ہوئی۔

اخلاق ہندی بہادر علی حسینی ۱۱

اردو

رسالہ کائنات، جو خلیل علی خاں ۱۲

ناگری ۶۱۸۰۴ میں اسے اردو رسم خط میں بھی طبع کیا گیا۔

توتا کہانی جیدر بخش ۱۳

اردو سعودی کی "پندنامہ" کا منظوم ترجمہ

ترجمہ پندنامہ منظوم مظہر علی خاں ۱۴

The Hindee Story ۱۵
بہادر علی حسینی اور

Jeller Vol. II متعدد نمشی

(تقلیاتیانقلیات ہندی)

اس کا دوسرا نام "A Sketch of Hindoostanee Orthography in the Roman Character" ہے۔

- ۱۷ نثر بے نظیر بہادر علی حسینی ۶۱۸۰۳ اردو اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔
- ۱۷ The Oriental Fabulist متعدد منشی " رومن یہ آرنی چرن کے نام سے منسوخ جاتی ہے۔
- (نظریات لقمائی)
- ۱۸ گلدستہ حیدری حیدر بخش حیدری " اردو سن ترتیب ۱۹۸۰ء۔ اس میں "گلشن ہند" بھی شامل ہے۔
- ۱۹ The Hindu Moral Preceptor گل کریشٹ " رومن اردو یہ سعدی کی پسند نامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔ گلیڈون کا کیا ہوا پسند نامہ کا انگریزی تشریحی ترجمہ اور دولا کا منظوم اردو ترجمہ بھی اس میں شامل ہے۔
- The Oriental Linguist " " رومن (مشرقی زبان دان)
- The Anti Jargonist " " " " ۶۱۸۰۰ میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔
- ۲۲ باغ و بہار میرامن " اردو اس کے دوسرے ایڈیشنز معروف لکھنؤ سے ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے تھے۔
- ۲۳ قصہ فیروز شاہ شیخ محمد بخش " اردو
- ۲۴ قصہ دل آرم و دل بار تو تارام " اردو

۱۔ باغ و بہار کے بارے میں شانتی رجن بھٹا چاریہ لکھتے ہیں کہ "یہ ۱۹۶۲ء میں ہاکر سے شائع ہوئی... کلکتہ کے کسی کتب خانے میں اس ایڈیشن کی کوکاپی مجھے نہیں ملی۔ اس ایڈیشن کی ایک جلد ڈاک کے مطابق پرنس میوزیم لائبریری لندن میں ہے۔ (تذکرہ تصانیف بنگالہ، ۶۸، غیر مطبوعہ) لیکن حیرتی تحقیق کے مطابق یہ مکمل طور پر ۱۹۶۳ء ہی میں طبع ہوئی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں اس کے کچھ جتنے ضرور طبع ہوئے، انہیں بیاض ہندی میں شامل کئے گئے۔

- ۲۵ چندراوتی سدس ۶۱۸۰۲ ناگری
- ۲۶ حسن اختلاط میرجو القاسم اردو
- ۲۷ کلا کام کنزن لعل اردو اس کتاب مصنف کو سو روپیے بطور انعام ملے تھے۔
- ۲۸ خوان نعمت سید حمید الدین بہاری
- یہ ”خوان الوان“ (فارسی) کا ترجمہ ہے، جو بیس خوانوں پر مشتمل ہے۔ کالج کی کاروائیوں میں اس کا نام ”خوان الوان“ ہی لکھا گیا ہے۔
- ۲۹ بحری و طبی ہندستانی لغت تھاکس روبک رومن اردو
- ۳۰ سری بھاگوت لولال کوی ناگری یہ پریم ساگر کا نامکمل ایڈیشن ہے۔
- ۳۱ ہندستانی کہاوتیں ولیم ہنٹر اردو
- ۳۲ ہندستانی میں مستعمل - - - - - اردو
- ۳۳ عربی فارسی الفاظ کا انتخاب
- ۳۳ داستان امیر حمزہ خلیل علی شاہ اردو
- ۳۴ حکایات متفرقات - - - - - نامعلوم
- ۳۵ مثنوی (میر حسن) میر حسن اردو یہ ۶۱۸۰۵ میں دوبارہ شائع ہوئی۔
- ۳۶ The Hindee Orthoepe. کاظم علی جوان ۶۱۸۰۴ رومن اس کے کچھ حصے ۶۱۸۰۲ میں ہندی مینول ”میں شامل تھے۔ پوری کتاب گل کرشنا نے رومن خط میں اسی نام سے شائع کی۔
- (شکنتلا)
- ۳۷ مذہب عشق (گل بکاوی) نہال چندلا پور اردو اس کا چوتھا ایڈیشن غلام اکبر نے مرتب کیا تھا جسے ۶۱۸۱۵ میں شائع کیا گیا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن افسوس اور روبک کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا۔

- ۲۸ ہدایت الاسلام (پہلی جلد) انا اللہ شیدا ۶۱۸۰۴ اردو .
- ۲۹ A New Theory and Prospectus of Persian Verbs گل کرست " روٹن گل کرست نے اس کا پہلا ایڈیشن ۶۱۸۰۱ میں نجی طور پر شائع کیا تھا۔
- ۳۰ آرائش محفل (قصہ حاکم طائی) حیدر بخش اردو . یہ ۶۱۸۳۵، ۶۱۸۳۶، ۶۱۸۴۳ اور ۶۱۸۶۲ میں بھی شائع ہوئی۔
- ۳۱ سنگھاسن بتیسی کاظم علی جوان ۶۱۸۰۵ ناگری ترجمے میں للوالال نے مدد کی تھی چنانچہ سرورق پر ان کا نام بھی درج تھا لیکن کی (F.E. Key) نے صرف للوالال ہی کو اس کا مصنف قرار دیا ہے۔ جو کسی طرح بھی درست نہیں۔
- ۳۲ بے تال پچسی مظہر علی ۶۱۸۰۵ ناگری اردو اس کی ترتیب میں بھی للوالال نے دلا کی معاونت کی تھی چنانچہ بحیثیت مترجم ان کا نام بھی سرورق پر درج تھا لیکن کی (F.E. Key) نے اس کا واحد مصنف للوالال کو قرار دیا ہے۔
- ۳ خرد افروز حفیظ الدین اردو اس کا دوسرا ایڈیشن روٹن نے ۶۱۸۱۵ میں تصحیح اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔
- ۳۳ عہد نامہ جدید مرزا محمد " " یہ "The new Testament" کا ترجمہ ہے، جسے ہنر نے تصحیح کے بعد شائع کیا تھا۔

History of Hindi Literature p. 81 ۱

History of Hindi Literature p. 81 ۲

۴۵ گنج خوبی یا اخلاق محسنی میرامن ۶۱۸۰۵ ناگری دوسری ایڈیشن اردو رسم الخط میرے
بہیٹی سے ۶۱۸۰۵ میں شائع ہوا۔

۴۶ Dictionary مارکن نوش ۶۱۸۰۸ رومن اردو

۴۷ آرائش محفل شیرعلی افسوس " اردو سال تکمیل ۶۱۸۰۵

۴۸ Hindoostanee ولیم ٹیلر " رومن اردو

Dictionary

۴۹ گرامر کے سوالات " " " " رومن اردو یہ بطور خاص کالج کے نصاب کے
پیش نظر لکھی گئی تھی۔

۵۰ Hindoostanee English Dictionary ولیم ہنٹر " اردو رومن

۵۱ دل چسپ کہانیاں گلیڈون " رومن اسے بعد میں ناگری رسم خط میں بھی
شائع کیا گیا۔

۵۲ راج نیتی لولال ۶۱۸۰۹ ناگری

۵۳ بہاری ستاسی یا لال " " " " ناگری بہاری ستاسی کی تشریح
چندریکا

۵۴ Hindi Persian Vocabulary سدل منسر " اردو ناگری اس پر سدل منسر کو پچاس روپیے کا
انعام ملا تھا۔

(ہندی فارسی لفظوں کا ترجمہ)

۵۵ پریم ساگر لولال ۶۱۸۱۰ ناگری اس کے کچھ حصے ۶۱۸۰۳ میں سری بھاگو
کے نام سے شائع ہوئے تھے۔

۵۶ The English and Hindoostanee Dictionary with grammar Prefixed تھا مسزود ۶۱۸۱۰ رومن یہ پہلی مرتبہ ۶۱۸۰۹ میں ایڈنبرا سے
شائع ہوئی تھی۔

- ۵۷ دیوان میر سوز میر سوز ۶۱۸۱۰ اردو
- ۵۸ لطائف ہندی (بزبان ہندی) للوالل ناگری
- ۵۹ لغت ہندی (بزبان اردو) " " اردو
- ۶۰ صرف اردو (منظوم) انشا اللہ شیدا " اردو سال تصنیف ۶۱۸۰۶
- ۶۱ کلیتا سودا کا انتخاب کاظم علی جوان ڈ ۶۱۸۱۰ اردو
مولوی محمد مسلم
- ۶۲ انتخاب اخوان الصفا مولوی اکرم علی ۶۱۸۱۱ اردو
- ۶۳ رام چرتا سدال مسر " ناگری تالیف ۶۱۸۰۶۔ یہ ادبیاتم رامین کا ترجمہ ہے
- ۶۴ کلیتا میر (چار جلدوں میں) مرتبہ جوان، " اردو یہ ٹیلر کے زیر نگرانی مرتب ہوا تھا۔
نارنی چرن
طیش، غلام
اکبر اور مولوی
محمد اکبر
- ۶۵ English and Hindoo. ۶۵
stane Naval Diction
ary of Technical
Words and Phrases
رومن اردو اردو ادب کے مورخین نے اس کا
نام " لغت جہاز رانی " لکھا ہے۔
- ۶۶ خلاصہ الحساب نارنی چرن متر " اردو
- ۶۷ برج بھاشا کے قواعد للوالل " اردو ناگری یہ انڈیا گزٹ پریس میں طبع ہوئی تھی
- ۶۸ کثیر الفوائد - - - ۶۱۸۱۲ اردو ہندوستانی، فارسی اور پنجابی گردائیں
- ۶۹ English and Hindoo ۶۹
stani Exercises
رومن اردو دو جلدوں میں
- ۷۰ ترجمہ گلستاں لالہ کاشی راج " گر لکھی بہ زبان پنجابی

- ۴۱ ہندی کہاوتیں - - - ۶۱۸۱۲ اردو
- ۴۲ گل منفرت چندر شجری اردو
- ۴۳ بارہ ماسا (دستور بند) کاظم علی جواں اردو
- ۴۴ A Panjabi Dictionary لالہ کاشی راج ۶۱۸۱۳ گر مکھی
لفظوں کا تلفظ ناگری میں ہے
- ۴۵ پوش پر یکچھا ۳-ارنی چرن " ناگری
- ۴۶ پریم ساگر کا لغت ولیم پرائس ۶۱۸۱۳ ناگری
- ۴۷ کھڑی بولی اور نگلش کا لغت " ۶۱۸۱۵ ناگری رو
- ۴۸ Collection of Oriental قھاس روک ۶۱۸۱۶ اردو
Proverbs
- ۴۹ سبھا بلاس لولال ۶۱۸۱۷ ناگری
پرائس نے ۶۱۸۲۸ میں اسے دوبارہ مرتب کیا تھا۔
- ۸۰ Annals of the Fort قھاس روک ۶۱۸۱۹ رومن
William College
- ۸۱ نبی کتھیا حکایت نصیحت آموز تاری چرن ۶۱۸۱۹ اردو
(حصہ اول)
- ۸۲ نبی کتھیا حکایت نصیحت آموز " ۶۱۸۲۰ " (حصہ دوم)
- ۸۳ چھتر سال لولال ۶۱۸۲۱ ناگری
پرائس نے اسے دوبارہ مرتب کر کے ۱۸۰۲ میں شائع کیا تھا۔
- ۸۴ افعال فارسی و اردو قھاس روک ۶۱۸۲۲ رومن اردو
اس کی ترتیب کی ابتدا ہنٹرنے کی تھی۔
- ۸۵ Hindee English Dic- گنگا پرشاد شکل ۶۱۸۲۴ ناگری رو
اس کا دوسرا ایڈیشن ۶۱۸۲۷ میں بھی طبع ہوا تھا۔
tionary
- ۸۶ Hindoostanee Grammar ڈبلیو ٹیس ۶۱۸۲۷ رومن اردو

۶۱۸۴۱ اور ۶۱۸۴۲ میں بھی ۱ سے
 شائع کیا گیا

ڈبلیو۔ ٹیس ۶۱۸۴۲ رومن
An Introduction of the Hindoostanee Language ۸۷

اردو " ولیم پرائس اوڈ
 تاری چرن مشر
Hindee and Hindoostanee Selections ۸۸

(دو جلدوں میں)

۶۱۹۰۳ میں بنارس بھی شائع کیا گیا۔
 ۶۱۸۴۹ ناگری لولال چھتر پور کاش ۸۹

۶۱۸۴۱ رومن دیوی پرشاد کا
Polyglot Munshi ۹۰

شعراے ہندی کی نظموں کا انتخاب
 ناگری لولال ہندی مثنوی ۹۱

۶۱۸۱۱ سال ترجمہ
 ناگری لولال ہندی اسٹوری کا ترجمہ لالہ کاشی نامعلوم گر مکی ۹۲

پنجابی (دو جلدوں میں) راج

۶۱۸۱۱ رومن تھامس روبک نامعلوم اردو رومن
A Persian Dictionary ۹۳

(برہان قاطن) لہ

۶۱۸۱۱ رومن اردو " نامعلوم
A Complete Hindoostanee and English Dictionary ۹۴

لہ وارث نے اسی طرح لکھا ہے۔ "برہان قاطن" ہونا چاہیے۔ (فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۸ اور ۱۰۹)

فہرست نمبر ۲

غیر مطبوعہ ۱۔

حسب ذیل کراہیں کالج کی جانب سے شائع نہیں ہو سکیں۔ لیکن ان میں بعض کتابیں کسی ادارے کی طرف سے یا ذاتی طور پر شائع ہو چکی ہیں، جن کی نشاندہی کیفیت کے خانے میں کر دی گئی ہے۔

نمبر	نام کتاب	مولف	سال تصنیف	رقم خط	کیفیت
۱	مہر و ماہ	خیر بخش حیدری	۶۱۸۰۰	اردو	
۲	قصہ لیلیٰ مجنوں	"	۶۱۸۰۱	اردو	
۳	گلشن بند	مرزا علی لطف	"	اردو	اسے انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد نے پہلی مرتبہ ۶۱۹۰۵ء شائع کیا تھا۔
۴	مادھونل اور کام کندلا	مظہر علی خاں ولا	"	اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۶۱۹۶۵ء میں اردو دنیا کراچی سے اسے شائع کر دیا۔
۵	ہفت گلشن	"	"	اردو	اسے بھی عبادت بریلوی نے ۶۱۹۶۴ء میں کراچی سے شائع کیا ہے۔
۶	بہار دانش	مرزا جان پلش	"	"	یہ پہلی مرتبہ ۶۱۸۳۹ء میں اور دوسری بار ۶۱۸۴۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن کالج کی طرف سے یہ شائع نہیں ہوئی تھی۔
۷	قصہ فرعون	محمد بخش	۶۱۸۰۳	اردو	
۸	جامع القوانين	خیر بخش حیدری	"	اردو	
۹	باغ سخن	مرزا منگل نشاں	"	اردو	

- ۱۰ حسن و عشق (گل ہیز) غلام حیدر عورت ۶۱۸.۳ اردو
- ۱۱ بحر عشق یا سیف الملوک منصور علی اردو
- ۱۲ کلیات سودا دین مرتبہ شیر علی اردو
- جلدوں میں، افسوس
- ۱۳ گلشن ہند اسطخاں اردو اس میں "گل و صنوبر" بھی شامل ہے،
- ۱۴ الفایلہ شاکر علی اردو چنانچہ کالج کی کاروبیوں میں اس کا
- ۱۵ توارخ بنگالہ غلام اکبر اردو ام گل و صنوبر ہی لکھا ہے
- ۱۶ توارخ عالم گیری محمد عمر اردو
- ۱۷ توارخ تیموری تصدق حسین اردو
- ۱۸ توارخ سلاطین غلام شاہ بھیک ۶۱۸.۳ اردو
- ۱۹ قصہ دل و حسن " اردو
- ۲۰ اخلاق النبی غلام اشرف اردو
- ۲۱ کلیات ولی مرتبہ نامعلوم اردو
- ۲۲ دہ مجلس شیخ محمد بخش اردو
- ۲۳ در مجالس غلام سبحان اردو
- ۲۴ مثنوی کلکتہ معہ قصہ بلند اختر نور خاں ۶۱۸.۳ اردو
- ۲۵ قصہ رضوان شاہ خلیل علی خاں اردو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے بھی پاکستان سے شائع کر دیا ہے
- ۲۶ گلزار دانش چند بخش جدی اردو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے بھی شائع کر دیا ہے

سے جاوید نہال "مثنوی کلکتہ" اور "قصہ بلند اختر" کو دو الگ الگ تصنیف قرار دیتے ہیں (انسٹوٹ

صدی میں بنگالہ کا اردو ادب ۱۳۴-۱۴۱۳) یہ صحیح نہیں ہے۔ نور خاں نے بطور مثنوی پہلے قصہ بلند اختر لکھا

بعد میں اس مثنوی کو نثر میں منتقل کیا اور اس کا نام "مثنوی کلکتہ" رکھا اور قصہ بلند اختر کو بھی اس میں شامل کیا

(نور شاہ ایم کالج کی ادبی خدمات ۲۹۳۳)

۲۷	چشمہ فیض	معین الدین فیض ۶۱۸۰۴	اردو	منظوم
۲۸	(پندنا فرید الدین عطا)			
۲۸	ہدایت الاسلام (جلد دوم)	امانت اللہ شیدا	اردو	
۲۹	ترجمہ قرآن شریف	بہادر علی شیدا	اردو	اس کے کچھ حصے ۶۱۸۰۴ میں طبع ہو چکے تھے لیکن اباب کالج نے اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے طبع شدہ اجزا ضبط کر لیے۔
	(دو جلدوں میں)	عوث علی کاظمی		
		جواں اور فضل اللہ		
۳۰	جامع الاخلاق	امانت اللہ شیدا	اردو	۶۱۸۰۵
				۶۱۸۰۸ میں کلکتہ سے شائع کیا۔
۳۱	انتخاب سلطانیہ	خلیل علی خاں شاہک	اردو	
۳۲	ترجمہ تاریخ شیرشاہی	منظہر علی خاں اولاد	اردو	
				یہ عباس خاں بکپور سروانی کی فارسی سے تصنیف "تحفہ اکبر شاہی" کے بیسنر کا ترجمہ ہے
۳۳	تاریخ آسام (آسام)	بہادر علی حسینی	اردو	
۳۴	تاریخ بہمنی (تاریخ فرشتہ)	کاظم علی جواں	اردو	۶۱۸۰۷
۳۵	اقبال نامہ	سید بخش علی	اردو	۶۱۸۰۹
۳۶	افسانہ جان و دل (چہار باغ)	یکھم ہارین رند	اردو	۶۱۸۰۹
۳۷	تاریخ نادری	جید بخش جیدی	اردو	
۳۸	ہفت پیکر (منظوم)	"	اردو	
۳۹	گلشن اخلاق	سید علی جعفری	اردو	
۴۰	جہاں گبر شاہی	منظہر علی خاں اولاد	اردو	

۱۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال محفوظ ہے، جس کا دیباچہ کاظم علی جواں کا لکھا ہوا ہے۔

۴۱	کتاب واقعات اکبر	خلیل علی خاں ۶۱۸۰۹ اردو اشک
۴۲	بہار عشق	مولوی نور علی ۶۱۸۱۰ اردو
۴۳	منتخب الفوائد	خلیل علی خاں اشک ۶۱۸۱۱ اردو
۴۴	دیوان طیش	مزا جان طیش اردو
۴۵	شادناہند (شہناہندی)	محمد علی اردو
		یہ توکل بیگ کی فارسی تصنیف "شمشیر خانی" کا اردو ترجمہ ہے۔
۴۶	چار گلشن	بینی ناراین اردو
		ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۹ء میں زیور طباعت سے آراستہ کر دیا ہے۔
۴۷	دیوان جہاں	۶۱۸۱۲ اردو
		۱۹۵۹ء میں کلیم الدین احمد نے اسے پٹنہ سے شائع کر دیا ہے۔
۴۸	بیادریں	مزانئی بیگ ۶۱۸۱۳ ناگری
۴۹	تفریح طبع	بینی ناراین ۶۱۸۱۴ اردو
۵۰	مادھو بلاس (منظوم)	للولال کوی ناگری
۵۱	نوبہار	بینی ناراین ۶۱۸۲۳ اردو
۵۲	ضرب الامثال	نامعلوم اردو
۵۳	گل بکاولی	غلام اکبر نامعلوم اردو
		مملوکہ ڈاکٹر حنیف نقوی

لے کالج کی کاروائیوں میں اس کا نام "اکبر نامہ" لکھا گیا ہے۔

کالج کے ملازم مصنفین اور ان کے کارنامے

انگریز مصنفین

(۱۱) جان بارکھوک گل کرسٹ

(John Barckhok Christ)

گل کرسٹ کا شمار بجا طور پر اردو کے محسنین میں کیا جاتا ہے۔ یہ اسی کی بگرکاری و عرق ریزی کا نتیجہ ہے کہ اردو نثر و تصانیف سے جمود و تعطل کا شکار تھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا اس کے علاوہ زراعت و تجارت سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ اگر وہ چاہتا تو کاشتکاری، تجارت اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے ذریعے کافی دولت کما کر عیش و عشرت اور طرب و نشاط کی زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن ان تمام مفادات کو پس پشت ڈال کر اس نے جس لگن کے ساتھ ہندوستانی زبان و ادب کی خدمات اور ترویج و ترقی کے لئے خود کو وقف کر رکھا وہ اس کا ایک انتہائی قابل ستائش کارنامہ ہے۔

محمد یحییٰ تنہا، رام بابو سکسینہ، سید محمد، لکشمی ساگر وارشنے، محمد عتیق صدیقی، جاوید نہال، صدیق الرحمن قدوائی اور شانتی رجن بھٹا چاریہ نے گل کرسٹ کے حالات کسی قدر تفصیلی سے لکھے ہیں خاص طور پر عتیق صدیقی اور صدیق الرحمن نے اس موضوع سے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں تاہم اس کی زندگی کے گوشے اب بھی پوری طرح روشنی میں نہیں آسکتے ہیں۔

گل کرسٹ کی ولادت ۱۸۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور شہر ایڈنبرا میں ہوئی۔ اس نے ابتدائی تعلیم کس درگاہ میں حاصل کی اس کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ اس قدر معلوم ہے کہ عنفوان شباب میں اسے فن طب سے دل چسپی پیدا ہوئی، چنانچہ اس نے اپنے شہر کی مشہور طبی درگاہ "جارج ہیرٹس ہوسپٹل" (George Herriot's Hospital) میں داخلہ لیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد شروع میں اس نے کیا کیا یہ بات اب تک نامعلوم ہے۔

ہندوستان آنے سے پہلے وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ویسٹ انڈیز (مغربی مجمع الجزائر) گیا تھا۔ لیکن جوانی کے جوش، وصلے کی بندری اور دولت جمع کرنے کی خواہش نے اسے اس پیشے کو ترک کر کے نیل کی کھیتی کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے اس کاروبار میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ ویسٹ انڈیز کب اور کس طرح گیا اور وہاں کتنے دن مقیم رہا ان امور کی اب تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے اور ہندوستان آنے کی وجوہات بھی ہنوز نامعلوم ہیں چونکہ اس زمانے میں خرننگی نوجوانوں کی نگاہ میں ہندوستان میں عشرت دینے اور دولت و ثروت حاصل کرنے کے بہترین مواقع موجود تھے، اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ گل کرسٹ بھی محض سمت آزمائی کے لئے ہندوستان آیا ہوگا۔

گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ چند دنوں کی بیکاری کے بعد نومبر ۱۷۸۲ء میں بمبئی ڈیپٹچ منٹ (Bombay Detachment) میں اسٹنٹ سرجن کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت اس فوجی طبی عہدے پر اس کی پہلی پوسٹنگ سورت میں ہوئی تھی۔ سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مقامی باشندوں کی زبانوں سے واقفیت کے بغیر تو اس کے لیے کماحقہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری ممکن ہو گی اور نہ وہ اپنے مالکوں کے مفاد میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دے سکے گا۔ چنانچہ اس نے "Appendix" میں لکھا ہے کہ

"۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام، خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ ہو تو میرے لیے خوش گوار ہو سکتا ہے، اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ ملک کی مرد و بھڑ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کر لوں، جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے چنانچہ اس زبان کو جسے اس زمانے میں مورس (Mors) کہتے تھے، سیکھنے کیلئے میں تم کر بیٹھ گیا۔" لے

اپنے اس احساس کے تحت گل کرسٹ نے پوری طالب علمانہ تہذیب کے ساتھ ہندوستانی زبان کا

۱۔ ممتاز منگلوری، تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، جلد آٹھویں ص ۶۷

Appendix P. VI

۲۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۷-۶۸

مطالعہ شروع کیا۔ چنانچہ جیسے اس پر اس زبان کے اسرار کھلتے گئے۔ اس کی دل چسپیاں بھی بڑھتی گئیں اور وہ اس میدان میں ترقی کرتا گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس کی حیثیت طالب علم سے بڑھ کر استاد اور پھر محقق کی ہو گئی۔ شروع میں اس نے ہیڈ لے کی گرامر سے رجوع کیا جو ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی تھی اور اس زبان کے مبادیات پر مشتمل تھی۔ ایک دو ہفتے کے بعد اسے ایک منشی مل گیا جس نے امرار کیا کہ اس نے ہیڈ لے کی کتاب سے جو کچھ سیکھا ہے اسے بھلا دے یہ فوج کے جس دستے میں گل کرسٹ کا تقرر ہوا تھا اس نے یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو فتح گڑھ (پنجاب) کے لیے کوچ کیا۔ یہ سفر گل کرسٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے اسے ہندوستانی کی مختلف شاخوں سے براہ راست تعارف کا موقع ملا۔ سفر کے دوران اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اردو برصغیر ہند میں ملک گیر زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تجربے نے اس کی اس زبان کو مکمل طور پر سیکھنے کی خواہش کو مزید تقویت بخشی اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے طب کا پیشہ چھوڑ کر زبان و ادب کی علمی تحقیق کا پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ فتح گڑھ کے زمانہ قیام ہی میں اس نے ذاتی مطالعے سے اس زبان کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لی۔

ہندوستانی زبان کے مطالعے کے ابتدائی زمانے ہی میں گل کرسٹ کو اس زبان کی قواعد اور لغت سے متعلق کتابوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ چنانچہ فتح گڑھ کے قیام کے دوران ہی اس نے ان موضوعات پر کام کرنے اور کتابیں لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا، تاکہ اس کے ہم وطن بھائیوں کو ہندوستانی زبان کے مطالعے میں وہ پریشانیاں نہ اٹھانا پڑیں جن سے وہ خود دوچار ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس کا خیال تھا کہ کمپنی اور برطانوی حکومت کا حقیقی مفاد اس میں مضمر ہے کہ ہندوستانی زبان کی اعلا قابلیت حاصل کی جائے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے اس نے ۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو بورڈ سے ایک سال کی چھٹی کی درخواست کی۔ کمپنی کی فوج کے کمانڈر ان چیف میجر جنرل اسٹریٹ (امریکا سنگھ) اور فرانسس بالفور (Bal Four) کی سفارش

۱۔ مولوی عبدالحق، قواعد اردو ص ۱۱

Appendix p. VI

۲۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۷

سے کمپنی نے ایک سال کی چھٹی کی منظوری دے دی، جسے اس نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جون پور، بنارس اور بہت سے علمی مقامات کے سفر میں گزارا، تاکہ زبان کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہو جائے اور قواعد اور لغت کے لیے مواد جمع کیا جاسکے۔

اپریل ۱۸۵۷ء میں گل کرسٹ فتح گڑھ سے فیض آباد پہنچا، اس نے رخصت کا پیش تر حصہ چھپیں گزارا۔ یہاں جب اس نے لوگوں سے ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت سے متعلق کتابوں کے بارے میں دریافت کہا تو اس کے سامنے صرف "خالق باری" پیش کی گئی جو بچوں کو یاد کرانے کے لئے الفاظ کی ایک مختصر منظوم فہرست سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ گل کرسٹ نے اسے لغت قرار دے کر اس کی عزت افزائی کی۔ وہ نہایت خلوص اور حوصلے کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کی کوشش میں منہمک رہا۔ محدود ذاتی صلاحیتوں کے احساس کے ساتھ ارادے کی پختگی، ذرائع و وسائل کی کمیابی کے باوجود علمی تحقیق کی لگن اور اپنے مقاصد کی کامیابی کی تمنا کے ساتھ عاجزی و انکساری کے مظاہرے نے اس کے اندر ایک زبردست تاریخی کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ اس نے از خود وہ سارے حالات پیدا کرنے کا انتظام کر لیا جو اس کام میں آسانیاں ہم پہنچا سکتے تھے۔ مثلاً ہندوستانی ملبوسات اختیار کر لیے اور لمبی سیاہ داڑھی بڑھالی، تاکہ ہندوستانیوں کو اس سے بیگانگی اور غیرت کا احساس نہ ہو۔ اس نے پورے طالب علمانہ ذوق و شوق کے ساتھ ارباب علم سے استفادہ کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ اس زبان کے تقریباً سارے معروف الفاظ زبان پر چڑھ جائیں۔

گل کرسٹ کو ایک نئے چیلنج کا سامنا تھا۔ جو کام یورپ میں متعدد ارباب علم کی مشترکہ کوششوں سے انجام پا رہا تھا اس نے اسے تنہا گزر کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کافی محنت اور جگر کا دی کے بعد جب اس نے اپنی لغت مکمل کری تو کلکتے کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ میجر کرک پیٹرک نے جو کمانڈر ان چیف کا سکریٹری اور فارسی کا ترجمان ہے، ہندوستانی لغت کا کچھ حصہ تیار کر کے شائع کر دیا ہے اور باقی حصہ کسی بھی وقت منظر عام پر آسکتا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی گل کرسٹ کے ہاتھوں کے توتے اٹ گئے اور وہ سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی ذہنی

سیددق و رحمان دیدار، سید کریست اور دیگر لہجہ و گویش ہندوستان، ص 39

قلبی کیفیت کا اندازہ خود اس کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔
 ”ہمارے دل کی چوٹ کا اندازہ وہی بد بخت شخص لگا سکتا ہے جو ترقی کی معراج پر
 پہنچ کر مصیبتوں کی گھاٹی میں گر جائے۔“ لے

سخت محنت اور اس حوصلہ شکن خبر نے گل کرسٹ کو بیمار ڈال دیا اور ایسا بیمار کہ جان
 کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ آب دہوا کی تبدیلی اور آرام و علاج کی غرض سے وہ سخت بارش اور سیلاب
 کے زمانے میں فیض آباد سے بنارس آیا۔ یہاں اس کے ایک دوست ڈاکٹر پیٹر ویڈ (Dr. Peter Wade)
 نے اس کا علاج کیا جس سے اس کی صحت بحال ہوئی۔ بنارس
 کے خوش گوار موسم اور فرحت بخش آب دہوا کے اثر سے اس کے مزاج میں ایک لطیف تغیر رونما
 ہوا اور اس نے دوبارہ اسی دلوے اور جذبے کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے تہیہ
 کر لیا کہ وہ اپنی دوہری وہ لسانی لغت (اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو) اتنے بڑے
 پیمانے پر اور اس طرح مرتب کرے گا کہ اس میدان میں آئندہ بھی کوئی اس کی ہم سہری و ہم چہنی کا دعویٰ
 نہ کر سکے۔

۱۸۵۷ء کے آخر میں جب گل کرسٹ کلکتہ پہنچا تو اس کی ملاقات کرک پیٹرک سے ہوئی۔
 اس ملاقات کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ چونکہ کرک پیٹرک کی کتاب ابھی پارہ تکمیل تک
 نہیں پہنچی تھی اس لیے اب دونوں نے اپنی صلاحیتوں کو مجتمع اور اپنی کوششوں کو ہم آہنگ
 کر کے ایک جامع اور مکمل لغت کی تیاری کا منصوبہ بنایا۔ گل کرسٹ کی لغت کی پہلی جلد ۱۸۶۷ء
 میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ
 وہ لغت کی اشاعت کے سلسلے میں اس کی سرپرستی کریں اور کلکتے سے باہر کے جو لوگ اس سے
 خط و کتابت کرنا چاہیں ان سے ڈاک ٹکٹ کے پیسے نہ لیے جائیں گورنر جنرل نے اس کی یہ
 دونوں خواہشات منظور کر لیں۔ لیکن حالات نے گل کرسٹ کے ساتھ مساعدت نہ کی۔ ایجنٹوں
 کی خرد برد، بازار پر بہ معاملہ لوگوں کے تسلط سے اسے بہت صدمہ پہنچا اور صرف اس کی عزت

لے بحوالہ
 Epilechrisman & The language of Hindoostan p. 41
 M.A. Siddiqi, Origin of Modern Hindustani literature p. 195

دشہرت ہی خطرے میں نہیں پڑی بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ وہ خود لکھتا ہے:-
 " اس طرح دباؤ میں رہ کر زندگی گزارنا میرے لیے سخت سوبان روح تھا۔ لیکن
 میں جب بھی غور کرتا تھا تو موت ان لوگوں کے سلوک سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی
 تھی۔ کیونکہ قرض بھی قرض خواہوں، پریس میں کام کرنے والوں اور دوسرے مختلف
 لوگوں کے تقاضے جن کے ہمارے ادب و اجبات تھے، بھولے نہیں جاسکتے۔ اے
 اس دوران سر جان شور، لارڈ ولرلی اور میجر کرک پیٹرک نے فل کرسٹ کی کتابوں کی اشاعت
 میں حتی المقدور اس کی مدد کی۔ اس کے باوجود ۱۹۱۶ء میں بارہ ہزار روپے کے قرض کی ادائیگی
 کے لئے اسے کمپنی کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس نے واجبات کے بارے سے پوری
 طرح سبکدوش ہونے کے لیے مزید دو سال کی رخصت حاصل کر کے اپنی تمام تر توجہ اپنے
 شریک کار چارٹرس (Charter) کے ساتھ نیل کی کاشت اور شکر وافیوں کی تجارت پر مرکوز
 کر دی۔ ان تجارتی مشغولیات کا براہ راست اثر اس کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں پر پڑا۔ چنانچہ قواعد
 کی تصنیف کا کام وقتی طور پر التوا میں پڑ گیا۔ ۱۹۱۵ء کے ابتدائی مہینوں میں اس نے اپنے دو
 نمائندوں کو غازی پور میں اس غرض سے متعین کیا کہ وہ اس کی کاشت اور تجارت کی نگرانی کریں
 اور وہ خود کلکتے کے قریب رسا پوگالا میں سکونت اختیار کر کے یکسوئی کے ساتھ دوبارہ اپنے علمی کاموں
 کی تکمیل میں منہمک ہو گیا۔ چنانچہ چند مہینوں کی سخت محنت کے بعد اس نے اپنی شہرہ آفاق
 قواعد مکمل کر لی، جو دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۱۶ء میں طباعت کے مراحل طے کر کے منظر عام
 پر آگئی۔ ۳

لغت کی اشاعت، نیل کی کھیتی اور شکر وافیوں کے کاروبار کے منافع سے وہ اتنا زیادہ
 خوش ہوا کہ خود کو ایک مالدار آدمی سمجھنے لگا۔ اس خوشی کے اظہار کے لئے اس نے ایک تقریب منعقد

Appendix, P. IX - X

حوالہ: Gilchrist and The Language of Hindoostan P. 44

Di dural Gilchrist and The Language of Hindoostan P. 44

M.A. Siddiqui, Origin of Modern Hindustani Literature. P. 205

کی جس میں اپنے قرض خواہوں سے اپنے خرچ اور ذمہ داری پر ایک نئی کتاب کی طباعت کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے کام کے لیے ایک دولت مند آدمی کی جمع کی ہوئی دولت نا کافی ہے۔ وہ محض تین سو روپے ماہانہ کما تھا، جن میں سے ڈیڑھ سو روپے منشیوں اور کتابوں کی تنخواہ پر صرف ہو جاتے تھے۔ لیکن چونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا اس لیے لگ بھگ اٹھارہ مہینے تک اسے روزانہ بارہ سے چودہ گھنٹے تک کام کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں اس کی عام صحت اور بنیائی بری طرح متاثر ہوئیں۔ لیکن اس نے اپنی کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو لغت و قواعد کی ترتیب کے دوران جمع کی ہوئی نئی معلومات بہم پہنچانے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۸ء میں لغت و قواعد کا ضخیم *Appendix* شائع کیا اور اسی سال ایک اور کتاب *Oriental* "linguist" (مشرقی زبان داں) بھی شائع کی۔ یہ مبتدیوں کو ایک نظم کے ساتھ ہندوستانی کی تعلیم دینے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔

۱۷۹۷ء میں گل کرسٹ نے انگلینڈ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن بعد میں روانگی کی یہ تاریخ ملتوی کر کے اس نے دوسری تاریخ ۱۷۹۹ء کی متعین کی اور اپنے اس ارادے سے گورنمنٹ کو بھی مطلع کر دیا۔ مراجعت کی پہلی تاریخ کے التوا کی وجہ یہ تھی کہ اسے غازی پور میں اپنی جائداد کی علاحدگی اور کتاب کی اشاعت دونوں کے لیے مزید وقت درکار تھا۔ "مشرقی زبان داں" کی سرپرستی کی درخواست اس نے ۲۲ اگست ۱۷۹۸ء کو پیش کی اور نیل کے کارخانے اور اس کی عمارتوں کے نیلام کا اشتہار ۲۷ ستمبر ۱۷۹۸ء کو جاری کیا۔ اس کے بعد ہی ۲۱ ستمبر ۱۷۹۸ء کی یادداشت کے بموجب اس کی خدمات ہول ملازمین کو پڑھانے کے لیے "Oriental Seminary" کو منتقل کر دی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے ہندوستانی شعبے کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا گیا۔ کالج میں گل کرسٹ کی کارکردگی اور اس زمانے کے حالات کا

۱۷۹۵ء *Aidua. Epilchrist and the Language of Hindoostan* p. 45

جاوید نہال کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ "مشرقی زبان داں" گل کرسٹ کی واپسی کے بعد ۱۸۰۷ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۷۱)

Epilchrist and the Language of Hindoostan p. 46

مفصل ذکر " فورٹ ولیم کالج کی تاریخ " کے ضمن میں آچکا ہے اس لیے یہاں ان تفصیلات کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۰۷ء میں جب گل کرسٹ نے کالج کی ملازمت سے استعفادے کر انگلینڈ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تو گورنر جنرل لارڈ دلہزی نے اسے مسٹر ایڈنگٹن (Messrs. Adingtons) کے نام جو بعد میں لارڈ سڈمنٹھ کے نام سے مشہور ہوئے، ایک خط لکھ کر دیا۔ دلہزی نے اس خط میں لکھا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ انگلینڈ میں آپ گل کرسٹ کا شایان شان استقبال کریں گے، مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں آپ سے سفارش کروں کہ اس قابل احترام شخص کا جس نے محض اپنے حوصلے اور جوش سے مشرقی زبانوں میں امتیاز حاصل کیا ہے، مناسب خیال رکھیں اور پبلک سروس کے کسی شعبے میں معقول عہدے سے سرفراز کریں۔" لارڈ گورنر جنرل کی اس سفارش کے بموجب ایڈنگٹن نے گل کرسٹ کی کس حد تک مدد کی، اس کی کوئی شہادت دریافت نہیں۔

انگلینڈ واپسی کے بعد گل کرسٹ کچھ دنوں تک ایڈنبرا میں مقیم رہا۔ اس زمانے میں اس نے کسی معاوضے کے بغیر ہندوستانی زبان سے متعلق کئی لکچرز دیے اور اپنی پرانی کتابوں پر نظر ثانی کی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو ایڈنبرا یونیورسٹی نے اسے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ لارڈ اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر بھی لکھا جانے لگا۔ اس کے بعد وہ نکلسن اسکوائر (Nicholson Square) کے شمالی حصے میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ ۲۷ برس کی شاندار خدمت کے بعد ۷ جنوری ۱۸۰۹ء کو وہ تین سو پاؤنڈ سالانہ پیش پر کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ لارڈ انگلینڈ آنے کے بعد گل کرسٹ نے ملکی سیاست میں حصہ لینا اور جمہوریت کی حمایت میں تقریریں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی اس کا یہ رویہ بہت سخت ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ کئی جھگڑوں میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ تاہم وارشنے کا یہ خیال صحیح نہیں کہ

Vide Anderson's Scottish Nation, Vol. II P 299,

Origin of Modern Hindustani Literature, P. 152

Lexicon, Stephen and Sidney's Dictionary of National Biography, Vol. VII, P. 122

۳۷ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۰۵

انگلستان واپس پہنچنے کے بعد اس نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ سیاسیات کے موضوع پر "پارلیمنٹری ریفرم ان کانسٹیٹیوشنل پرنسپل" یا "برٹش لائیٹیگیٹ کانسٹیٹیوشنل لائیٹیٹی" نامی کتاب جو ۱۸۱۵ء میں گلیگو (Glasgow) سے شائع ہوئی، اسے اس زمانے کی تصنیف ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور کتاب *The oriental Occident Dictionary Pioneer* کے نام سے ۱۸۲۵-۲۶ء کے درمیان شائع کی، جس میں اس نے وہ رپورٹیں درج کی ہیں جو اس کے افسروں اور ساتھیوں کی شکایتوں پر مشتمل تھیں۔

انگلینڈ میں اس نے ایک *oriental Zoo* (مشرقی چڑیا گھر) بھی قائم کیا تھا اور جیمس گلکس (James Inglis) کے اشتراک و تعاون سے ایڈنبرا میں ایک بینک کی بھی بنیاد ڈالی تھی، جس کا ایک ضمنی مقصد اپنی کتابوں کی طباعت اور اشاعت بھی تھا۔ لیکن کتابوں کی طباعت پر اس نے ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا جس کی وجہ سے روپیہ جمع کرنے والوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور وہ بینک فیل ہو گیا۔ بینک فیل ہونے کی دوسری وجہ بینکنگ سے اس کی ناواقفیت بھی تھی۔ ۱۸۱۴ء میں گل کرسٹ لندن منتقل ہو گیا، اور کمپنی کے ملازمین کو نجی طور پر ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے لگا۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۱۸ء میں لیسٹر اسکوائر میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ قائم ہوا تو گل کرسٹ کو اس میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اب وہ دونوں جگہ کلاسیں لینے لگا۔ یہاں اسے دو سو پاؤنڈ سالانہ تنخواہ اور ڈیڑھ سو پاؤنڈ سالانہ لکچر روم کے کرائے کے لیے دیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے ہر طالب علم سے تین گنی (Guinea) بطور فیس کے وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی، جسے اس نے منظور نہیں کیا، البتہ ہر طالب علم کے لیے اس نے اپنی کتابوں کا خریدنا لازمی قرار دیا، جن کی قیمت دس سے پندرہ پاؤنڈ تھی۔ گل کرسٹ چاہتا تھا کہ کمپنی کے بھی ملازمین اس ادارے میں تعلیم حاصل کریں، لیکن کمپنی صرف ان ہی لوگوں کو

۴۲ فورٹ ولیم کالج

Siddiqur Rahman Qidwai, *Christ and the Language of Hindus* P. 57

Qidwai, *Christ and the Language of Hindoostan* P. 58

۴۳ سونے کا ایک انگریزی سکہ جو ۱۸ شلنگ کا ہوتا ہے شاید اب یہ رائج نہیں۔

اس کی اجازت دینی تھی جو اسسٹنٹ سرجن کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ گل کرسٹ ایسٹنڈیا کمپنی سے پہلے ہی ناخوش تھا اس پابندی نے اسے اور برداشتہ خاطر کر دیا۔ باہمی اختلاف کی خلیج کے اس طرح وسیع ہونے پر کمپنی نے ۱۸۲۵ء میں اپنی امداد بند کر دی اور انسٹیٹیوٹ سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جارج اسمتھ کا یہ بیان کر گل کرسٹ ۱۸۲۶ء تک اور نیٹل انسٹیٹیوٹ کا پروفیسر ہا خلافت واقعہ قرار پایا ہے، البتہ ۱۸۲۶ء تک وہ رضا۔ ازہ طور پر اپنا نجی کلاس لیتا رہا۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری ڈکن فوربس (Dancoffors) اور سنفرٹ ارنائٹ (Arnold) کے سپرد کر کے اس نے اسی ادارے کے قریب ہی ہفتے میں صرف ایک بار الگ سے کلاس لینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ ۲۹-۱۸۲۸ء تک قائم رہا، جس کی وجہ سے فوربس اور ارنائٹ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ طلبہ روزانہ کی بجائے ہفتہ میں ایک ہی دن پڑھنا پسند کرنے لگے۔ بالآخر ان دونوں کے تعلقات بھی گل کرسٹ ختم ہو گئے۔ اس کے بعد آرام و علاج کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے اسکاٹ لینڈ چلا گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے بعد اس نے پیرس کا رخ کیا، اگرچہ یہ سفر بھی تبدیلی آب و ہوا اور آرام و علاج کے مقصد سے کیا تھا۔ تاہم گمان غائب یہ ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی کچھ کام کیا ہوگا کیونکہ ڈی ٹی کی مساعی جمیلہ سے پیرس میں ہندوستانی زبان کی تعلیم شروع ہو چکی تھی۔ ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو پیرس ہی میں گل کرسٹ کا انتقال ہوا۔ پیرس میں اس کی مصروفیات کی تفصیلات قعر گنما میں ہیں۔

گل کرسٹ کے کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ اس کی بیوی میری ارن کوکٹری (Mary Arno) نے اگست ۱۹۵۰ء میں پیرس کے پوپ گگ بینو (Beno) سے دوسری شادی کر لی۔

۱۸۶۵ء میں کوکٹری کا بھی انتقال ہو گیا۔ وفات سے قبل موصوف نے ایک وصیت کے ذریعے ساڑھے سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی ایڈنبرا یونیورسٹی کے نام اس شرط کے ساتھ وقف کر دی تھی اس رقم سے تین ہندوستانی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے وظائف دیے جائیں۔ یہ تینوں طالب علم بنگال، مدراس اور

لے مولوی سید محمد، ارباب نثر اردو ص ۲۵

Concise Dictionary of National Biography P. 495

Didwari, Gilchrist and Language of Hindoostan. P. 58

اور بی صوبوں کے باشندے ہوں اور ان صوبوں میں جتنے مشہور کالج ہیں ان کے طلبہ میں سے مقابلہ کے ذریعے منتخب کیے جائیں گے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے اردو زبان خاص طور سے اردو نثر کی پیش بہا خدمات انجام دیں ان میں گل کرسٹ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اردو زبان کا سب سے پہلا سنجیدہ طالب علم تھا۔ مبالغہ نہ ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو نثر کا حقیقی موجد تھا اس سے پہلے یورپ والے اس زبان کو بازاری زبان سمجھتے تھے اور اسے بگاڑ کر لکھتے تھے اور خود ہندوستانی جن کی یہ مادری زبان سمجھی جاتی تھی، اسے فارسی کے مقابلے میں حقیر و کم تر حیثیت قرار دے کر تصنیف و تالیف کے لیے استعمال کرنا کرنا کرنا سمجھتے تھے۔ گل کرسٹ نے نہ صرف اس تصور کی تردید کی بلکہ یہ کہہ کر اس کی اہمیت کا احساس پیدا کیا کہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں یہ سب سے زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز زبان ہے اور اس کے اندر وہ جاذبیت و کشش اور قوت پوشیدہ ہے کہ مستقبل میں یہ دفتری کاروبار اور تصنیفی و تالیفی مشاغل میں فارسی کی بہترین جانشین بن سکتی ہے۔ گل کرسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے دوسرے درجے کے قلم کاروں کو اپنے گرد جمع کر کے ان سے ایسے لافانی شاہکار تصنیف کرائے جن کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اسی کی کوششوں اور کاوشوں سے اردو نثر کی نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ کیوں کہ اس نے اسے روزمرہ اور عام محاوروں کی بنیاد پر ترقی دینے کی کوشش کی۔ رام بابو سکسینہ کے بقول "گل کرسٹ نثر اردو کے مربی (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہیں۔"

اگرچہ گل کرسٹ کو محدود ذرائع و وسائل کی بنیاد پر اور انتہائی ناموافق حالات میں کام کرنا پڑا اور ہندوستانیوں اور خود اس کے ملک والوں سے بھی اسے کماحقہ تعاون حاصل نہیں ہوا، تاہم اس نے اپنی محنت اور لگن سے اس زبان کا مطالعہ کیا اور اس میں ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اولین اور بنیادی نصابی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں اور آج بھی غیر ملکی طلبہ کے لیے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ٹیکسپر، گارسن ڈی ٹی، فوربس، روبک اور دیگر یورپی مستشرقین جنہوں نے اردو زبان

لے ڈی ٹی، خطبات گارساں دتاسی ص ۲۶۸
لے تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۵

کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اپنی کامیابی کے لئے گل کر سٹ کی تصانیف کے رہن منت ہیں
گل کر سٹ کا دامن اردو کے دامن سے اور اردو کا دامن قیامت کے دامن سے وابستہ رہے گا۔
تصانیف: (۱) (انگریزی ہندوستانی لغت) - *A Dictionary, English and Hindoostance.*

اس کی پہلی جلد ۱۸۶۷ء میں اور دوسری جلد ۱۸۹۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں الفاظ کے معنی
رومن اور فارسی دونوں خطوں میں لکھے گئے ہیں۔

(۲) *A Grammar of The Hindoostanee Language:* (ہندوستانی زبان کی قواعد)

یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں انگریزی لپی میں شائع ہوئی۔ بعد میں بہادر علی حسینی نے "درار دور سال
گل کر سٹ" کے نام سے اس کا خلاصہ اردو میں مرتب کیا جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔

(۳) ضمیرہ (لغت و قواعد) سنا شاعت ۱۸۹۸ء رومن رسم الخط میں۔ - *Appendix*

(۴) (مشرقی زبان داں) سنا شاعت ۱۸۹۸ء - *The Oriental Linguist*

اس میں ہندوستانی زبان سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ہندوستانی و انگریزی کے متبادل
الفاظ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ یہ مبتدیوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن
۱۸۰۳ء میں کالج کے خرچ سے شائع ہوا تھا۔

(۵) *The Anti-Jangamist* :- (1800)

اس کتاب میں ہندوستانی کا مخم تعارف اور اس کے بیشتر الفاظ کی فرہنگ پیش کی گئی ہے۔
اس کا دوسرا ایڈیشن کالج کی جانب سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔

(۶) *A New Theory and Prospects of Persian Verbs* :- (1801)

(نوا ایجاد یعنی لفظ افعال فارسی مع مصدرات اں و مترادفات ہندوستانی و فارسی و انگریزی)
(۷) (ہندی مشقیں) (1801) :- *Hindushtani* مشقیں اور ٹولیم

کالج کے پہلے اور دوسری اتقان کے لیے فارسی رسم خط میں تیار کی گئی تھی۔

The stranger's East India Guide to the Hindoostanee (۸)
or the Hindoostanee Language of India :- (1802)

اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں ہندوستانی پریس نے شائع ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس ایڈیشن پر کتاب کا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔

*The stranger's Jnfallible
East Indian guide*

۵۶

Hindoostanee Multum in Prose

اس کے سرورق پر رومن رسم خط میں سودا کا مندرجہ شعر بھی لکھا ہوا ہے

نطق کہتا ہے میرا آج یہ ہر ناطق سے

کہ نیند میں کرنے کو خلل جاگوں گا

اس کتاب کا موضوع ہندوستانی قواعد ہے۔ ابتدا میں گل کر سٹ نے ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا

ہے، جس میں ہندوستانی زبان کی ایجاد اور اس کے ناموں پر مفصل بحث کی ہے۔

The Hindoostanee Dictionary or student's Introductor to (۹)

The Hindoostanee Language: :- 1809

اس میں گل کر سٹ نے ہندوستانی رسم خط کی اصلاح سے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت

کی ہے اور ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک مضمون بھی شامل کیا ہے۔

The Hindoostanee Principles (۱۰) (مبادیات ہندوستانی) (1802) :-

یہ حذف و اضافہ کے ساتھ کتاب نمبر دو کا اردو ترجمہ ہے۔

Practical outlines or A sketch of Hindoostanee or (۱۱)

The copy in The Roman characters (1802)

(ہندوستانی علم الہجاء کا خاکہ) اس کی ترتیب میں تاریخی چرن کی مدد بھی شامل تھی۔

The Hindee Arabic Mirror :- (1802) (۱۲)

اس میں ہندوستانی زبان میں مستعمل عربی الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔

The Hindi Manual or a key of Hindia (دو جلدوں میں) (۱۳)

1802 :-

یہ کتاب فارسی رومن اور ناگری خطوں میں لکھی گئی تھی۔ گل کرسٹ اس کا مصنف نہیں بلکہ مرتب ہے۔ جو منشی کالج سے وابستہ تھے یہ ان کی بعض کتابوں کا انتخاب ہے۔ گریسن کا خیال صحیح نہیں کہ گل کرسٹ اور عبداللہ مسکین "ہندی مینول" کے مصنف ہیں۔ اس میں باغ و بہار، شکنتلا، مادھونل کام کندلا، مرتیہ مسکین، سنگھاسن بتی، بتیال پھسی، توتا کہانی، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی اور باغ اردو کے اقتباسات شامل ہیں۔

(۱۲) (تالیق ہندی) (۱۸۰۳) :- *The Hindi Moral Preceptor*

یہ سعدی کی پنڈنامہ کا ترجمہ ہے۔ منظوم انگریزی ترجمہ گل کرسٹ کا کیا ہوا ہے۔ گلیڈون کا ترجمہ انگریزی نثر میں اور دلا کا ترجمہ اردو نظم میں ہے۔ گویا یہ پنڈنامہ کے انگریزی اور اردو مترجم کا مجموعہ ہے۔ اسے گل کرسٹ نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

(۱۵) (۱۸۰۴) :- *The Hindi Roman or the Orthographic Ultimatum*

یہ "شکنتلا" کے رومن رسم خط کا ایڈیشن ہے۔

(۱۴) (۱۸۱۵) :- *Parliamentary Reform on Constitutional Principle*

(۱۲) (۱۸۲۵) :- *The General East India Guide and Ved Mecum*

یہ کتاب کیپٹن ولیم سن نے لکھی تھی۔ گل کرسٹ نے اسے تصحیح و توسیع کے بعد شائع کیا۔

(۱۸) (۱۸۲۵-۲۶) :- *The Oriental Occidental Dictionary Pioneer*

(۱۹) (انگریزی ہندوستانی مکالمے) :- *Dialogues, English and Hindoostanee*

اس میں انگریزی کے روزمرہ مکالمات کا ترجمہ اردو میں دیا گیا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۹ء میں ایڈیشن سے شائع ہوئی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں لندن سے شائع ہوا۔ تھامس روبک کی معاونت اس کی ترتیب میں شامل تھی۔

(۲) تھامس روبک : (Thomus Roebuck)

روبوک کی ولادت لیتھگوشا (Lithgousha) میں ۱۷۸۲ء میں ہوئی تھی۔ ۱۸۰۱ء

۱۷۲ء میں اس کا بعد میں IX Val. *Survey of India* کے شائع ہونے سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ ۲۳

میں وہ ہندوستان آیا اور مدراس کے قریب ولور میں قائم مقام ٹاؤن میجر کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔ اس کے تین چار سال بعد ۱۸۰۵ء میں صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ انگلینڈ واپس چلا گیا، جہاں اس کی ملاقات گل کریسٹ سے ہوئی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اسے اردو سے خاص شغف ہو گیا تھا۔ گل کریسٹ کی ملاقات نے اس کی اس دل چسپی کے سلسلے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چنانچہ اس کی صحبت میں اس نے اردو میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ اس نے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۰ء تک اس کے ساتھ کام کیا اور اس درمیان پانچ کتابیں تصنیف کیں۔ روہک ۱۸۱۰ء میں دوبارہ ہندوستان آیا اور ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گیا، لیکن یہ ملازمت عارضی تھی۔ ۱۸۱۱ء میں وہ مستقل طور پر نائب ممتحن مقرر ہوا۔ ۱۸۱۲ء کو ابراہیم لاکٹ کالج کونسل کے سکریٹری اور ممتحن مقرر ہوئے، لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عرب چلے گئے۔ ان کی واپسی تک کونسل کے نائب سکریٹری گیلو وے نے سکریٹری کے فرائض انجام دیے اور گیلو وے کی جگہ پر روہک قائم مقام نائب سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس وقت اسے بارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ۱۸۱۶ء کے اوائل میں اس کی خدمات قائم مقام اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کالج کے ہندوستانی شعبے میں منتقل کر دی گئیں۔ اس عہدے پر کام کرتے ہوئے ابھی چار سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ۸ دسمبر ۱۸۱۹ء کو صرف ۳۵ برس کی عمر میں دست بیدار اجل نے اس کو خیز مستشرق کا چراغ زندگی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ کلکتہ کے پارک اسٹریٹ کے عیسائی قبرستان میں آج بھی اس کی قبر موجود ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کی کتابوں کی اشاعت کے لیے کورٹ نے پانچ سو گنی کی رقم بطور امداد منظور کی تھی۔

کالج میں روہک کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کورٹ کے حکم سے سکریٹری اور ممتحن کے عہدے ختم کر دیے گئے تب بھی وہ ممتحن کے عہدے پر متمکن رہے اور ۱۸۱۶ء کے بعد جب

۱۱ لکشمی ساگر وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۹۴

۱۲ ایضاً ” ۸۵

۱۳ شانتی رجن بھٹا چاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۲۴

پروفیسروں اور اسسٹنٹ پروفیسروں کے اپنے مضامین کے ممتحن بننے پر پابندی عائد کی گئی تو انہیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا۔

تصانیف:-

(۱) Annals of The Fort William college. (فورت ولیم کالج کی روداد)۔ اس میں کالج کی ابتدا سے ۱۸۱۶ء تک کے حالات درج ہیں۔ یہ ۱۸۱۹ء میں شائع ہوئی۔

(۲) Hindoostanee and English Dictionary. (اردو لغت)۔ اس کی ترتیب میں ولیم ہنٹر نے بھی مدد کی تھی۔

(۳) قواعد ہندی۔ یہ کتاب اسکولی نصاب کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔ اسے کلکتہ تک سوسائٹی نے ۱۸۱۸ء میں دوبارہ کی تعداد میں شائع کیا تھا۔

(۴) افعال فارسی و اردو۔ اسے ولیم ہنٹر نے لکھا شروع کیا تھا لیکن مکمل روک نہ کیا۔ یہ پہلی بار ۱۸۲۴ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۵) Hindoostanee Interpreter. (ہندوستانی ترجمان)۔

ہندوستانی زبان کے اصولی مسائل سے متعلق روک کی کتاب رومن رسم الخط میں لندن اور پریس سے شائع ہوئی۔

(۶) British Indian Monitor (برٹش انڈین مونینٹر) (تین جلدیں)

یہ ایڈیٹر کے قیام کے زمانے میں ۱۸۰۶ء سے ۱۸۰۹ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کی ترتیب میں گل کرسٹ نے بھی مدد کی تھی۔ اس کی دو جلدیں ۱۸۰۹ء میں ایڈیٹر کے شائع ہوئیں تو بحیثیت مصنف روک کے ساقط گل کرسٹ کا بھی نام درج تھا۔ تیسری جلد اب شائع ہوئی اس کا پتا نہیں چل سکا۔

(۷) Hindoostanee and English Dialogue (ہندوستانی انگریزی مکالمے)

۱۸۰۹ء میں یہ ایڈیٹر کے شائع ہوئی۔ اس کی ترتیب میں بھی گل کرسٹ کی معاونت شامل تھی۔

(۸) An English and Hindoostanee Dictionary with Grammar

(دو جلدیں) Prefixed.

اس کی دونوں جلدیں ایڈنبرا سے ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئیں۔

(۹) *English And Hindoostanee Naval Dictionary of Technical Words and Phrases*.

اس میں جہاز رانی سے متعلق انگریزی الفاظ و اصطلاحات اور میدان جنگ اور فوجی بارکوں میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کے متبادل الفاظ و اصطلاحات اردو میں دیے گئے ہیں۔ یہ ۱۸۱۱ء میں کالج کی طرف سے اور ۱۸۱۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس کا نام "لغت جہاز رانی" یا "لشکری لغت" بھی لکھا ہے۔

(۱۰) *An English And Hindoostanee Exercises*

یہ دو جلدوں میں ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی۔

(۱۱) *Medical Dictionary*

یہ شاہ جہاں کے طبیب خاص حکیم محمد عبداللہ کی کتاب "الفاظ الادویہ" کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۲) *Dictionary of Muhammadan Law*.

یہ شرع محمدی کی ایک کامیاب لغت ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ روہک نے ۱۸۱۵ء میں مولوی حفیظ الدین بردوانی کی "خرد افروز" کو

اور "باغ و بہار" اور گل بکاوی "کو علی الترتیب ۱۸۱۳ء میں اپنے بیسٹ مقدموں کے ساتھ شائع

کیا تھا جو کتابیں اس کے زیر نگرانی تصنیف یا ترتیب ہوئیں، ان میں "کثیر الفوائد" (ہندوستانی،

فارسی اور پنجابی گردانیں) گلستاں کا پنجابی ترجمہ (مترجم کاشی راج) بدیاد زین، دیوان جہاں اور پنجابی

لغت (گورمکھی رسم الخط میں) کے نام شامل ہیں۔ روہک نے فارسی لغت "برہان قاطع" کی

تصحیح کر کے اسے شائع کیا تھا۔

۳۔ فرانس گلیڈون (Francis Gladwin)

فرانس گلیڈون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت بنگال آرمی سے شروع کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کو وہ شعبہ فارسی کا صدر اور پروفیسر مقرر ہوا۔

لے وارثن، فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۹-۱۰۸

اسے فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبان و ادب سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ چنانچہ اس نے اردو میں متعدد مفید کتابیں تصنیف کیں۔ بارلو بارنٹ نے ۱۸۰۷ء میں فورٹ ولیم کالج کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اس کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا۔

”مسٹر فرانسس گلیڈون نے ہندوستانی لسانیات پر عمدہ کام کیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو (ہندوستانی) اور انگریزی میں لغت کی مفید کتاب ترتیب دی ہے، جس کی تین جلدیں ہیں۔“

گلیڈون کے حالات زندگی کے بارے میں تمام ذرائع تقریباً خاموش ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس سنہ میں ولایت واپس ہوا۔ جارج اسمتھ کے بیان سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ اس نے ۱۸۱۳ء میں وفات پائی۔

تصانیف:

(۱) اسلامی قوانین فقہ کی ڈکشنری۔ اس میں بنگال ریونیو کی اصطلاحات فارسی اور اردو میں دی گئی ہیں اور آخر میں فارسی اور انگریزی کے متبادل الفاظ کی ایک طویل فہرست بھی شامل ہے، اسی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کا نام فارسی انگریزی لغت بھی لکھا ہے۔ یہ ۱۷۹۶ء میں مرتب ہوئی اور ۱۷۹۷ء میں انڈیا آفس پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۲) فارسی ہندوستانی اور انگریزی لغت۔ یہ لغت ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی تھی لیکن شائع نہیں ہو سکی۔

(۳) فارسی و بنگالہ لغت۔ یہ لغت بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۴) (دل چسپ کہانیاں) - *Entertaining Stories*

یہ کتاب فارسی کہانیوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے، یہ انگریز سیاحوں اور سوداگروں کے لیے لکھی گئی تھی اور ۱۸۰۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا بنگلہ ترجمہ کیلووے نے کیا تھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ ہندوستانی میں بھی ہوا اور ناگری رسم خط میں شائع کیا گیا۔

۱۔ بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۳-۸۲

۲۔ *concise Dictionary of - National Biography* p. 500

۴۔ ولیم ٹیلر: (William Tyler)

ٹیلر فروری ۱۸۰۸ء سے مئی ۱۸۲۳ء تک فورٹ ولیم کالج میں شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر اور صدر رہے۔ اس دوران ناسازی صحت کی بنا پر انھیں کالج سے دوبارہ چھٹی لینا پڑی تھی۔ پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں اور دوسری بار ۱۸۱۱ء میں محض ایک ماہ کی رخصت لی تھی۔ گل کرسٹ اور روبک کی طرح انھیں بھی ہندوستانی زبان و ادب سے خاص شغف تھا۔ ٹیلر کے دوران پروفیسری کالج میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کا ذکر پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان میں ایک لغت ترتیب دی جو ہندوستانی پریس کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ولیم کارمائیکل اور اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے ۱۸۲۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ لغت انگریز طلبہ کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔

۵۔ ولیم ہنٹر

ہنٹر ۱۷۵۵ء میں اسکاٹ لینڈ میں بمقام منٹروس (Mintross) پیدا ہوئے۔ ۱۷۸۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے میڈیکل افسر کی حیثیت سے وہ ہندوستان آئے۔ مئی ۱۷۹۹ء سے مارچ ۱۸۰۲ء اور اپریل ۱۸۰۴ء سے اپریل ۱۸۱۱ء تک دوبارہ وہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری رہے۔ ۱۸۰۰ء میں وہ کالج کونسل کے پہلے سکریٹری اور ممتحن مقرر ہوئے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۰۵ء سے ۳۱ دسمبر ۱۸۰۵ء تک وہ عارضی طور پر شعبہ ہندوستانی کے اسٹنٹ پروفیسر بھی رہے۔ انھیں ۱۸۰۵ء میں کالج کے کتب خانے کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں سکریٹری کے عہدے سے استعفا دے کر وہ جاوا چلے گئے اور وہیں بٹاوی (Batavia) میں ۱۸۱۲ء میں ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

ہنٹر کو ہندوستانی زبان و ادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی توسیع و ترقی کے لیے انھوں نے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں ہندوستانی پریس کے نام سے ایک مطبع قائم کیا تھا۔

۱۔ شانتی رجن بھٹا چاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۳۰

۲۔ ایضاً ص ۳۰

۳۔ شانتی رجن بھٹا چاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۳۱

ہندوستانی پریس کے بارے میں مورخین مختلف رائے ہیں۔ ڈاکٹر عتیق صدیقی گل کر سٹ کو اس کاماک قرار دیتے ہیں۔ جبکہ پیری چند مسرا نے ہنٹر کو اس کاماک تسلیم کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں کہ ”رام کنول سین اپنی تقدیر کا آپ معمار تھا اور اس نے اپنی زندگی ڈاکٹر ہنٹر کے ہندوستانی پریس میں اٹھ روپے ماہوار پر کمپوزیٹر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی پریس کا نہ تو گل کر سٹ تنہا مالک تھا اور نہ ہنٹر۔ بلکہ یہ کئی لوگوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ ”الاف آف دیوان رام کنول سین“ میں شائع ڈاکٹر ولسن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر ہندوستانی پریس کا سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ خط میں لکھا ہے کہ

”(رام کنول سین) دوسرے فرانس کے علاوہ ہندوستانی پریس کے منتظم کے فرانس بھی

انجام دیتا تھا جس کا ڈاکٹر ہنٹر سب سے بڑا شریک تھا۔“

بہر حال گل کر سٹ اور ہنٹر کی کوششوں سے ہندوستانی پریس قائم ہوا تھا۔ گلیڈون نے ٹائپنگ کا اور ویسا سامان کالج کو دیا تھا۔ گل کر سٹ نے کالج کونرس سے یہ سامان عاریتاً لے کر پریس قائم کیا اور شراکت میں ہنٹر کو بھی شامل کیا جب تک گل کر سٹ کالج میں رہا وہی پریس کا رتا دھرتا رہا اور جب وہ انگلینڈ جانے لگا تو حصہ دار کی حیثیت سے پریس ہنٹر کے سپرد کر گیا شاید اس کے بعد سے ہنٹر اس کا سب سے بڑا شریک بنا ہوگا۔

ہندوستانی پریس قائم ہونے کے بعد کالج کی بیشتر کتابیں اس میں شائع ہوئیں۔
حسب ذیل کتابیں ہنٹر کی یادگار ہیں۔

(۱) ہندوستانی لغت۔ اس کی ترتیب میں ہنٹر نے بڑی دیدہ ریزی اور جاں کاہی سے کام لیا ہے۔ انگریزوں کی لغات کے علاوہ انھوں نے ممتاز شعرا کے اردو کے دوادین و کلیات اور داستانوں سے الفاظ اخذ کیے ہیں۔ اس کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد حاصل کی گئی ہے انکی مجموعی تعداد ۲۳ ہے۔

۱۔ گل کر سٹ اور اس کا عہدہ ص ۵۲-۱۵۱

۲۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۹۸-40 of Dewan Ram comul sen, p. 40

ص ۹۸، ۴۳، ۴۴ P.

۳۔ ایضاً

کتابوں کے لیے ملاحظہ ہو فورٹ ولیم کالج ص ۹۰-۱۹۶

۴۔

۱۸۰۸ء میں طبع ہوئی۔

(۲) ہندوستانی عربی، فارسی اور پنجابی کہاوتوں کا انتخاب۔

(۳) عہد نامہ جدید۔ مرزا محمد فطرت نے انجیل کا ترجمہ کیا تھا۔ ہنٹر نے اس کا مقابلہ گریک ترجمے سے کیا اور اس کی تصحیح کر کے "عہد نامہ جدید" کے نام سے ۱۸۰۵ء میں اپنے پریس سے شائع کیا۔

۴۔ ولیم پرائس: (William Price)

پرائس کی ولادت ۱۷۸۰ء میں ہوئی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہندوستان آنے کے بعد یکم فروری ۱۸۰۷ء کو اس کا پہلا تقرر بنگال کی پانچویں ریجنٹ میں لفٹنٹ کے عہدے پر ہوا۔ ۱۱ جولائی ۱۸۲۳ء کو اسے کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۲۳ اپریل ۱۸۳۱ء کو وہ میجر ہو گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں اس کا تقرر اکتوبر ۱۸۱۳ء میں آٹھ سو روپے ماہوار پرسنکرت، بنگلہ اور ہندوستانی کے اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اپریل ۱۸۲۱ء میں وہ فارسی کا ممتحن اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو شعبہ ہندوستانی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ کالج کی ملازمت کے دوران اسے فوجی بھتہ بھی ملتا رہا۔ جارج اسمتھ کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ پرائس نے ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔ کیونکہ وہ ۱۸۳۱ء تک ہندوستانی شعبے سے وابستہ رہا ہے۔ اس نے دسمبر ۱۸۳۱ء میں کمپنی کی ملازمت سے علاحدگی کے لیے درخواست دی، جسے منظور کر لیا گیا۔ گمان غالب ہے کہ اس کے بعد وہ لندن چلا گیا، جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

لہذا یہ:

(۱) کھڑی بولی اور انگلش کا لغت۔ یہ ۱۸۱۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی سو جہازیں فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں رکھی گئی تھیں۔

(۲) *Hindee And Hindoostanee Selections which Are* (۲)

۱۔ *By Smith, concise Dictionary of National Biography P. 1070*

۲۔ وارنٹ، فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۲

۳۔ *concise Dictionary of National Biography P. 1070*

۴۔ لکشمی ساگر وارنٹ، فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۲

Printed, The Rudiments of Hindoostanee And Brij Bhakha Grammas.

اس کی ترتیب قدوین میں تاریخی چرن مہتر نے بھی مدد کی تھی۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھی جو ۱۸۲۷ء
میں شائع ہوئی۔ یہ ہندی اور اردو کے شہ پاروں کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔
(۳) پریم ساگر کا لغت۔ یہ ۱۸۱۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔
(۴) سبھا بلاس کی ترتیب۔ ۱۸۲۸ء
(۵) چھتر سال کی ترتیب ۱۸۲۹ء
اس کے علاوہ پراپس نے محمد صالح کے قواعد کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے ۱۸۲۳ء میں
شائع کیا تھا۔

(ب) ممتاز ہندوستانی مصنفین

۱۔ میر بہادر علی حسینی:

فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفوں کی طرح بہادر علی نے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں
اپنے حالات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ محمد یحییٰ تنہا، رام بابو سکسینہ، اور مولوی مید محمد کے علاوہ
جاوید نہال اور وحید قریشی نے بہادر علی کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن ان کی تحریروں سے بھی ان کے حالات
زندگی پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ واقعات کی کڑیاں ملانے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ
ان کا آبائی وطن سبزدار (ایران) تھا۔ مغل شہنشاہوں کے جاہ و جلال اور داد و دہش کے قصے
سن کر ایران اور افغانستان کے ارباب کمال و صاحبان علم جوق در جوق ہندوستان آ رہے
تھے۔ حسینی کا خاندان بھی اسی سلسلے سے ترک وطن کر کے دلی یا مضافات دلی میں آباد ہو گیا
تھا۔ ان کے آباؤ اجداد حصول معاش کی خاطر بہار اور بنگال کی خاک چھاتے پر مجبور ہوئے۔

حسینی دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تقریباً
۴ مئی ۱۸۰۱ء کو عمل میں آیا تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے "گل کرست اور اس کا عہد" میں کالج کونسل کی

لے وارثتے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

کاروانی مورخہ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کے حوالے سے ہندوستانی شعبے میں چودہ منشیوں کا ذکر کرتے ہوئے
 حسینی کا نام سرفہرست درج کیا ہے۔ لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۰-۱۹۸ پر موصوف نے ^{منشیوں} ۲۲
 کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ان کے تقرر کی تاریخ ۲۷ مئی ۱۸۰۱ء ہی لکھی ہے، اور لطف یہ کہ
 ان دونوں مقامات پر ان کی تنخواہ بھی الگ الگ درج ہے۔ صفحہ ۱۲۳ پر ان کے ماہانہ مشاہرے
 کی رقم دو سو روپے اور صفحہ ۱۹۸ پر محض اسی روپے بتائی گئی ہے۔ عتیق صاحب کے بیانات کا یہ
 اختلاف نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کالج کونسل نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۲ء کو انکی
 منصبی حیثیت گھٹا کر ان کی خدمات چیف منشی کے عہدے سے مترجم کے عہدے پر منتقل کر دی تھی۔
 لیکن جون ۱۸۰۵ء تک ان کی تنخواہ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ اسکے بعد ان کی تنخواہ اسی روپے ماہوار کر دی گئی تھی۔
 ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ ”فروری ۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ کے جانے کے
 بعد یاتو بہادر علی حسینی ملازمت سے الگ ہو گئے یا ان کا انتقال ہو گیا۔ کیونکہ کیپٹن موٹ نے ۱۶ ستمبر
 ۱۸۰۵ء کو اپنے شعبے کے منشیوں کی جو تفصیل کالج کونسل کو بھیجی تھی اس میں بہادر علی کا نام بھی شامل
 ہے۔ جاوید نہال نے روبک کے حوالے سے لکھا ہے کہ بہادر علی دسمبر ۱۸۰۸ء تک کالج سے سبکدوش
 ہو گئے۔ لیکن ریٹائر ہونے کے باوجود ۱۸۱۶ء تک غیر سرکاری طور پر کالج سے وابستہ رہے اور تہمتوں پر
 نظر ثانی کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے اور کب انتقال کیا اس کے بارے میں کچھ
 معلوم نہیں ہو سکا۔

میرامن اور سید منصور علی میر بہادر علی ہی کی وساطت سے کالج میں ملازم ہوئے تھے۔ میرامن
 سے ان کا یار نہ تھا اور منصور علی ان کے قرابت داروں میں تھے۔

۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہدہ ص ۱۲۳۔ ۲۔ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۶۵

۳۔ ایضاً ص ۶۶

۴۔ مقدمہ اخلاق ہندی ص ۹

۵۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۶۹-۶۸

Roobuck, Annals of The Fort William college Appendix ۵۱

P. 51

بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۸

تصانیف : —————

(۱) نثر بے نظیر۔ یہ بحر البیان کا نثری خلاصہ ہے، جو ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا۔ یہ ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کلکتہ ہی سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔

(۲) اخلاق ہندی۔ مہوپدیش (سنسکرت) کا ترجمہ تاج الدین نے فارسی میں "القلوب" کے نام سے کیا تھا۔ گل کرسٹ کی فرمائش پر حسینی نے ۱۸۰۲ء میں اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ اخلاقیات کی بہترین کتاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۲ء میں اور ۱۸۰۳ء میں دوسرا ایڈیشن فارسی خط میں شائع ہوا تھا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) تاریخ آسام (آسام)۔ یہ شہاب الدین طالش کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا۔ یہ ابھی تک، زیور الباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس میں ۱۶۶۲ء میں آسام پر اورنگ زیب کے مشہور جنرل میر جملہ کی یلغار آسام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) رسالہ گل کرسٹ۔ حسینی نے گل کرسٹ کی قواعد کا خلاصہ اردو میں تیار کیا، جو رسالہ گل کرسٹ کے نام سے بہت مشہور ہوا۔ یہ پہلی بار ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

(۵) نقلیات یا نقلیات ہندی (دو جلدوں میں) یہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں رومن، فارسی اور ناگری خطوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۰۸ نقلیں ہیں۔ اس کی دوسری جلد صرف فارسی اور ناگری میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۱۹۲ نقلیں درج ہیں۔

اس کے علاوہ بہادر علی حسینی نے قرآن کے ترجمے اور نقلیات اقامی کی ترتیب میں بھی مدد کی تھی۔ ان کتابوں کے سلسلے میں ان کی بہتر کارکردگی پر ان کے بے انعام کی بھی سفارش کی ہے۔

۲۔ میر شیر علی افسوس :

میر شیر علی نام، تخلص افسوس۔ ان کے خاندان کا سلسلہ حضرت جعفر صادق سے ملتا ہے اسی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ جعفری بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن خاف تھا، ان میں ایک بزرگ عالم الدین خانی ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور اگرہ کے قریب قصبہ نارول

کو اپنا مستقر بنایا۔ لیکن افسوس کے داد اسید غلام مصطفیٰ اپنے اہل و عیال کے ساتھ محمد شاہ کے عہد میں دلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے انڈیا آفس لائبریری کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست کے حوالے سے افسوس کا سال ولادت ۱۷۳۶ء درج کیا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر قلب علی خاں فاتی نے خود افسوس کے بیان اور دوسرے باوثوق ذرائع سے ان کا سال پیدائش ۱۷۴۷ء متعین کیا ہے۔ افسوس کے داد اسید غلام مصطفیٰ اور والد چچا اسید علی مظفر خاں اور اسید غلام علی خاں عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی سرکار سے وابستہ تھے۔ ان کے چچا نے اپنی عمدہ کارکردگی اور معاملہ فہمی کی بدولت بڑی ہمت و توقیر حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ جب عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ۱۷۶۶ء میں انھیں صوبہ الہ آباد کا نائب مقرر کیا گیا۔ اسید غلام علی خاں کی موت کے بعد افسوس اور ان کے والد تلاش معاش کی غرض سے ۱۷۵۷ء میں عظیم آباد پہنچے۔ یہاں میر محمد جعفر خاں نے ان کے والد کو توپ خانے کا داروغہ مقرر کیا۔ اس وقت افسوس کی عمر غالباً دس برس کی تھی۔ میر محمد جعفر کی شہادت کے بعد یہ ملازمت ختم ہو گئی اور وہ پڑتہ ہی میں کسی کے یہاں ملازم ہو گئے۔ البتہ ۱۷۶۳ء میں علی مظفر خاں نے روزانہ کی ٹرائیوں سے تنگ آکر افسوس کو لکھنؤ روانہ کر دیا۔ اس کے بعد نواب بقار اللہ خاں نے انھیں لکھنؤ بلا کر شجاع الدولہ کی سرکار میں تین سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر ان کا تقرر کر دیا۔ افسوس کے لکھنؤ پہنچنے کے دو سال بعد وہ وہاں پہنچے تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد اسید علی مظفر خاں دکن چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں افسوس نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور تفتن طبع کے لیے کبھی کبھی وہ شعر بھی کہنے لگے۔ خدا نے شاعرانہ طبیعت و دلچت کی تھی اس لیے جلد ہی اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ یہ زمانہ لکھنؤ میں شعر و شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ میر۔ سودا

۱۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰

۲۔ ملاحظہ ہو مقدمہ آرائش مخمل ص ۱۸-۲۷

۳۔ کلب علی خاں ایضاً ص ۲۱

۴۔ مرزا علی لطف، گلشن ہند ص ۵۷-۵۶

جرات اور انشاء جیسے مسلم الثبوت اساتذہ ادبی محفلوں کی رونق بنے ہوئے تھے۔ افسوس نے کچھ دنوں تک میر اور سودا سے بھی اصلاح لی تھی۔ لیکن میر حیدر علی حیراں اور میر سوز کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذتہ کیا۔ ۱۷۷۲ء میں شجاع الدولہ کے بھتیجے سالار جنگ کی اتالیقی اختیار کی۔ ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک سالار جنگ کی سرکار سے وابستہ رہے۔ اس دوران ان کے بڑے بڑے مرزا نوازش علی خاں کے مصاحب بھی رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوران افسوس نے اپنا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اس دیوان میں چونکہ گل کر سٹ، کرنل اسکاٹ، بارلو اور کالج کے دوہے افسر کی مدح میں قصیدے شامل ہیں اس لیے زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ اس کی ترتیب کا کام کالج کی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں انجام پذیر ہوا ہوگا۔

۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۵ء تک افسوس کا قیام فیض آباد اور لکھنؤ میں رہا۔ ۱۷۸۲ء میں شاہزادہ جواں بخت جہاں دارشاہ لکھنؤ آیا۔ اس نے افسوس کا کلام سنا اور بہت پسند کیا۔ چنانچہ شاہزادہ نے افسوس کو اپنی سرکار سے وابستہ کر کے ”بہ عہدہ شاعری“ سرفراز کیا۔ ۱۷۸۴ء میں جب شاہزادہ بنارس جانے لگا تو افسوس کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔ ۱۷۸۶ء سے ۱۷۸۸ء تک افسوس بنارس ہی میں رہے۔ جواں بخت جہاں دارشاہ کی موت (۱۷۸۸ء) کے بعد افسوس بنارس سے لکھنؤ واپس چلے آئے اور یہاں آکر انھوں نے حسن رضا خاں کی مصاحبت اختیار کی اور فکر معاش سے بے نیاز ہو گئے۔ اس بے فکری نے انھیں درس و تدریس کی طرف مائل کیا۔

حسن رضا خاں کی موت کے بعد فخر الدین احمد خاں نے افسوس کا تعارف کرنل اسکاٹ سے کرایا۔ اس نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے لیے منتخب کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ کالج میں ان کی تقرری، ۱ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو بحیثیت مترجم کے دو سو روپے ماہانہ تنخواہ پر ہوئی تھی۔ کلکتہ آنے وقت انھوں نے کچھ دنوں تک پٹنہ میں مرزا علی لطف کے یہاں بھی قیام کیا تھا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ افسوس نے انھیں بھی کلکتہ آنے کی دعوت دی ہو اور وہ ان ہی

۱۔ سید محمد، ارباب نشر اردو ص ۱۰۶، اور عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۲

۲۔ کلب علی خاں فائق، مقدمہ آرائش محفل ص ۲۶

۳۔ عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۲ کا تثنیہ

کی ترغیب پر کلکتہ آئے ہوں۔ کیونکہ لطف نے "گلشن ہند" میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ افسوس دسمبر ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد گل کرسٹ نے "گلستان" کے ترجمے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس کا اردو ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا اور اسی سال شائع ہوا۔ اس کے بعد تصحیح کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ عبیدہ بیگم نے ان ہی کے حوالے سے ان کی تصحیح شدہ کتابوں میں نثر بے نظیر، قصہ گل بکاولی، مادھونل، توتا کہانی، آرائش محفل اور باغ و بہار کو شامل کیا ہے۔
۱۷ اکتوبر ۱۸۰۲ء کو نسل نے بہادر علی کو میر منشی کے عہدے سے ہٹا کر مترجم کے منصب پر مامور کر دیا اور اسی تاریخ کو افسوس ان کی جگہ ہید منشی مقرر ہوئے۔ بیل اور نظامی بدایونی کا یہ خیال درست نہیں کہ افسوس کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا، اور نہ اکبر حیدری کا شمیری کی یہ اطلاع درست ہے کہ وہ ۱۸۰۸ء میں فوت ہوئے۔^{۱۵} ان کے انتقال کی صحیح تاریخ ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء ہے۔^{۱۶} کہا جاتا ہے کہ افسوس جتنے اچھے نثر تھے اس سے کہیں اچھے شاعر تھے لیکن یہ حیثیت شاعر نہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ ان کی شہرت و اہمیت کا تمام تر دار و مدار ان کی نثری تصانیف پر ہے، جن کی تفصیلات سطور ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) باغ اردو۔ یہ سعدی کی شہرہ آفاق کتاب "گلستان" کا نثری ترجمہ ہے جو کالج کے لٹریچر کے لٹریچر میں بھی شامل تھا۔ "احوال رسم خط" کے عنوان سے افسوس نے اس میں گل کرسٹ کے رسالے "رسم خط" اور اعراب کا خلاصہ بھی شامل کیا ہے۔ مقدمے میں سعدی کے اور اپنے حالات لکھنے کے علاوہ دلزلی

۱۷ دیپاچہ آرائش محفل (قن ص ۳) بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۲ لیکن کلب علی خان فائق نے محض بہادر نیش، قصہ گل بکاولی (مذہب عشق) نثر بے نظیر اور نقلیات لقماتی کے نام ہی تصحیح شدہ کتابوں میں شامل کیے ہیں۔ (مقدمہ آرائش محفل ص ۳۵)

۱۸ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۴۵

۱۹ An oriental Biographical Dictionary p. 35

۲۰ قاموس المشاہر ص ۸۷

۲۱ تحقیق نوادر ص ۲۲۵

۲۲ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۸۲

اور گل کر سٹ کی مدح سرانی بھی کی ہے۔ یہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

(۲) آرائش محفل۔ یہ منشی سبحان رائے بھنڈاری کی تصنیف، خلاصۃ التواریخ (فارسی) کے ایک حصے کا آزاد اردو ترجمہ ہے، افسوس نے اسے ۱۸۰۵ء میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن ۱۸۰۸ء تک اس میں اضافے کرتے رہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف ریاستوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ تاریخ و جغرافیہ جیسے خشک موضوع سے متعلق ہونے کی وجہ سے بعض جگہ اس کی عبارتیں بے کیف ہو گئی ہیں۔ اسے ۱۸۰۸ء میں شائع کیا گیا۔

ان کتابوں کے علاوہ افسوس نے ایک اردو دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے، جس میں ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے آخری حصے میں ارباب کالج کی مدح میں متعدد قصیدے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے "تعلیقات لقمانی" کی ترتیب میں بھی مدد کی تھی اور مرزا رفیع سودا کا کلیات بھی مرتب کیا تھا جو ہندوستانی پریس سے شائع ہوا۔

(۳) تاریخی چرن متر:

رام بابو سکسینڈ، سید محمد اور نادام سیتا پوری نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں کے ضمن میں تاریخی چرن کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ کالج کے منشیوں میں وہ چھوٹے نمبر پر تھے اور ۱۸۰۶ء کے اواخر میں چیف منشی مقرر ہو کر پہلے نمبر پر آ گئے تھے۔ تاریخی چرن اس عہدے پر اس وقت تک برقرار رہے جب تک کہ کالج میں منشیوں کے عہدے قائم تھے۔ اس اعتبار سے انھوں نے کالج کی سب سے زیادہ خدمات انجام دیں۔

تاریخی چرن کی ولادت ۱۷۷۲ء میں ضلع ہوگلی کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے بزرگ دربار علیہ سے وابستہ تھے اس لیے ان کے خاندان میں عربی و فارسی کی تعلیم کا رواج تھا۔ اسی روایت کے تحت تاریخی چرن کی تعلیم ابتداً بھی فارسی سے ہوئی تھی۔ انھیں فارسی، اردو، بنگالی اور سنسکرت زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ اپنے اس تبحر علمی کی بدولت وہ ۲۵ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کے ہندستانی شعبے میں سو روپے ماہوار مشاہرے پر نائب منشی مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر تقریباً ایک سال تک رہے۔ تاریخی چرن کے نام کی سفارش شعبہ بنگلہ کے معلم دلیم کیری نے کی تھی۔ شہر علی افسوس کے

لے جاوید نہال، انیسویں صدی میں بنگال کا ادب ص ۲۸۰

انتقال کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۰۹ء کو انھوں نے چیف منشی کا عہدہ سنبھالا۔ اور لگ بھگ اکیس برس تک اس عہدے پر برقرار رہے۔ فروری ۱۸۳۰ء میں جب کالج کے پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیے گئے تو سو روپے ماہوار ان کی پنشن مقرر ہو گئی۔ پنشن کے کاغذات میں ان کا بوجھلیہ درج کیا گیا تھا اس کا ذکر فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کے ضمن میں کہا جا چکا ہے۔

تاریخی چرن فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دوسرے علمی و ادبی اداروں سے بھی متعلق رہے مثلاً "اسکول بک سوسائٹی" کلکتہ کے قیام کے بعد وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے اور جب تک کلکتہ میں ان کا قیام رہا وہ برابر اس عہدے پر متمکن رہے۔ وہ "دھرم سبھا" کے بھی نہ صرف رکن بلکہ روح رواں تھے۔ پنشن کے بعد تاریخی چرن مہاراجہ کاشی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ڈی ٹی کی اطلاع کے مطابق ۱۸۳۴ء میں وہ اسکول بک سوسائٹی کے سکریٹری تھے، لیکن شانتی رجن بھٹا چاریہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۴ء میں وہ کاشی کے مکشتر تھے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء میں کاشی آتے وقت انھوں نے اسکول بک سوسائٹی سے استعفادے دیا ہوگا، کیوں کہ اس زمانے میں کسی انجن یا سوسائٹی کے سکریٹری کے لیے اس شہر میں مستقل سکونت اشد ضروری تھی، جہاں اس کا دفتر ہوتا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں کاشی ہی میں تاریخی چرن کا انتقال ہو گیا۔

تصانیف:

(۱) یورٹس برکھیا۔ یہ کتاب جو اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے، سنسکرت سے آسان اردو میں ترجمہ کی گئی ہے اور ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کا بنگلہ ترجمہ ہری پرشاد نے کیا۔

۱۔ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۸۲

۲۔ یہ انجن، جنوری ۱۸۳۰ء کو وجود میں آئی تھی۔ اس کا مقصد "ستی پر تھا" کو قانونی حیثیت دلانا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ انجن راجا رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ایک مورچے کے طور پر قائم کی گئی تھی۔

۳۔ گارساں ہندوئی ساہتیہ کا اتہاس، مترجم لکشمی ساگر وارشنے ص ۹۳

۴۔ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۱۸۶

۵۔ ایضاً ص ۱۹۳

(۲) نقلیات لقمانی۔ یہ کتاب *Aesop's Fables* اور دوسرے قدیم قصوں کا انگریزی سے ہندستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگلہ اور سنسکرت زبانوں میں ترجمہ کی ہوئی چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے، جو گل کرسٹ کے حسب فرمایش اور ان ہی کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا تھا۔ یہ قصے رومن رسم خط میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے مرتبین میں تارنی چرن کے علاوہ مولوی امانت اللہ، پنڈت سدھ سنگھ، بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس لولال کوی اور غلام اشرف شامل تھے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سامنے انعام کے لیے شعبہ ہندوستانی کی تصانیف کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں ”نقلیات لقمانی“ کے مترجمین کے متعلق لکھا تھا کہ ”ان میں شروع کے تین اشخاص (تارنی چرن، امانت اللہ اور سدھ سنگھ) خاص طور سے صلے کے مستحق ہیں، کیوں کہ بنگالی، عربی اور سنسکرت ترجمے کا بار ان ہی کے کندھوں پر تھا اور زیادہ بوجھ تارنی چرن مسر پر پڑا۔ اسے اس بیان سے ان حکایات کے ترجمے کے سلسلے میں تارنی چرن کی کارکردگی کی نوعیت اور اہمیت دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال نے ”نقلیات ہندی“ کو غلطی سے ”نقلیات لقمانی“ سمجھ کر اس کے متعلق لکھا ہے کہ ”یہ فارسی دیوناگری اور رومن لپیوں میں شائع ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں صرف رومن رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ فارسی یا دیوناگری رسم خط میں اس کی اشاعت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۱۸۰۳ء کی متذکرہ بالا اشاعت کے شروع میں گل کرسٹ کا لکھا ہوا ایک بسط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کا انگریزی نام ”*The oriental fabulist*“ ہے۔

(۳) خلاصہ الحساب۔ اس کی اشاعت کے لیے کالج کونسل نے ۱۸۱۰ء کو ۱۲۳۵ روپے کی منظوری دی تھی۔ یہ روشن علی انصاری جو پوری کے اسی نام کی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس کی تصحیح و نظر ثانی میں جان علی اور غلام اکبر بھی شامل تھے۔

Proceeding of The college of Fort William P. 97

بحوالہ ہماری زبان دہلی مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۱ء اور گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۷۰

۱۷۰ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۸۱

۱۷۰ عبیدہ بیگم کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ ۱۲۲۵ روپے تارنی چرن کو دیے گئے۔ (نورولیم کالج کی ادبی خدمات)

(۴۱) گولا ادھیائے۔ یہ ہندی کی ایک نصابی کتاب ہے جو درجہ پنجم کی ضروریات کے پیش نظر ترتیب دی گئی تھی اور ۱۸۲۷ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہو چکی ہے۔

(۵۱) کھڑی بولی کی کہانیاں۔ کہانیوں کے اس مجموعے کو روک نے ترتیب دینا شروع کیا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد اسے مسر نے مکمل کیا۔

علاوہ بریں تارنی چرن نے کالج کی جن دوسری کتابوں کی ترتیب و تدوین میں مدد دی تھی ان میں بے تال پچھپی، اور ولیم ہسٹر کی لغت بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ڈاکٹر گیان چند نے ”حکایات نصیحت آموز“ کو بھی شامل ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۸۱۹ء میں اور دوسری جلد ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ مرزا کاظم علی جوآں

جوآں بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن میر شیر علی انوس کی طرح انھیں بھی شاعری کے میدان میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جبکہ نثار کی حیثیت سے وہ کافی مشہور ہیں۔ ان کا اصل نام حسن علی خاں تھا۔ ان کی زندگی کے بیشتر تر حالات ابھی تک صیغہ راز میں ہیں۔

کاظم علی دلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن احمد شاہ ابدانی کے حملوں میں دلی کی تباہی کے بعد جب ہر روز ارباب فضل و کمال کا ایک نیا قافلہ پورب کی طرف روانہ ہونے لگا تو یہ بھی ترک وطن کر کے فیض آباد چلے آئے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سیف الدولہ کی مصائب اختیار کی لیے اس کے بعد وہ لکھنؤ پہنچے۔ اس سفر کا سال نامعلوم ہے۔ البتہ مولوی کریم الدین کے بیان سے جنھوں نے ۱۱۹۴ھ/۱۸۲۱ء میں انھیں لکھنؤ میں دیکھا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل یہاں پہنچے چکے تھے۔ یہ اسلم قریشی کے بیان کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے لیے جوآں اور منظر علی خاں و لا دونوں کا انتخاب ایک ساتھ ۱۰ نومبر ۱۸۰۰ء کو لکھنؤ ہی میں ہوا تھا۔ ان دونوں کا تقرر کرنل اسکاٹ رزیدنٹ لکھنؤ نے اسی روپے ماہوار پر کیا تھا۔ جوآں جنوری ۱۸۰۱ء میں گلگت

۱۔ مصحفی، تذکرہ ہندی ص ۱۷ اور سعادت خاں ناصر تذکرہ خوش معرکزیا ص ۱۹۲

۲۔ بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۲۲۳

۳۔ مقدمہ شکستہ ص ۱۸

پہنچے اور اپنی تقرری کا پروانہ پیش کیا۔ اس کے دوسرے ہی دن "شکنتلا" کی تحریر کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ وہ حین حیات کالج سے وابستہ رہے۔ پروفیسر جاوید نہال کا یہ خیال سرسہر خلاف واقعہ ہے کہ جوآن کا انتقال ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۵ء کے درمیان ہوا۔ وارث نے فورٹ ولیم کالج کے کاغذات کے حوالے سے ان کے انتقال کی تاریخ ۳ جولائی ۱۸۱۶ء متعین کی ہے۔ ٹیلر (ہندوستانی شعبے کے پروفیسر و صدر) نے ان کی بیوہ اور اولاد کے لئے پنشن کی سفارش کی تھی لیکن کونسل نے اسے منظور نہیں کیا۔

جوآن کو شکنتلا اور قرآن کے ترجمے پر سو سو روپے اور سنگھاسن بنیسی اور بارہ ماسا نا تصنیف پر دو سو سو روپے کا انعام ملا تھا۔ ان کے دو بیٹے مرزا قاسم علی ممتاز اور ہاشم علی عیاش اچھے شاعر تھے لیکن وہ دونوں باپ کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ رائے بینی ناراین نے "دیوان جہان" میں جوآن اور ان کے دونوں بیٹوں کی غزلیں شامل کی ہیں۔

تصانیف :-

(۱) شکنتلا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جوآن کی شکنتلا کالی داس کے مشہور سنسکرت ناولگ "شکنتلا" کا اردو ترجمہ ہے، جسے ان سے پہلے نواز بھاشا (ہندی) میں ترجمہ کر چکے تھے سید محمد نے بھی اسے ڈراما کہا ہے اور ڈراما نوٹسی میں اسے اولیت کا درجہ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو جوآن کا یہ ترجمہ ناولگ کی تعریف میں آتا ہے اور نہ تو نواز کی "شکنتلا" ہی جس کی مدد سے اس قصے کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ڈرامے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ نواز کی کتاب کے بارے میں ڈی ٹی ٹی کا بیان ہے کہ "یہ کالی داس کے ڈرامے کی نقل نہیں ہے بلکہ مہا بھارت کی طرز پر لکھی گئی ہے۔"

۱۔ عتیق صدیقی، گل کر سٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۰

۲۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۸۸

۳۔ فورٹ ولیم کالج ص ۹۳

۴۔ ارباب نثر اردو ص ۲۲۸

۵۔ بحوالہ شکنتلا، مرتبہ ڈاکٹر اسلم قریشی ص ۷

۱۸۰۲ء میں ناگری لپی میں اس کے ۲۲ صفحات چھپ چکے تھے، جنہیں ہندی مینول میں شامل کر دیے گئے۔ دوسری بار ۱۸۰۲ء میں رومن رسم الخط میں گل کرسٹ نے "The Hindoo orthography" نام سے اسے شائع کیا۔ اور یہ تیسری مرتبہ ۱۸۲۶ء میں اردو خط میں لندن سے شائع ہوئی۔

(۲) سنگھاسن بتیسی۔ اس کی اصل سنسکرت ہے، جسے سندربیشور نے شاہجہاں کے عہد میں برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ گل کرسٹ کے ایما پر جوآن نے ۱۸۰۱ء میں اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے ترجمے میں للوالال نے بھی ان کی مدد کی تھی اس میں کل ۳۲ کہانیاں درج ہیں۔ یہ ۱۸۰۵ء میں ناگری لپی میں نکلنے سے شائع ہوئی، جس کے سرورق پر جوآن کے ساتھ للوالال کا نام بھی شامل ہے۔

(۳) بارہ ماسا۔ اس کا دوسرا نام "دستور ہند" بھی ہے۔ یہ نظم میں ہے۔ جوآن نے اسے ۱۸۰۳ء میں مکمل کیا تھا، اس کے نو برس کے بعد ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔ (۴) تاریخ بھینی: یہ تاریخ فرشتہ نام کی فارسی تصنیف کے سلاطین بہمنیہ سے متعلق ایک بڑے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۰۷ء ہے۔ یہ طبع نہیں ہو سکی۔ بعض مورخوں نے اس کا نام تاریخ فرشتہ ہی لکھا ہے۔

اس کے علاوہ جوآن نے میر اور سودا کے کلام کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا اور قرآن کے ترجمے میں بھی اپنے رفقاء کے کار کی مدد کی تھی۔ ڈاکٹر اسلم قریشی نے ان کی تصانیف میں "خرد افروز" کو بھی شامل کیا ہے، جو سمیح نہیں ہے۔

(۵) منظر علی خاں ولّا:-

ولّا کا اصل نام مرزا علی لطف تھا لیکن انھیں شہرت اپنے فلمی نام منظر علی خاں سے حاصل ہوئی۔ ولّا کے جد امجد آقا محمد صادق ترک نثر ادب تھے۔ وہ اصفہان (ایران) سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے بیٹے آقا محمد حسین ولّا کے دادا تھے۔ نواب سعید الدین خاں بہادر کے توسل سے آقا محمد حسین کو محمد شاہ کے دربار میں رسالہ داری اور داروغگی کا منصب مل گیا۔ اسی زمانے میں وہ علی قلی خاں کے لقب سے ملقب ہوئے ان کے بڑے صاحب

بھرتی کیا ہے۔ بہر حال اس سے ثقہ کوئی دوسری روایت نہیں ہو سکتی۔ ولاً کا بیان اس لیے بھی قابل اعتبار نہیں کہ مارچ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا وجود ہی نہیں تھا۔

کاظم علی جواں اور ولاً دونوں کا تقریباً ایک ہی دن ہوا تھا اور دونوں اپنی تقرری کا پروانہ لیے جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے تھے۔ کالج کی ملازمت سے قبل ولاً قصیدے، سلام، قطعات اور رباعیات وغیرہ کے شاعر تھے اور مشق سخن میں انھوں نے ایک عمر گزار ہی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ ”احقر مدتہا عمر عزیز را در فن ریختہ گوئی صرف نمود“^{۱۷} لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا۔

کالج میں آئے انھیں پورے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ ۳۰ اگست ۱۸۰۲ء کی کاروائی میں ولاً کو زائد از ضرورت قرار دے کر ۳۰ ستمبر ۱۸۰۲ء انھیں کالج سے علاحدہ کر دیا گیا۔ ستمبر کی تنخواہ کے علاوہ لکھنؤ تک جانے کا انھیں زاد راہ بھی دیا گیا۔ برطانی کی اس خبر نے ولاً کو فطری طور پر ذہنی اذیت اور تشویش میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ انھوں نے وطن کی مفارقت خدمت ادب سے زیادہ سکون قلب اور خوش حالی و فارغ البال کی امید میں گوارا کی تھی۔ چنانچہ اپنے سنہرے خوابوں کو بھرتے اور امیدوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے کونسل سے درخواست کی کہ ان کے معاملے پر دوبارہ غور کیا جائے اور ان کی ملازمت بحال رکھی جائے۔ ۲۴ اکتوبر کی کاروائی میں کونسل نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی اور ان کی برطانی کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔^{۱۸} جاوید نہال ولاً کو ۱۸۲۹ء تک بقید حیات قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے

”بلاشبہ ۱۸۲۹ء تک وہ کلکتہ ہی میں تھے کیوں کہ ان کے معاون بنی نرائن جہاں نے ”دیوان جہاں“ میں ولاً کو بقید حیات بنایا ہے۔“^{۱۹}

۱۷ بحوالہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۲-۱۱۔ لیکن لکشمی ساگر وارث نے ایشیاٹک انہول جبرٹ ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲) کے حوالے سے ولاً کے تقرری کی تاریخ ۲۴ نومبر ۱۸۰۱ء درج کی ہے (فورٹ ولیم کالج ص ۱۹)

۱۸ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۵

۱۹ وارث نے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۳۔ اور عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۱

۲۰ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۱۔ بنگال کار دو ادب ص ۱۸۶۔

دیوان جہاں کی بنیاد پر جاوید نہال کا یہ استنباط درست نہیں۔ نینی زاین کے اس انتخاب کا سال ترتیب ۱۸۲۹ء نہیں، ۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۷ھ ہے۔ اس وقت ولایتیاً بقید حیات تھے لیکن ۱۸۲۹ء سے برسوں قبل ان کی وفات ہو چکی تھی۔ ہندوستانی شعبے کے پروفیسر ولیم ٹیلر نے کالج کونسل کو ان کی موت کی اطلاع ۱۲ اگست ۱۸۱۶ء کو دی تھی۔ اس بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۰ یا ۱۱ اگست ۱۸۱۶ء کو فوت ہوئے ہوں گے۔

تصانیف :-

(۱) ہفت گلشن۔ یہ نام علی بلگرامی کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو سات نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۱ء۔ یہ کالج کے زمانے میں طبع نہیں ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے ۱۹۶۲ء میں پاکستان سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ برٹس میوزم لندن میں اور دوسرا نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

(۲) مادھونل اور کام کندلا۔ یہ کتاب برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں گل کریسٹ نے اس کا ایک حصہ "بیاض ہندی" میں چھاپا تھا۔ یہ ۱۹۶۵ء میں کراچی سے پہلی بار مکمل شائع ہوئی ہے۔

(۳) بے تال چکپی۔ یہ قصہ راجا بکر ماجیت کے زمانے میں سنسکرت میں لکھا گیا تھا۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں اس کا برج بھاشا میں ترجمہ ہوا۔ ولایتی برج بھاشا کے اس ترجمے کی بنیاد پر اسے ۱۸۰۱ء میں اردو میں منتقل کیا۔ ۱۸۰۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن آدوا اور ناگری سطوں میں شائع ہوا۔ چونکہ اللوالال نے اس ترجمے میں ولایتی کافی مدد کی تھی اس لیے سرورق پر ہلاک ساتھ ان کا نام بھی درج ہے۔

(۴) جہاں گیر شاہی۔ یہ "اقبال نامہ جہاں گیری (فارسی) کا ترجمہ ہے۔ ولایتی ترجمہ مونت کی فرمائش پر ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔ یہ کتاب بھی شائع نہیں ہو سکی۔

(۵) ترجمہ پند نامہ منظوم۔ یہ شیخ سعدی کی شہرہ آفاق تصنیف "پند نامہ" کا منظوم اردو ترجمہ ہے جسے ۱۸۰۲ء میں "باغ اردو" جلد دوم کے ساتھ اور ۱۸۰۳ء میں "اتالیق ہندی" میں شائع کیا گیا۔

لے بجوال فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۳

اور ۱۸۰۳ء میں یہ علاحدہ بھی شائع ہوا۔

(۶) تاریخ شیرشاہی۔ یہ فارسی تصنیف ”تحفہ اکبرشاہی“ کے تیسرے طبقے کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۵ء میں تیار ہوا۔ اس میں شیرشاہ اور ہالیوں کے زمانے کے واقعات درج ہیں۔ یہ ہنوز شائع نہ ہو سکی۔

(۷) دیوان ولّاء۔ یہ ولّاء کے اردو کلام کا مکمل مجموعہ ہے جس میں مختلف اصناف سخن میں ان کی طبع آزمائی کے نمونے شامل ہیں۔ سال تدوین ۱۸۱۰ء۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ ولّاء کی زندگی میں یہ شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے لکھا ہے کہ ”اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کر دیا ہے“۔

۴۔ میرامن :-

میرامن کے سنین ولادت و وفات کا تعین اور ان کے مکمل حالات زندگی کی دریافت ابھی تک اہل علم کے لیے ایک تحقیق طلب مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ معلومات کے فقدان کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اس طرح سے روشناس خلق نہیں تھے جس طرح کہ اپنی موت کے بعد مشہور ہوئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو اس قسم کی معلومات کے اہم ترین ماخذ ہیں، صرف شاعروں کے حالات قلم بند کیے جاتے تھے اور میرامن شاعر نہیں تھے۔ اگر وہ شاعر تھے تو مشہور نہیں ہوئے کیونکہ انھوں نے کبھی باقاعدگی کے ساتھ طبع آزمائی نہیں کی۔ البتہ اگر اتفاقاً طور پر کبھی کوئی خیال دل میں آہی جاتا تھا تو رسمی طور پر اسے نظم کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ گنج خوبی کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ

”اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بخود کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا استاد، نہ کسو کا شاگرد۔“

نشاہتوں میں اور نہ شاعر کا بھائی فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی لے
ڈی ٹاسی، کریم الدین، عنایت اللہ، نور بس، مولوی عبدالحق، مولوی یحییٰ تنہا، رام بابو سکینہ

لے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۲۵

لے گنج خوبی مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۵

سید محمد جاوید نہال کے علاوہ اور دوسرے کئی مصنفین و مورخین نے اپنی تحریروں میں میر امن کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ان کے خود نوشت حالات پر اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ شجاعت علی سندیلوی نے اندازاً ان کا سال ولادت ۱۷۲۶ء قرار دیا ہے۔ اس کے برخلاف ممتاز منگلوری کا قیاس ہے کہ وہ محمد شاہی عہد کے بالکل آخری دور میں یا اس کے بعد احمد شاہی دور میں ۱۷۲۷ء - ۱۷۵۲ء کے درمیان پیدا ہوئے۔

ممتاز حسین نے ۱۹۵۱ء میں کراچی سے "باغ و بہار" کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ نصر اللہ خاں خورجو نے میر امن کا سال وفات ۱۸۰۸ء یا ۱۸۰۹ء قرار دیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کا یہ خیال محض انداز و قیاس پر مبنی ہے۔

میر امن کی اپنی تحریروں سے ان کے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہے اس کے مطابق ان کا اصل نام میر امن تھا، اور وہ لطف تخلص کرتے تھے۔ وہ دلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ ان کے مورث اعلیٰ ہالیوں کے عہد میں دلی آئے اور دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے۔ جب دلی غارت ہوئی تو ان کے خاندان پر بھی تباہی کے بادل منڈلانے لگے چار و پنجار میر امن کو دلی چھوڑنا پڑی۔ ۱۷۶۱ء کے آس پاس وہ مح اہل و عیال کے عظیم آباد آئے اور کچھ دنوں تک وہاں قیام کیا۔ لیکن جب وہاں بھی تباہی کی صورت نہ دکھی تو ۱۷۶۹ء کے اوائل میں بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ کچھ دنوں کی بیکاری کے بعد نواب دلاور جنگ نے انہیں اپنے چھوٹے بھائی

۱۔ نیادور لکھنؤ اپریل ۱۹۱۰ء ص ۷ (۱) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، اٹھویں جلد ص ۱

۲۔ ملاحظہ ہو مقدمہ گنج خوبی ص ۷۲ ملاحظہ ہو فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۳۲

۳۔ میر امن کے بعض سوانح نگاروں نے ان کا نام میر امان اور تخلص امن لکھا ہے۔

۴۔ باغ و بہار کے خاتہ پر میر امن نے جو اشعار لکھے ہیں ان میں آخری شعر میں اپنا تخلص لطف ہی

نظم کیا ہے۔ تو کونین میں لطف پر لطف رکھ نہایا! بتی رسول کبار

(باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۲۳۶)

۵۔ ممتاز منگلوری، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھویں جلد ص ۱۷

میر محمد کاظم خاں کا تالیق مقرر کیا، لیکن وہاں بھی ان کا دل نہ لگا۔ اس کے دو سال کے بعد میر بہادر علی
کی وساطت سے گل کر سٹ تک ان کی رسائی ہو گئی، جس کی جوہر شناس نگاہ نے انھیں کالج کی ملازمت
کے لیے منتخب کر لیا۔

کالج کے ہندوستانی شعبے میں میر امن کا تقرر چالیس روپے ماہوار پر ماتحت منشی کی حیثیت
سے ۲۷ مئی ۱۸۰۱ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد گل کر سٹ نے ”چار درویش“ کے ترجمے
کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس کے قبل حسین ”نور زم صبح“ کے نام سے اس کا ترجمہ کر چکے تھے چنانچہ
میر امن نے اپنے ترجمے کے وقت فارسی تصنیف ”چار درویش“ کے علاوہ ”نور زم صبح“ کو
بھی پیش نظر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے ترجمے میں حسب ضرورت حذف و اضافہ سے بھی کام لیا
ہے۔ عتیق صدیقی نے بلوم ہارٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”چار درویش“ ۱۸۰۱ء میں مکمل
ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد بھی کی جا چکی تھی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر دوسری کتابوں
کے ساتھ اس کی اشاعت بھی روک دی گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر امن نے
اس کے سودے پر نظر ثانی کر کے اس کو ”باغ و بہار“ بنایا اور اس مناسبت سے اس کا سزا لیف
۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار پایا۔ ۱۸۰۲ء میں اس کے کچھ حصے کا ترجمہ گل کر سٹ نے ”ہندن مینول“
میں چار درویش کے نام سے شائع کیا تھا۔ پوری کتاب باغ و بہار کے نام سے ہندوستانی پریس
کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ باغ و بہار کی تکمیل کے بعد میر امن نے اپنی اس کوشش
پر مناسب صلہ و انعام کا مطالبہ کرتے ہوئے کالج کونسل کو لکھا تھا کہ

”صاحبان والا بچنیوں کے قدر والوں کو خدا سلامت رکھے! اس بے وطن نے حکم
اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصے کو ہزار جہد و کد سے اردوئے محلا کی زبان
پیرا بارغ و بہار بنایا۔ فضل الہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سر بہر ہوا۔
اب امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا گنجینہ دل مانند گل کے کھلے ہوئے

۱۔ دارشے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

۲۔ گل کر سٹ اور اس کا عہدہ ص ۱۵۲۔ خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ گنج خوبی ص ۱۱۱

۳۔ بحوالہ باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۷

گل کرسٹ نے ان کی یہ درخواست اپنی سفارش کے ساتھ ۶ جون ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کی خدمت میں پیش کی جس نے ۱۲ جون کے اجلاس میں ان کے لیے پانچ سو روپے بطور انعام منظور کیے۔
 ”باغ و بہار“ کی تکمیل کے بعد میرامن نے مشہور فارسی تصنیف ”اخلاق محسنی“ کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس ترجمے کا نام انھوں نے ”گنج خوبی“ رکھا۔ یہ کام ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء سے قبل مکمل ہو چکا تھا۔ کیونکہ ۱۹ اگست کو گل کرسٹ نے کالج کونسل کے سامنے ہندوستانی مصنیفین کی تصانیف کی جوہرست پیش کی تھی اور ان میں جن کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا ان میں میرامن کی ”گنج خوبی“ کا نام چار سو روپے کی سفارش کے ساتھ موجود ہے۔ یہ زمانہ گل کرسٹ اور کالج کونسل کے درمیان تصادم کا زمانہ تھا، چنانچہ اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن ۳۱ اگست ۱۸۰۳ء کی کارروائی کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل نے اس کتاب پر ڈھائی سو روپے انعام دینا منظور کیا تھا۔^۳

میرامن ۲ جون ۱۸۰۶ء کو اس بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیے گئے کہ انھوں نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ برطرفی کے وقت ان کو چار مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی دی گئی تھی۔ اس سلسلے کی وضاحت ڈاکٹر شجاعت علی کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے۔

”۴ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میرامن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے۔ میرامن کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے، الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرائے سالی اور جسمانی مخدوری کا انھوں نے عذر پیش کیا۔ انشاء بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میرامن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینے کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمت سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔“^۴

۳ دارشنتے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۲-۵۳

۴ ایضاً ض ۱۸۸

۵ خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ گنج خوبی ص ۲۱ء بحوالہ نیا دور، اپریل ۱۹۸۰ء ص ۶

اس طرح میرامن کالج سے پانچ سال ایک مہینہ وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ کلکتہ ہی میں رہے یا کہیں اور چلے گئے اس سلسلے میں تمام ذرا لٹ معلومات خاموش ہیں۔ یہ کبھی معلوم نہیں کہ اس وقت ان کے متعلقین کلکتہ میں تھے یا پٹنہ میں؟ گمان غالب یہ ہے کہ ملازمت ملنے کے بعد انھوں نے اپنے اہل و عیال کو کبھی پٹنہ سے کلکتہ بلا لیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیرائے سال کے باعث انھوں نے زندگی کے باقی ایام وہیں گزار دیے ہوں۔ ان کے کثیر الاولاد ہونے کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے کسی لڑکے کا کوئی کارنامہ تو درکنار نام بھی سننے میں نہیں آیا۔

تاریخ ادب اردو میں میرامن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھیں اگر اردو کی نئی نثر کا موجد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو شاعری پر جو احسان میر اور غالب نے کیا ہے، اتنا ہی بڑا احسان میرامن کا اردو نثر پر ہے۔

میرامن دلی کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے وطن ہی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت بھی وہیں پائی اور عمر کا بڑا حصہ بھی وہیں گزارا۔ اس لیے زبان کی سلاست و سادگی اور صفائی و شستگی جو دہلوی ادیبوں اور شاعروں کا طرہ امتیاز ہے، میرامن کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھوں نے صرف دلی کی شان و شوکت ہی نہیں دیکھی تھی، اس کی تباہی و بابرہی کے مناظر بھی ان کی نگاہوں سے گزرے تھے۔ دلی کو خیر باد کہنے کے بعد انھیں عظیم آباد اور کلکتہ کی خاک چھاننا پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سفر میں انھیں ہر کس و ناکس سے گفت و شنید کا موقع ملا ہوگا۔ اپنے اسی وسیع تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہندوستان کی عوامی زبان کے نشیب و فراز سے واقف ہوئے اور انھیں ایک ایسے اسلوب کے اختراع میں کامیابی ہوئی جو سادگی و پرکاری کے امتزاج کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ ہر واقعے کو نہایت نپے تلے انداز اور عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں، جس سے عبارت میں روانی، ترنم اور توازن پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی روانی و ترنم کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے کبھی کبھی قواعد کے مسلم اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ تقریباً دو صدیاں گز جانے کے باوجود آج بھی ”باغ و بہار“ کی زبان اس باغ و بہار کیفیت کی حامل ہے کہ اس کے پڑھنے والے سردھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے بقول ”میرامن نے بلاشبہ وہ نئی نثر ایجاد کی جن کے جلے آج بھی مصر کی ڈلیاں اور شربت کے گھونٹ (معلوم ہوتے) ہیں“۔ لہ

تصانیف :-

(۱) باغ و بہار۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے اس خیال سے ہمیں اتفاق نہیں کہ ”میر امن اپنی تصانیف نشر“ باغ و بہار“ اور ”گنج خوبی“ کی وجہ سے مشہور ہیں۔۔۔ ہمارے خیال میں اگر میر امن ”گنج خوبی“ نہ بھی تصنیف کرتے تب بھی ان کی مقبولیت میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ ڈاکٹر ”ناچند جین کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ”باغ و بہار“ مسلم طور پر اردو نثر کی بہترین داستان ہے۔ متوسط حجم کے اس قصے میں دل چسپی کی کمی نہیں (اور میر امن کا سہل ممتنع اسلوب اس کے حیات ابدی کا ضامن ہے۔“ ۱۸۰۳ء سے اب تک باغ و بہار کے تقریباً سینکڑوں ایڈیشن اردو، ناگری اور رومن رسم خط میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان تو خیر اردو کا مولد و منشا ہے انگلینڈ اور پیرس میں یہ کئی بازار یورطباع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

”باغ و بہار“ تنقید کے مختلف مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ سب سے پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں اس کی زبان کا مذاق اڑایا۔ بعد کے زمانے میں عبداللہ یوسف علی نے بھی اس کے بارے میں کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے دلکش اسلوب، سحر آفریں انداز بیان اور زبان کے چٹخارے کی بدولت یہ ہر دور میں خواہ جوانوں دونوں سے داد تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔

”باغ و بہار“ ملک مین کے بادشاہ جوان بخت اور چار درویشوں کی فرضی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے باوصف جیتی جاگتی اور رواں دواں کہانیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا یہ سچ مچ کسی بادشاہ اور چار درویشوں کی سچی سرگزشت ہے۔ میر امن بقول خود دلی کے روڑے تھے اور وہ بھی انیسویں صدی کی دلی کے اور دہلوی ہونے پر انہیں بجا طور پر فخر بھی تھا۔ پانچ اہموں نے ”باغ و بہار“ میں اپنے زمانے کی دلی کی تہذیب و تمدن کا نقشہ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ داستان ہونے کے باوجود اس کے تمام کردار، محلات کا ٹھٹھا باٹ، شان و سلوت

۱۔ مقدمہ گنج خوبی ص 1

۲۔ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۸۰

۳۔ ملاحظہ ہو فسانہ عجائب مرتبہ سید محمد رفیع ص ۲۲

اور جاہ و چشم اور پھر میرزبانی اور ضیافت کے سلیقے وغیرہ بالکل دہلوی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ تمام افراد جن سے اس داستان میں ہمارا سابقہ پڑتا ہے اپنی وضع قطع اور ناموں کے اعتبار سے سراسر افسانوی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، لیکن داستان میں لباس اور ناموں کی اجنبیت چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تو میرامن کا اعجاز ہے کہ انھوں نے دلی کے افراد کو دوسرے ناموں سے موسوم اور دوسرے لباسوں میں ملبوس کر کے ان سے نہایت ہی کامیاب رول ادا کرایا ہے۔ پرفیور گیان چند چین رقم طراز ہیں۔

”چار درویش عہدِ مغلیہ میں لکھا گیا۔ اردو ترجمہ دلی کے روڑے میرامن نے کیا۔

انھوں نے بھی دلی کا دربار دیکھا تھا، اس لیے یہ ادلی کے (عمائد کی تہذیب کے ہر شعبے سے واقف تھے، چنانچہ اس کی بھرپور مرقع کشی کی گئی ہے۔ قصوں کا وقوع

ایران میں ہو یا سسطنظیہ میں معاشرت مغلیہ دلی کی ہے۔“

باغ و بہار کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسری معام تصانیف سے ممتاز کرتی ہے محاورے

کا بر محل استعمال ہے۔ اس کا دعوا خود میرامن نے بھی کیا ہے۔ نثر جب بلوغ کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو اس میں محاورے کے استعمال کی قدرت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، لیکن محاورے

کا باسلیقہ استعمال محاورات کی بھرمار کا نام نہیں۔ حقیقتاً یہ لفظی کفایت شعاری کا ایک فنکارانہ عمل ہے جو بات میں وزن اور عبارت میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ اجتماعی یا انفرادی زندگی کا کوئی واقعہ اگر کم لفظوں میں پیش کرنا ہو تو اس کے لیے محاورے سے بہتر کوئی ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتا۔ ”باغ و بہار“ اس کی ایک زندہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

میرامن نے مسجع و مقفی جملوں سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کا یہ احتراز قطعی اور تہی نہیں، چنانچہ باغ و بہار میں کہیں کہیں مسجع کاری کے نمونے بھی موجود ہیں۔ اس مسجع کاری سے ان کے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ ”میں نے بھی ایسے محاورے میں لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔“ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی یہ کہہ کر ان کے اس دعوے کی تائید کی ہے کہ اس (باغ و بہار) میں باتیں کرنے (یا کہنے) کا انداز بالکل فطری اور قدرتی

۱۲ اردو کی نثری داستانیں ص ۸۷-۸۴ ۱۲ باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۲

ہے۔ لیکن گفتگو میں ہم قافیہ الفاظ کا استعمال عموماً بالکل غیر فطری اور غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے۔
یہ تحریری تکلف و تصنع تو ہو سکتا ہے بول چال کی زبان نہیں۔

اس کے باوجود باغ و بہار کی زبان نہ صرف اپنے زمانے کے عوام کی زبان تھی بلکہ آج کی زبان سے بھی بہت زیادہ قریب ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ”باغ و بہار“ کے مقبول انام ہونے میں زبان و بیان کی ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس قصے کو بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ باغ و بہار اگر صرف میرامن کی سحر بیانی کی وجہ سے مشہور ہوئی ہوتی تو ”گنج خوبی“ کو بھی اتنی ہی مقبولیت حاصل ہونا چاہیے تھی بلکہ اس اعتبار سے کہ ”باغ و بہار“ میرامن کے رشحاتِ قلم کا ابتدائی نمونہ ہے اور گنج خوبی ایک کامیاب تجربے کے بعد وجود میں آئی ہے، اسے اور زیادہ مقبول و مشہور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ باغ و بہار کو عوام و خواص نے جس قدر پسند کیا اس کی عشر عشر مقبولیت بھی گنج خوبی حاصل نہیں کر سکی۔

(۲) گنج خوبی۔ یہ میرامن کا دوسرا اور آخری بڑا کا نام ہے، جو ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی تصنیف ”اخلاق محسنی“ کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ۱۸۰۵ء میں پہلی بار ناگری پی میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کی حکایتیں ۱۸۵۲ء تک اخبار ”تعلیم الخلاق“ اور رسالہ ”قرآن السعد“ میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۸۷۵ء میں مطبع محبوب بمبئی نے اس کا دوسرا ایڈیشن اردو رسم الخط میں شائع کیا تھا۔ اردو رسم خط میں دوسرا اور باعتبار سلسلہ تیسرا مکمل ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے سیٹھ مقدمے کے ساتھ دلی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

گنج خوبی چالیس ابواب پر منقسم ہے جو عبادت، اخلاق، شکر، صبر و توکل، عدالت، حق، حلم، خیرات، امانت و دیانت، صدق و راستی اور اس قسم کے دوسرے موصوفات پر مشتمل ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کتاب بھی باغ و بہار سے کم نہیں کیونکہ باغ و بہار کی طرح اس کتاب میں میرامن نے بقول خود ”فقط فارسی کے ہو جو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا، اس لیے اصل کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا ہے۔“ اس کے باوجود داستان کی عجوبہ خیزی اور

۱۔ میرامن سے عبدالحق تک ص ۳۷

۲۔ گنج خوبی مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۴۲

کیف و سرور نے ”باغ و بہار“ میں دل کشی اور اثر آفرینی کی جو کیفیت پیدا کر دی ہے ”گنج خوبی“ اس سے یکسر محروم ہے۔ باغ و بہار کے برخلاف اس میں اشعار کی بھی بھرمار ہے جو بعض جگہ بالکل بے محل معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ حیدر بخش حیدری

حیدری ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، لیکن شاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ صرف تفریح طبع کے لیے وہ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا دیوان بھی مرتب نہیں کیا، لیکن اپنی تصنیف ”گلدستہ حیدری“ میں جوان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، اپنے مرثی، غزلیات اور قصائد شامل کیے ہیں۔ علاوہ بریں ان کے اشعار ان کی دیگر کتابوں میں جہاں جہاں بھرے ہوئے ہیں۔ نثر میں ان کی دو داستانیں ”تو تا کہانی“ اور ”آر ایشن محفل“ عرف ”قصہ حاتم طائی“ باغ و بہار کی طرح خوب مقبول ہوئیں۔

فورٹ ولیم کالج کے بعض مصنفین کی طرح حیدری کی زندگی کے بیش تر حالات بھی ابھی پردہ خفایں ہیں۔ مختلف ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کے مطابق ان کے مورث ^{کلا علی} نجف اشرف سے نقل مکانی کر کے دلی میں آئے تھے۔ حیدری ۸۳-۸۲ھ کے لگ بھگ ^{۶۴۹-۶۴۸} دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور دلی بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ان حالات میں ارباب کمال کے لیے نئی پناہ گاہوں کی تلاش کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ جس کے جہاں سینگھ سماتے وہ ادھر ہی چلا جاتا۔ چنانچہ حیدری کے والد سید ابوالحسن بھی مع اہل و عیال کے بنارس چلے آئے۔ اس وقت حیدری بقول خود ”نہایت خورد سال“ تھے۔^{۱۰}

سید ابوالحسن لالہ سکھ دیورائے کے ساتھ بنارس آئے تھے اور کئی سال تک ان ہی کے ساتھ بسر بھی کیے۔^{۱۱} لیکن جب ۱۷۸۱ء میں ”تذکرہ گلزارِ ابراہیم“ کے مولف نواب علی ابراہیم

^{۱۰} وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۸۱

^{۱۱} حوالہ سرماہی اردو، کراچی جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۷

^{۱۲} ایضاً ص ۶۷

^{۱۳} مختار الدین، تمہید گلشن ہند ص ۱۳

خاں خلیل بنارس کے ناظم عدالت مقرر ہوئے تو انھوں نے سید ابوالحسن کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا، اسی تعلق کی بنا پر حیدری بھی نواب صاحب کے یہاں آنے جانے لگے۔ کچھ دنوں بعد ابوالحسن نے تعلیم و تربیت کی غرض سے حیدری کو نواب صاحب کے سپرد کر دیا۔ نواب صاحب نے غلام حسین شہید کو جوان کے یہاں بچوں کی تعلیم کے لیے مامور رکھا، حیدری کا بھی اہلیق مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالرشید جون پوری بھی حیدری کو درس دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ تعلیم کے دوران انھوں نے سید جمیعت علی رضوی سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ حیدری نے اپنے ان اساتذہ میں مولوی غلام حسین شہید کی بڑی تعریف کی ہے لکھا ہے۔۔۔ "احقر نے یہ گویائی جناب فیض مآب موامی (غلام حسین) صاحب موصوف کے فیض سے پائی ہے" لیکن سب سے زیادہ جس نے حیدری کے ذہن کو صیقل کیا وہ نواب ابراہیم خاں خلیل کی ذات تھی۔ حیدری نے اپنے کو "تعلیم یافتہ مجلس نواب ابراہیم علی خاں مرحوم" کہا ہے۔

مولوی سید محمد اور ڈاکٹر جاوید نہال کے خیال کے مطابق نواب صاحب نے حیدری کو کسی معقول خدمت پر مامور کر دیا تھا، لیکن ان لوگوں کے بیانات مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر حیدری کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو گئے ہوتے تو وہ تلاش معاش میں دہن چھوڑ کر کلکتہ کا سفر گوارا نہیں کرتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے شعرا و ادبا کا انتخاب کر کے انھیں کالج میں ملازم رکھا جاتا تھا۔ حیدری بھی ایک مختصر داستان "مہر و ماہ" لکھ کر ۲۱ رجب ۱۲۱۲ھ کو دریا کی راہ سے بنارس سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔

۱۔ گلشن ہند ص ۵۰

۲۔ ایضاً ص ۲۱ ۳۔ ارباب نثر اردو ص ۴۲-۴۳ ۴۔ بنگال کا ادب ص ۱۲۰

۵۔ حیدری، گلشن ہند ص ۶۰ اور دیباچہ "مہر و ماہ" بحوالہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۸ حیدری نے بنارس سے کلکتہ کے سفر میں روانگی کی تاریخ ۲۱ رجب ۱۲۱۳ھ (۱۹ دسمبر ۱۸۹۹ء) لکھی ہے۔ لیکن یہ میرجا سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت تک نہ تو فورٹ ولیم کالج ہی وجود میں آیا تھا اور نہ کوئی کتاب گل کرنت یا کسی دوسرے یورپین قدر دانوں کی خدمت میں پیش کر کے حصول مقصد کا کوئی روشن امکان موجود تھا۔

غازی پور پہنچے تو مرزا محمد علی مرشد آباد تک کے لیے ان کے ساتھ ہو لیے۔ دوران سفر انھوں نے حیدری کو کچھ نسخے دیے اور کہا کہ شعراے اردو کا ایک تذکرہ ترتیب دیں۔ چنانچہ حیدری نے ان ہی کی تشویق پر تذکرہ گلشن ہند تالیف کیا۔ کلکتہ پہنچ کر حیدری نے ”مہر و ماہ“ گل کر سٹ کی نذر کی، جسے اس نے بہت پسند کیا، اور ۳ مئی ۱۸۰۱ء کو وہ ہندوستانی شعبے میں ملازم رکھ لیے گئے۔ دوران ملازمت حیدری نے دس کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ہفت پیکر، گلزار دانش اور تاریخ نادری کے ترجمے پر انھیں بالترتیب دو سو روپے اور تین تین سو روپے کے انعامات بھی ملے تھے۔ وہ کالج سے کب تک وابستہ رہے اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ۱۸۱۲ء تک کلکتہ میں ان کی موجودگی اور کالج سے وابستگی کے شواہد موجود ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ وہاں کی ناموافقیت کی وجہ سے وہ بنارس چلے آئے۔ اشپرنگر نے اودھ کیٹلاگ میں مولوی غلام حیدر کی روایت سے حیدری کا سال وفات ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء درج کیا ہے لیکن ڈی ٹی نے اپنی تصنیف ”تاریخ ادبیات ہند“ میں سال وفات ۱۸۲۸ء / ۱۲۴۴ھ نقل کیا ہے اور حوالہ اشپرنگر ہی کا دیا ہے۔ حیدری کی وفات بنارس ہی میں ہوئی۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

- (۱) آرائش محفل عرف قصہ حاتم طائی۔ یہ فارسی داستان ”حاتم نامہ“ مصنف عبداللہ کانہایت آسان اور عام فہم اردو ترجمہ ہے جسے حیدری نے ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا اور ۱۸۰۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ چنانچہ اشاعت اول کے بعد سے اب تک اس کے ہند اور بیرون ہند میں تقریباً سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
- (۲) توتا کہانی۔ ”شک سہ تتی“ نامی سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ مولانا ضیاء الدین بخشیشی نے ”طوطی نامہ“ کے نام سے ۱۳۲۹ھ میں کیا تھا۔ بعد میں مولوی محمد قادری نے دکنی زبان میں اس کا خلاصہ تحریر کیا۔ حیدری کی ”توتا کہانی“ اسی خلاصے کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۱ء میں مکمل

۱۵ فارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ص ص ۱۵، ۱۰۰، ۱۰۴

۱۵ مختار الدین، تمہید گلشن ہند ص ۱۵

ہوا۔ یہ پہلی بار ناگری لپی میں ۱۸۰۲ء میں اور دوسری مرتبہ اور رسم خط میں ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دونوں ہی خطوں میں یہ کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

(۳) گلدستہ حیدری۔ حیدری کی یہ ضخیم کتاب ان کی مختصر کہانیوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، جس میں ”گلشن ہند“ اور ”لیلیٰ مجنوں“ کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں مرتب ہوئی۔ سال اشاعت ۱۸۰۳ء لہ۔

(۴) گلشن ہند۔ یہ شعرائے اردو کا ایک بیاض نامہ تذکرہ ہے جسے حیدری نے بقول خود بنارس سے کلکتہ کے سفر کے دوران یعنی ۱۲۱۲ھ میں مرتب کیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے ”گلزار ابراہیم“ کی ایک ناقص تلخیص ہے۔

چونکہ لطف نے ”گلشن ہند“ کے نام سے اسی تذکرے کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو اپنے اضافوں کی وجہ سے اصل سے بھی زیادہ جامع اور مکمل ہے، اس لیے قومی امکان ہے کہ حیدری نے لطف کے تذکرے کو دیکھنے کے بعد اسے علاحدہ سے قابل اشاعت نہیں سمجھا اور اسے ”گلدستہ حیدری“ میں شامل کر دیا۔

(۵) گلزار دانش۔ یہ شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی تصنیف ”بہار دانش“ کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ نیم تاریخی داستان ہے، جس میں جہاں دارشاہ اور مہرور کی داستان اثر آفریں انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ کالج کے زمانے میں شائع نہ ہو سکی۔ البتہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے شائع کر دیا ہے۔ اس کا ایک فلمی نسخہ ایٹیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۶) ہفت پیکر۔ یہ نظامی گنجوی کی اسی نام کی فارسی مثنوی کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس

سے عبادت بریلوی نے گلدستہ حیدری میں شامل کہانیوں کے انتخاب کو ”مختصر کہانیاں“ کے نام سے، اور ”گلشن ہند“ کو ”تذکرہ حیدری“ کے نام اور غزلوں کو دیوان یا بی نام سے علاحدہ علاحدہ شائع کر دیے۔ ڈاکٹر اقتدا حسن کا بیان ہے کہ ”گلدستہ حیدری“ کے دو فلمی نسخوں، پہلا یوڈین لائبریری آکسفورڈ (نمبر ۵ ماہ ۱۹۵۵ء) اور دوسرا برٹش میوزیم لندن (نمبر ۲۰۰۲۰۱۱۱) میں ”گلشن ہند“ بھی اس کی زینت ہے۔ اس کا کوئی علاحدہ مخطوطہ نہیں ہے۔ (رسالہ اردو جولائی ۱۹۴۴ء ص ۷۱)

ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ حیدری ایک کامیاب اور خوش فکر شاعر تھے۔ اس میں سات داستانیں ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اور ان میں بحر العقول اور ما فوق الفطرت عناصر کی فراوانی ہے۔ یہ ۱۸۰۹ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اب تک شرمندہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس کا بھی ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(۷) تاریخ نادری۔ یہ نادر شاہ کے وقائع نویس منشی محمد مہدی کی "تاریخ نادری" (فارسی) کا آسان اردو ترجمہ ہے۔ حیدری نے یہ ترجمہ میلر اور ہنٹر کی ترغیب پر ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔ یہ بھی طبع نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ عبیدہ بگیم کے بیان کے مطابق اس کے ۱۱۴ سے ۲۰۹ تک کے صفحات غائب ہیں۔ کل صفحات کی تعداد ۲۵۹ ہے۔

(۸) گل مغفرت یا گلشن شہیداں۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہداء" کا آسان اردو ترجمہ حیدری نے ۱۸۱۰ء میں "گلشن شہیداں" کے نام سے کیا تھا۔ بعد میں مولوی سید حسین علی جوپوری کی فرمائش پر اس کا خلاصہ "گل مغفرت" کے نام سے ۱۸۱۲ء میں تیار کیا۔ یہ اسی سال ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ لیکن گلشن شہیداں کا اب کہیں پتا نہیں چلتا۔

(۹) قصہ لیلیٰ مجنوں۔ یہ امیر خسرو کی فارسی منوی کا اردو ترجمہ ہے، جو ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ یہ ترجمہ شائع نہیں ہو سکا اور نہ تو اس کے کسی خطی نسخے کا کہیں سراغ ہی ملتا ہے۔

(۱۰) مہر و ماہ۔ سال تصنیف ۱۸۰۰ء۔ یہ شائع نہیں ہو سکی۔ اسی تصنیف کی بدولت حیدری کو کالج میں ملازمت ملی تھی۔

(۱۱) جامع القوانين۔ یہ ۱۸۰۳ء کی تصنیف ہے۔ یہ بھی شائع نہیں ہو سکی۔

۸۔ خلیل علی خاں اشک

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کسی تصنیف کی شہرت و مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کا نام بھی روشن ہوتا ہے۔ لیکن خلیل علی خاں اشک کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ان کی تصنیف "داستان امیر حمزہ" جس قدر معروف و مقبول ہے وہ اتنے ہی گمنام ہیں۔ سید محمد کا یہ دعوٰی کہ "شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ان (خلیل علی خاں) کا نام ان کے اپنے کارناموں کے

لے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۲۴

ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے، بڑی حد تک صحیح ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے مولوی یحییٰ تنہا ان کا ذکر کر چکے تھے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک سرسری تعارف سے زیادہ نہیں تھی۔ تنہا نے ان کا نام خلیل اللہ اور نام سیتا پوری نے خلیل الدین لکھا ہے، جو خلاف واقعہ ہے۔ خلیل علی خان کا تخلص اشک ان کے شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کریم الدین کے علاوہ کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نام سیتا پوری نے اشک کو مولوی اکرام علی کا ہم وطن اور عزیز دار بتایا ہے، جس کی تردید ڈاکٹر جاوید تنہا کر چکے ہیں۔^۵ اشک بقول خود دلی میں پیدا ہوئے۔^۶ لیکن سن شعور کو پہنچے تو وہ فیض آباد چلے آئے، اس لیے فیض آبادی کہلائے۔ دوران قیام فیض آباد انھیں شہزادوں کی محفلوں میں شرکت اور مرزا جہاں دار شاہ کی مصاحبت کا موقع ملا۔

۱۸۹۴ء میں اشک مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں انھیں ناظم بنگالہ کی ملازمت مل گئی چونکہ یہ معمولی قسم کی ملازمت تھی اس لیے اس سے دست کش ہو کر ۱۸۹۸ء میں وہ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں وہ گوثر نشینی کی زندگی گزار رہے تھے کہ مولوی سعید الدین نے انھیں بتایا کہ لکھنؤ سے کچھ شاعر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو کر آئے ہیں، جن میں کاظم علی خاں جو ان بھی شامل ہیں۔ جو ان اشک کے استاد تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے اپنے استاد سے ملاقات کر کے شرف قبولی حاصل کیا۔ اس ملاقات کے درمیان جو ان نے ان سے کہا، تعجب ہے کہ تم اس شہر میں ہو اور گل کر سٹ صاحب سے ملاقات نہ کرو کہ جو رشناس گوہر لفظ و معانی ہیں اور فن نکتہ دانی میں ماثانی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اشک کو اپنے ہم راہ لے جا کر ان کا تعارف گل کر سٹ سے کرایا۔

اس وقت کالج کے لیے ایک قصہ خواں کی ضرورت تھی اور کوششیں جاری تھیں۔

۱۔ ارباب نثر اردو ص ۲۲۹ ۲۔ سیر المصنفین حصہ اول ص ۱۳۶

۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۵۷

۴۔ ایضاً ص ۲۵۸ ۵۔ ملاحظہ ہو انیسویں صدی میں بنگالہ کا اردو ادب ص ۲۱۷

۶۔ انتخاب سلطانیہ، بحوالہ گل کر سٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۱

۷۔ ایضاً ص ۳۰۱

لکھنؤ میں اس کام کے لیے کوئی مناسب شخص نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۸۰۲ء میں اس جگہ پر اشک کا تقرر ہو گیا۔ اس تقرر کے بعد گل کرسٹ نے ان سے ”داستان امیر حمزہ“ کا اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن ستمبر ۱۸۰۲ء میں منظر علی خاں و لا کو کالج کی خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ قصہ خواں کے عہدے پر تقرری کے وقت گل کرسٹ نے اشک سے یہ کہا تھا کہ ”تم خاطر جمع رکھو تمہارے واسطے حتی المقدور سعی میں کوتاہی نہ کریں گے۔“ لیکن ابھی تک ان کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اس بے اعتنائی اور و لا کی برطرفی جیسے واقعات سے اشک مملول ہو کر کالج کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ چنانچہ داستان امیر حمزہ کے ترجمے کا کام بھی کھٹائی میں پڑ گیا، اور انھوں نے دوبارہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جب مولوی سعید الدین کو اشک کی دست کشی کا علم ہوا تو وہ انھیں ساتھ لے کر وائسرائے کے سکریٹری مسٹر ہارنگٹن سے ملے۔ انھوں نے اشک کو دلا سا دیا۔ اس کے بعد گل کرسٹ نے بھی ان کی طرف توجہ فرمائی اور انگریز افسروں کو پڑھانے کے لئے انھیں مقرر کیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس ملازمت کی نوعیت کیا تھی۔ دستیاب شواہد سے صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد گل کرسٹ کے ساتھ رائی ٹرس بلڈنگ جایا کرتے تھے اور وہاں اردو میں تقریر کرتے تھے، جسے گل کرسٹ انگریزی میں سمجھاتے تھے۔ یہ ظاہر یہ بھی قصہ خواں کا معلوم پڑتا ہے لیکن جب گل کرسٹ نے رات کو رائی ٹرس بلڈنگ جا تا ترک کر دیا تو اشک کی یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن اس کے معاً بعد انھوں نے تیس روپے ماہوار پر انھیں کالج میں منشی رکھ لیا، جس کی توثیق ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی میننگ میں کر دی گئی۔ اشک بقول خود پہلے درجے کے منشی بنائے گئے تھے۔ لیکن ۲۰ ستمبر ۱۸۰۵ء کو ہندوستانی شعبے کے عملے کی تفصیل

کونسل کو پیش کی گئی تھی۔ اس کے مطابق اشک کو محض چالیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ پہلے درجے کے نہیں بلکہ تیسرے درجے کے منشی تھے۔ اس وقت

لے مولوی سعید الدین سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ ان کے والد مفتی نجم الدین خاں کے شاگردوں میں تھے۔ (مشاہیر کا کوری ص ۲۳۷)

۲۰ انتخاب سلطانیہ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۲

۲۱ فورٹ ولیم کالج ص ۶۹

پہلے درجے کے منشیوں کا مشاہرہ اتنی روپیے ماہوار تھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے منشیوں کو علی الترتیب ساٹھ اور چالیس روپیے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

مئی ۱۸۰۶ء میں "ایسٹ انڈیا کالج" کے نام سے سیل برہمن میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج کے لئے ہندوستان سے بھی کچھ اساتذہ بھیجے گئے تھے۔ ان لوگوں کو تنخواہ کے علاوہ سفر بھتہ بھی دیا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے جن لوگوں کو انگلینڈ بھیجا گیا تھا ان میں مرزا ابوطالب میر عبد العلی اور خلیل علی خاں اشک کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مرزا عبد العلی کو ۱۸۰۶ء میں چھ سو پونڈ سالانہ تنخواہ پر بھیجا گیا تھا۔ دوران قیام انگلینڈ وہ فورٹ ولیم کالج کے ملازم تصور کیے جاتے تھے۔ شواہد کی عدم دستیابی کی بنا پر اس امر کا پتا نہیں چل سکا کہ اشک کو انگلینڈ کب بھیجا گیا اور وہ وہاں سے کب واپس آئے۔ لیکن یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ کلکتہ ہی میں رہے یا اپنے وطن واپس چلے آئے۔ ان کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔ یہ سب حالات نامعلوم ہیں۔ البتہ نادیم سیتا پوری اشک کا زمانہ انتقال، ۱۲۲ھ (۱۸۲۱ء) کے آس پاس قرار دیتے ہیں۔

ان کی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے

- (۱) داستان امیر حمزہ: یہ اردو زبان کی مقبول ترین اور سب سے طویل و عریض داستان ہے جو بحر العقول حادثات، خارق العادات و واقعات اور طلسمات کی نوبہ نوحیرت آفرینیوں سے معمور ہے۔ اس کا ہیرو امیر حمزہ ایک بے باک، جانناز، اور مہم جو قسم کا فرد ہے، جو تمام مشکلات کو سر اڑنا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے اور خدا کی مدد و نصرت بر اڑے وقت میں اس کے شامل حال رہتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کالج کی طرف سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ عبیدہ بیگم نے اس کا سال آٹھواں ایڈیشن ۱۸۰۱ء لکھا ہے۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ۱۸۰۲ء کے اوائل میں تو انھیں اس کام پر مامور ہی کیا گیا تھا۔

(۲) منتخب الفوائد: منتخب الفوائد اس کا تالیفی نام ہے اس کے مطابق یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں مکمل

۱۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۰

۲۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۳۰۳

ہوتی۔ یہ محمد منصور سعید ابوالفوح خلیل کی فارسی تصنیف "اوصاف الملوک و طرق خردیم" کا اردو ترجمہ ہے جس میں بادشاہوں کے اوصاف اور طرز حکومت سے متعلق سبق آموز کہانیاں درج ہیں اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۳) قصہ رضوان شاہ ۱۵۔ اس کا دوسرا نام "نگارخانہ چین" بھی ہے۔ اس میں شہزادہ چین رضوان شاہ اور پری زاد روح افزا کے معاشقے کی کہانی دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں طلسم کی حیرت سے آسانیوں کی فراوانی ہے۔ اس کا ایک تیسرا نام "گلزار چین" بھی بتایا جاتا ہے۔ یہ ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی لیکن کالج کے زمانے میں شائع نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔ اس کا ایک فلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں بھی محفوظ ہے۔

(۴) کتاب واقعات اکبر :- یہ ابوالفضل کی فارسی تصنیف "اکبر نامہ" کا اردو ترجمہ ہے جس میں اکبر اعظم کے دور کی جامع تاریخی درج کی گئی ہے۔ کتاب کی ابتدا اکبر کی ولادت کے بیان سے اور اختتام بہر مہاں کے دلی سے کوچ کے ذکر پر ہوتا ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۹ء۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکی۔

(۵) انتخاب سلطانیہ :- یہ اشک کی طبع زاد تصنیف ہے جس میں انھوں نے دلی کے بادشاہوں کے احوال و کوائف درج کیے ہیں۔ انتخاب سلطانیہ اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے اپنے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی زلیور طباعت سے آراستہ نہ سکی۔ البتہ عتیق صدیقی نے اس کے دیباچے کا وہ حصہ جو اشک کے حالات پر مشتمل ہے، اپنی تصنیف "گل کر سٹ اور اس کا عہد" میں شائع کیا ہے۔

(۶) رسالہ کائنات جو :- یہ سائنس کے موضوع پر شاید اردو میں پہلی تصنیف ہے جسے اشک نے ۱۸۰۲ء میں لکھا تھا۔ "جو" لفظ کے متعلق اشک لکھتے ہیں "جو نام ہے یح کا زمین اور آسمان کے یعنی جو زمین سے آسمان تک وسعت ہے، اس کو "جو" کہتے ہیں"۔ یہ ۱۸۰۲ء میں کالج کی جانب سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن عبادت بریلوی نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۵ رسالہ کائنات جو، جوال فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۰۸

اشک کو "اکبرنامہ" کے ترجمے پر دو سو روپے اور "قصہ رضوان شاہ" اور "انتخاب سلطانیہ"

کی تصنیف پر تترتر دوپے ملے تھے۔

(۹) امانت اللہ شیدا:

امانت اللہ صرف عربی و فارسی کے جید عالم تھے بلکہ اردو کے کامیاب شاعر بھی تھے۔ وہ شیدا تخلص کرتے تھے۔ ان کا خاندان بھی اجڑی ہوئی دل سے ہجرت کر کے کلکتہ میں آباد ہو گیا تھا شیدا کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے قبل ان کے علم و فضل کی شہرت کلکتہ میں عام ہو چکی تھی اور شاید اسی شہرت کی بنا پر کالج کی ملازمت کے لئے ان کا انتخاب ۱۸۰۳ء میں عمل میں آیا۔ وہ گل کرسٹ کے زمانے میں شعبہ ہندوستانی سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۱۲ء تک مترجم کے عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۶-۴۷ء) میں کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہوا

امانت اللہ پر گل کرسٹ کی خاص نظر عنایت تھی۔ وہ ان کے بحر علمی سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ قرآن کے ترجمے کا کام سب سے پہلے ان ہی کے سپرد کیا تھا۔ حسب ذیل مفید اور پراز معلومات تصانیف ان ہی کی رہن منت ہیں۔

۱- ہدایت الاسلام (دو جلدیں)۔ یہ خود امانت اللہ کی اسی نام سے عربی میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام کے احکام و قوانین بڑے اچھے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۸۰۴ء میں اس کی پہلی جلد ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن دوسری جلد ہنوز شرمندہ اشاعت نہ ہو سکی۔

۲- جامع الاخلاق۔ یہ عربی کے جید عالم اور انشا پر داز مولانا جلال الدین محقق دوانی کی معرکہ الار کتاب "لوامع الاشراف فی مکارم الاخلاق" عرف اخلاق جلالی کا اردو ترجمہ اور تلخیص ہے۔ امانت اللہ نے اس کی تکمیل جولائی ۱۸۰۵ء میں کی تھی اور اس کام کے صلے میں انھیں دو سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ کالج کے زمانے میں طبع نہیں ہو سکی۔ لیکن ات غلام حیدر نے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شائع کر دیا ہے۔

۳- صرف اردو۔ یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس میں قواعد صرف و نحو نہایت دلکش انداز میں

بیان کیے گئے ہیں۔ قواعد جیسے خشک موضوع سے متعلق مسائل کو نظم کا جامہ پہنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن شیدا نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے رسالہ ۱۸۰۶ء میں تصنیف کیا تھا لیکن بعض دشواریوں کے باعث اس کی اشاعت ۱۸۱۰ء میں عمل میں آئی۔ ان کتابوں کی تصنیف کے علاوہ شیدا نے نقلیات لقمانی کے لیے کہانیوں کے ترجمے اور ترتیب میں بھی معاونت کی تھی اور اس کام کے سلسلے میں وہ انعام کے مستحق قرار پائے تھے۔

(۱۰) للولال کوی؛

ان کا پورا نام للوچی لال کوی تھا۔ کالج کے سکریٹری لاکٹ نے ۱۹ دسمبر ۱۸۱۶ء کو اچ۔ وڈ کے پاس کالج کی جو تفصیل ارسال کی تھی اس میں للولال کی عمر ۵۵ سال درج ہے، اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۷۶۲ء کے قریب قرار پاتا ہے۔ لیکن لکشی ساگر وارشنے اسی تفصیل کی روشنی میں للولال کا سال پیدائش ۱۷۶۷ء متعین کیا ہے۔ شاید یہ سہو قلم ہو۔ یہ ذات کے گجراتی برہمن تھے جن کا خاندان گجرات سے ترک سکونت کر کے آگرے میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ للولال کب اور کس سلسلے سے کلکتے پہنچے۔ جاوید نہال نے لکھا ہے کہ للولالی جی فورٹ ولیم کالج کے شعبہ بھاگا کے منشی تھے۔ لیکن کالج میں بھاگیا ہندی کا کوئی علاحدہ شعبہ نہیں تھا۔ اردو اور ہندی کا مشترک ایک ہی شعبہ تھا جسے ہندوستانی شعبہ کہا جاتا تھا۔ اس سبب میں ناگرمی خوش نوسی اور بھاگا منشی کے مشترک عہد پر ان کا تقرر ۲۵ فروری ۱۸۰۲ء کو عمل میں آیا تھا۔ اور اسی روز کی کاروائی میں کونسل نے یکم اگست ۱۸۰۱ء سے جنوری ۱۸۰۲ء تک کی ان کی بقایا تنخواہ بھی منظور کی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگست ۱۸۰۱ء سے سندھی منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

کالج کونسل کے ۱۱ جون ۱۸۰۲ء کے اجلاس کی کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل نے

۱۔ رام چندر شکل کے مطابق للولال سمیت ۱۸۲۰ (۱۷۶۳ء) میں پیدا ہوئے تھے (ہندی ساہتیہ کا تہاس ص ۲۸۴)

۲۔ فورٹ ولیم کالج ص ۹۳-۹۲

۳۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۷۲ء وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۰

لیکن عتیق صدیقی نے تہذیب کی تاریخ، جون ۱۸۰۲ء لکھی ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹) جو درست نہیں ہے۔

۵۔ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۱-۵۰

للولال اور سدل مسر کی خدمات کو غیر ضروری قرار دے کر انھیں جولائی سے علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ۱۸۰۲ء اکتوبر ۱۸۰۲ء کی میٹنگ میں اس فیصلے پر نظر ثانی کر کے ان دونوں کو نہ صرف بحال رکھا گیا بلکہ جولائی سے اکتوبر تک کی تنخواہ بھی ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ ڈاکٹر وارنٹن کی تحقیق کے مطابق للولال مئی ۱۸۲۳ء تک کالج سے وابستہ رہے، محقق موصوف کا خیال ہے کہ انھوں نے مئی ۱۸۲۲ء میں وفات پائی۔ ہندی ادب کے تاریخ نویسوں نے للولال کے ایہ سنسکرت پریس کا بھی ذکر کیا ہے، جسے انھوں نے کلکتہ میں قائم کیا تھا۔ بعد میں اس پریس کو انھوں نے آگرہ میں منتقل کر لیا تھا۔

جدید ہندی نثر کی ترقی میں للولال کی ہندی کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی نثر کی کوئی قابل قدر تصنیف موجود نہیں تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے "پریم ساگر"، اور دوسری کئی کتابیں تصنیف کر کے ہندی نثر کے اعلا اور وقیع نمونے پیش کیے، جو بعد کے ہندی مصنفین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ ٹیلر نے ان کے کارناموں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ خالص ہندی نثر لکھنے والوں میں للولال سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں۔ اردو میں ان کی صرف دو کتابیں ملتی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

- (۱) لطائف ہندی۔ یہ چھوٹی چھوٹی ایک سو حکایتوں کا مجموعہ ہے جو نقل کے عنوان سے تحریر کی گئی ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں ایک ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اردو رسم الخط والی کتاب کی زبان ریختہ یعنی اردو اور ہندی لپی والی کی زبان برج بھاشا ہے۔ ان حکایتوں کے موضوعات مزاحیہ اور سبق آموز ہیں۔ اس ایڈیشن کے آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فہرست بھی شامل ہے، جس میں الفاظ کے معنی انگریزی اور ہندی میں لکھے گئے ہیں۔
- (۲) برج بھاشا کے قواعد۔ یہ کالج کے طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی، چنانچہ یہ انساب میں شامل تھی۔ اس کی زبان اردو ہے۔ یہ ۱۸۱۱ء میں شائع کی گئی۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج ص ۹۷

۲۔ ایضاً ص ۹۷، رام چندر شکل کے مطابق للولال کا انتقال سمبت ۱۸۸۲ (۱۸۲۵ء) میں ہوا تھا

(ہندی ساہتہ کا اتہاس ص ۲۸۸)

پریم ساگر، لال چندر پکا، راج میتی، سجا بلاس، مادھو بلاس اور چھتر پکاش اللوجی لال کی ہندی تصانیف ہیں، جو فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہوئیں۔ علاوہ بریں بیتال پچسی، شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، مادھونل اور نقلیات لقمانی کے ترجمے میں انھوں نے معاونت کی تھی۔

۱۔ مولوی اکرام علی :

اکرام علی کے مورث اعلیٰ کابل کے متوطن تھے۔ ان کا سلسلہ نسب بقول نادیم سیتاپوری حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ ان میں شیخ کمال الدین سلیمان نے ۱۱۹۱ھ اور ۱۲۰۵ھ کے درمیان ترک وطن کر کے قصبہ نارنول کو اپنا مستقر بنالیا۔ ان کے خاندان کے ایک فرد شیخ جمال الدین سلیمان گاؤد کے قاضی مقرر ہوئے، جو بابا فرید الدین کے والد ماجد تھے۔ یہ بعد میں اسی خاندان کے ایک فرد، جن کا نام شیخ محمد ریس تھا، سیتاپور میں آکر آباد ہو گئے۔ اکرام علی کا سلسلہ نسب اسی خاندان سے ملتا ہے۔ اکرام علی کے والد شیخ احسان علی سیتاپور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ تصوف کی طرف مائل تھے۔

مولوی اکرام علی کی ولادت ۱۷۸۲ء یا ۱۷۸۳ء میں ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم کی ابتدا والد ہی کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ اکرام علی ابھی اپنی عمر کے نو برس بھی پورے نہیں کیے تھے کہ ان کے والد شوریہ سری کے سبب مفقود الخیر ہو گئے۔ چنانچہ حصول علم کے لیے انھیں اپنے چچا شیخ مردان علی کے ہمراہ دلی جانا پڑا۔ وہاں کچھ روز قیام کے بعد وہ دوبارہ سیتاپور واپس چلے آئے۔ تعلیم کے سلسلے میں انھیں لکھنؤ کا بھی سفر کرنا پڑا تھا۔

علامہ ترازب علی نامی جو اکرام علی کے بھائی تھے، اس وقت کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں مدرسہ کی خدمت پر مامور تھے۔ چنانچہ اکرام علی نے تعلیم و تربیت کے باقی مراحل نامی ہی کے زیر سرپرستی طے کیے، اور جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تو نامی ہی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔

۱۔ نفیس احمد صدیقی، نیادور۔ جنوری فروری مارچ ۱۹۸۶ء ص ۷۷

۲۔ عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۹۹۔ جبکہ نادیم سیتاپوری کے مطابق ان کی ولادت

۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) یا ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۳ء) میں ہوئی تھی۔ (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۰)

تعلیم سے فراغت کے بعد نامی ہی کی سفارش پر اکرام علی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے۔ ہنوز اس ملازمت کی نوعیت کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ اس بارے میں مورخین کے بیانات قیاس و گمان پر مبنی ہیں، چنانچہ بعض اوقات وہ آپسی میں متضاد و متصادم ہو جاتے ہیں۔ نادم سیتا پوری رقم طراز ہیں کہ "۱۸۰۰ء میں جب کالج قائم ہوا تو ان (اکرام علی) کی خدمات ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کالج میں منتقل کر دی گئی تھی۔ اس کے برخلاف سید محمد کا بیان یہ ہے کہ مولوی اکرام علی گل کرسٹ کے وطن جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے تھے۔ جاوید نہال کتب خانے میں ان کی ملازمت کا زمانہ ۱۸۰۶ء قرار دیتے ہیں، جبکہ رام بابو سکسینہ اور سید محمد کے خیال کے مطابق اکرام علی ۱۸۱۳ء میں لائبریرین مقرر ہوئے تھے۔ یہ بہر حال ان بیانات کی توثیق کسی مستند ماخذ سے نہیں ہوتی۔ خود اکرام علی کے بقول مسٹر لاکٹ نے انھیں اپنے پاس متعین کیا تھا۔ لیکن اس تقرر کا زمانہ بھی تحقیق طلب ہے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے وہ اعلیٰ افسر جنھیں مشرقی زبانوں سے دلچسپی ہوتی تو وہ ان زبانوں کی تعلیم کے لیے ذاتی طور پر منشی مقرر کرتے تھے، جن کی تنخواہ وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ اس عوض سے ابراہم لاکٹ نے انھیں اپنا منشی مقرر کیا۔ غالباً اکرام علی کا یہ تقرر ۱۸۱۰ء کے اواخر میں عمل میں آیا ہوگا۔ کیونکہ جون ۱۸۱۰ء تک تراب علی نامی ان کے منشی رہے تھے۔ اس کے بعد وہ مدراس چلے گئے۔ مدراس جاتے وقت نامی نے اپنی سفارشات سے اکرام علی کو لاکٹ کا منشی مقرر کروا دیا تھا۔

اکرام علی کے بارے میں نادم سیتا پوری کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں "اردو اخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اس کی تالیف حامد حسن قادری نے بھی کی ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک اب تک اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" ہی کو تسلیم

۱۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۳۵۔ ۲۔ ارباب نثر اردو ص ۲۶۹

۳۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۴۶

۴۔ تاریخ ادب اردو حصہ نثر ۱۴، اور ارباب نثر اردو ص ۲۴۳

۵۔ فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۱

۶۔ داستان تاریخ اردو ص ۸۲ کا حاشیہ

اردو زبان و ادب میں اکرام علی کی قدر منزلت محتاج بیان نہیں۔ محض اپنی ایک ہی تصنیف ”اخوان الصفا“ کی وجہ سے ان کا نام اردو کے افق پر روشن ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔ ”اخوان الصفا“ عربی کی مشہور تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک اون رسائل پر مشتمل ہے اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر (۹۶۲ء تا ۱۰۱۰ء) کی تصنیف ہے۔ یہ رسائل اسماعیلی فرقے اخوان الصفا کے عالموں ابو سلمان محمد بن مشیر البستی المقلسی، ابو الحسن علی بن فاروق النجابتی، محمد بن لوزجوری العوفی اور زید بن رفاع وغیرہ نے تصنیف کیے تھے۔ فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، فرینچ اور جرمن زبانوں میں بھی اس کتاب کے مختلف رسالوں کے ترجمے ہوئے۔ اکرام علی کا کیا ہوا ترجمہ پہلی بار ۱۸۸۱ء میں ”اخوان الصفا“ کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے ”اخوان الصفا“ کے اس رسالے کا ترجمہ کیا ہے جو ان لوگوں اور بہائم (جانوروں) کے مناظرے میں ہے۔ یہ کالج کے نصاب میں شامل تھا اور انگریزی عہد حکومت میں مدت تک یہ آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانات میں بھی داخل نصاب رہا۔ اس کی زبان نہایت آسان اور آج کے روزمرہ سے بہت قریب ہے، یہی وجہ ہے کہ ”باغ و بہار“ کے بعد انگریزوں نے جس اردو تصنیف کو اپنے گلے کا بنا لیا وہ ”اخوان الصفا“ ہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ”اخوان الصفا“ کے بیشتر حصے کا ترجمہ نامی ہی نے کیا تھا، جس پر انھیں سو روپے بطور انعام ملے تھے۔ ا۔

(۲) مصنفین اسلام۔ قاضی الیاس حسین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ”مصنفین اسلام (قلمی) مولوی اکرام علی... مفتی اجیر شریف کی کتاب تھی اولاد کی غفلت سے یہ کتاب ان کی اولاد سے جاتی رہی پلہ اس کتاب میں بارہ سو سال کے مصنفین اسلام کے حالات اور ان کے کارنامے تحقیقی طور پر بیان کیے گئے تھے۔“

نادم سیتا پوری کے بیان کے مطابق اکرام علی کا جو سامان کلکتہ اور اجیر سے سیتا پور آیا تھا اس میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کے علاوہ ان کی تصنیف کی ہوئی متعدد کتابیں اور جنوں بیاضیں اور کئی کتکول تھے یہ لیکن خاندان والوں کی بے اعتنائی اور غفلت کی وجہ سے یہ سب دست

لے فورٹ ولیم کالج از وارنٹے۔ ص ۱۰۲ لے سماہی مصنف علی گڑھ اکتوبر ۱۹۳۶ء اور جنوری ۱۹۳۷ء۔

بجوال فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۳ لے فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۲

بروزمانہ کی نذر ہو گئیں۔

۱۲۔ مولوی حفیظ الدین احمد:

حفیظ الدین کے والد کا نام شیخ ہلال الدین اور دادا کا نام محمد ذاکر تھا۔ ان کے جد اعلیٰ عرب سے ترک وطن کر کے حیدرآباد میں آباد ہو گئے تھے بعد میں ان کے پرداد شیخ حسن حیدر آباد کو خیرباد کہہ کر بنگال کو اپنا مسکن بنایا۔ حفیظ الدین کے والد شیخ ہلال الدین مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ حفیظ الدین نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی وہ عربی و فارسی میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تلاش معاش میں سرگرداں تھے کہ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، اور ۲۲ مئی ۱۸۰۱ء کو شعبہ فارسی میں مدرس کی حیثیت سے چالیس روپے ماہوار پر ان کا تقرر ہو گیا جب کالج کی طرف سے عمدہ تصانیف پر انعامات کا اعلان کیا گیا تو انھوں نے ابو الفضل کی تصنیف ”عیار دانش“ کا اردو میں ترجمہ کر کے اسے گلکرسٹ کی نذر کیا۔ گل کرسٹ نے ۱۲ مئی ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سکریٹری کو لکھا کہ

” میں انتہائی مسرت کے ساتھ ایک مفید ترین اور مشہور کتاب عیار دانش کا ہندوستانی ترجمہ کالج کونسل کے ملاحظہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ فارسی شعبے کے مولوی حفیظ الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مترجم کی درخواست اظہار احوال کے لیے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے اچھے کام کے لیے کونسل انھیں انعام ضرور دے گی۔“

گل کرسٹ نے اپنے سفارشی خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مترجم کی ہمت افزائی کی گئی تو وہ الف لیلہ کا بھی ترجمہ ہندوستانی زبان میں کرے گا۔ اس سفارش کے نتیجے میں ”عیار دانش“ کے اس ترجمے پر چھ سو روپے کا انعام ملا لیکن وہ الف لیلہ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حفیظ الدین کالج سے کب تک وابستہ رہے۔ سید محمد نے لکھا ہے کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دہلی کے ریڈنٹ مسکاف کے منشی مقرر ہو گئے تھے اور ۱۸۱۵ء میں دہلی میں موجود تھے۔ اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ کالج سے

۱۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۵

ص ۱۶۶ ۲۔ ارباب نثر اردو ص ۲۳۰

۳۔ ایضاً

ان کا تعلق ۱۸۱۵ء سے قبل منقطع ہو چکا تھا۔

”عیار دانش“ کا اردو ترجمہ جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے حفیظ الدین کی واحد یادگار ہے جس نے ان کے نام کو ہمیشہ کے لیے تاریخ ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۰۵ء میں ”خرد افروز“ کے نام سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ربک نے غلام اکبر، مرزائی بیگ، غلام قادر اور مولوی سید کاظم علی کی مدد سے اسے از سر نو ترتیب دیا اور ایک بسیط مقدمے کے ساتھ ۱۸۱۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔ اس ترجمے کی عبارت نہایت صاف اور سستہ ہے۔

۱۳۔ لالہ کاشی راج :

لالہ کاشی راج کھتری لاہور کے باشندے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی میں ان کا تقریباً ۱۸۰۱ء کو ہوا تھا۔ ۲ نومبر ۱۸۰۱ء کی کالج کونسل کی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل استعفادے کر کالج کی ملازمت سے علاحدہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد کالج میں ان کے دوبارہ تقرر کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا، لیکن قرآین و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں کالج کے شعبہ پنجابی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کیوں کہ اسی شعبے کے لیے انھوں نے پنجابی میں کئی مفید کتابیں تصنیف کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کالج کی کارروائیوں میں ان کے نام کے پہلے منشی لکھا گیا ہے۔ ان کے سنین ولادت و وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

تصانیف :

(۱) پنجابی لغت۔ یہ ایک مفید کتاب ہے، جو کالج کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گلستاں اور ہندی اسٹوری ٹیلر کا پنجابی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندی اسٹوری ٹیلر کے ترجمے پر انھیں سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔

۱۴۔ منصور علی۔

منصور علی کے مورث اعلیٰ بنزوار سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور دلی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد امام بخش نے دلی کو چھوڑ کر پٹنہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ منصور علی کی تعلیم و تربیت پٹنہ ہی میں ہوئی تھی۔ وہ پٹنہ سے کلکتہ گئے اس کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ اس قدر

لے لکشمی ساگر وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی میں ان کا تقرر فروری ۱۸۰۲ء میں بہادر علی کی سفارش پر ہوا تھا۔ چونکہ انھیں درس و تدریس کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں اس لیے تالیف و تصنیف پر زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔ ستمبر ۱۸۰۵ء تک قطعی طور پر ان کی کالج میں موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کے حالات نامعلوم ہیں۔

”بحر عشق“ (قصہ سیف الملوک) ان کی واحد تصنیف ہے جس کی بدولت ان کا نام مصنفین اردو میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ اسی نام کی ایک فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا تھا لیکن شائع ہوسکا۔ اس قصے میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو قدیم داستانوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ مرزا محمد فطرت:

فطرت لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ سر جان مرے ہیڈلے کی گرامر کی تصحیح کے لیے ۱۷۹۸ء میں انھیں اپنے ساتھ لندن لے گئے۔ لندن کے زمانہ قیام میں انھوں نے صرف ہیڈلے کی قواعد کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ اس میں متعدد اہم اضافے بھی کیے۔ اس کے علاوہ جارج ہیڈلے کی قواعد کا ایک ترمیم شدہ ایڈیشن بھی تیار کیا جو ۱۸۰۲ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر ہیڈلے کے ساتھ فطرت کا بھی نام درج تھا۔

اس کے بعد فطرت ہندوستان واپس آئے اور سر ٹرکول بروک کے ایما پر انجیل کا فارسی ترجمہ شروع کیا۔ بعد میں بروک کی سفارش پر گل کرسٹ نے، نومبر ۱۸۰۳ء کو انھیں اسی روپیے ماہوار پر فورٹ ولیم کالج میں ملازم مقرر کر دیا، جہاں انجیل کے ہندوستانی و فارسی ترجمے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ اس ترجمے پر انھیں پانچ سو روپے نقد ملے تھے۔ فطرت کے اس ترجمے کو ہنر نے گریک سے مقابلہ کرنے کے بعد ”عہد نامہ جدید“ کے نام سے ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع کیا تھا۔ فطرت کالج سے کب تک کالج سے وابستہ رہے اس کا علم نہیں ہوسکا۔

تعب ہے کہ عبیدہ بیگم نے کالج کے مصنفین کے ضمن میں فطرت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج ص ۷۹

۲۔ محمد کبیری تنہا، سیر المصنفین حصہ اول ص ۲۰۲

۳۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰۔ فورٹ ولیم کالج ص ۷۲

۱۶۔ میر بخش علی :

میر بخش علی کا وطن فیض آباد تھا۔ وہ ۱۸۲۵ء کے آس پاس پیدا ہوئے تھے۔ کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح بخش علی بھی ارباب کالج کی داد و دہش اور اکرام و نوازش کی شہرت سن کر کلکتہ گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر جاوید نہال بخش علی کی کالج سے وابستگی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ”ان کو کالج کی ملازمت زمل سکی تھی۔ لیکن امر واقعہ ہے کہ نومبر ۱۸۰۳ء میں شعبہ ہندوستان میں بخش علی کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ عتیق صدیقی ان کا مشاہرہ اسی روپے بتاتے ہیں، جبکہ وارث نے سو روپے درج کیے ہیں۔“

معلوم پڑتا ہے کہ شروع میں جب منشی کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا تھا اس وقت انہیں ۸۰ روپے ملتے تھے۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے قریبی زمانے میں ولیم ٹیلر اور آر۔ مارٹن نے بخش علی کا فارسی اور ہندوستانی میں امتحان لیا اور جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ان کو ترقی دے کر سکند منشی کے منصب پر فائز کیا گیا اور ان کی تنخواہ ۸۰ روپے سے بڑھا کر سو روپے کر دی گئی۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد انہیں مستقبل میں میر بخش علی کے لائق قرار دیا گیا تھا۔ لیکن وہ کبھی اس عہدے پر مامور نہیں ہو سکے بلکہ آخر تک سکند منشی ہی کے منصب پر کام کرتے رہے۔

تاریخ چرن مسر اور مرتضیٰ خاں کے بعد بخش علی کو زیادہ مدت تک کالج کی ملازمت کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے تقریباً ۲۰ سال تک کالج کی خدمات انجام دیں۔ درمیان ملازمت وہ اپنے اخلاق و عادات سے ارباب کالج کو خوش و مطمئن رکھنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ ان کے عہدے کی ضرورت باقی نہ رہنے پر بھی نہ صرف انہیں بحال رکھا گیا بلکہ ان کی تنخواہ میں بھی تخفیف نہیں کی گئی۔ ہمارے اس خیال کی توثیق ولیم پرائس کے ۱۵ اگست ۱۸۲۹ء کے خط سے ہوتا ہے، جس میں انہوں

لے چونکہ مئی ۱۸۳۰ء میں ان کی پنشن کے لیے جو تفصیلات درج کی گئی تھیں، ان میں ان کی عمر ۶۸ سال بتائی گئی تھی (فورٹ ولیم کالج از وارث نے ص ۱۲۷) لے انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۶۸ لے عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰، اور وارث نے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۱ لے گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰ لے فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۱ اور ۱۳۲

نے شعبہ ہندوستانی کی تفصیل کالج کو نسل کو ارسال کی تھی۔ انھوں نے بخشش علی کے متعلق لکھا تھا کہ ”کالج میں ہندوستانی کی جگہ پر ہندی ہو جانے سے بخشش علی کا کام بہت معمولی رہ گیا ہے۔ لیکن تاریخی چرن کی طرح وہ بھی یہاں شروع ہی سے ہیں، اس لیے انھیں برطرف کر دینا یا ان کا مشاہرہ کم کر دینا شاید بہتر برانصاف نہ ہوگا۔ ان کی وفات ہو جانے یا سبکدوش ہونے پر ان کا جانشین مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اے بخشش علی مئی ۱۸۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ جب کالج کے پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیے گئے تو انھیں بھی کالج سے علاحدہ کر کے پچاس روپیے ماہانہ پنشن دینا منظور کیا گیا۔ ۲

کالج کی ملازمت سے علاحدگی کے بعد بخشش علی کہاں گئے اور ان کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔ ان امور کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے۔

”اقبال نامہ“ شاید ان کا واحد کارنامہ ہے، جو ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ منشی غلام حسین کی فارسی تخلیق ”سیر المتاخرین“ کے صرف ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ بخشش علی نے ولیم ٹیلر کے زمانہ پرفیسری (۱۸۰۹ء) میں اس کو تیار کیا تھا۔ لیکن انھوں نے اسے ۱۸۲۵ء میں ارباب کالج کے حوالے کیا۔ سکرٹری رڈیل نے ”اقبال نامہ“ کو جب ولیم رپس کے پاس بصرے کے لئے بھیجا تو اس نے ۲۵ مارچ ۱۸۲۵ء کو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

”اگر ہندوستانی کی تعلیم اردو شکل میں جاری رہتی تو میر بخشش علی کا ترجمہ بہت کارآمد ثابت ہوتا۔ لیکن حال ہی میں میرے شعبے میں اردو کی جگہ ہندی کی تعلیم شروع ہو جانے سے اس طرح کے ترجموں کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ایسی تصنیف کی بجائے نئی قسم کی کتابوں کی ضرورت ہوگی۔“

۱۷۔ سدل مسرپنڈت :

سدل مسر دھروڈیا گانو ضلع آریا شاہ آباد (بہار) کے باشندے تھے۔ لگ بھگ ۱۷۶۷ء

۱۷۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۲ لے وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۷

۱۷۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۲

۸ ۱۷۶۱ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ ہند متی مسرا ان کے والد کا نام تھا۔

سڈل مسرتلاش معاش میں کلکتہ گئے اور انھیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت مل گئی۔ صنیق صدیقی کی اطلاع کے مطابق ۲۵ نومبر ۱۸۰۲ء کو محض تیس روپیے ماہوار پر شعبہ ہندوستانی میں ماحمت منشی کے منصب پر ان کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ چھ ماہ میں موٹ نے ۹ مئی ۱۸۰۲ء کے اپنے مراسلے میں للوال اور سڈل مسر کو غیر ضروری قرار دے کر شعبہ سے علاحدہ کرنے کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ کونسل نے اپنے ۱۱ جون ۱۸۰۲ء کے اجلاس میں دونوں کو شعبہ سے برطرف کر دیا۔ جولائی ۱۸۰۲ء سے ان لوگوں کو تنخواہ ملنا بند ہو گئی۔ لیکن ہندوستانی شعبے میں بھاگیا منشیوں کی کمی کے پیش نظر ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۲ء کی کاروائی میں کونسل نے نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کو دوبارہ واپس بلا لیا بلکہ گزشتہ تین مہینوں کا مشاہرہ دینا بھی منظور کیا۔

سڈل مسر شعبہ ہندوستانی سے کب تک منسلک رہے اس کا صحیح علم تو نہیں ہو سکا البتہ کالج کونسل کی کاروائیوں سے ۱۸۰۹ء تک ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ۲۷ مئی ۱۸۰۹ء کاروائی میں ”ہندی اور فارسی لفظوں کی فہرست“ کے ترجمے پر چھپاس روپیے سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ کالج سے علاحدگی کے بعد کے حالات قعر گنما میں ہیں۔ انھوں نے ۲۸-۱۸۲۷ء کے قریب وفات پائی۔

تصانیف :

(۱) چند راوتی۔ سڈل مسر نے ”ناسکے ناپا کھیان“ (سنسکرت) کا ترجمہ بہ زبان ہندی ۱۸۰۳ء میں کیا تھا جسے کالج کی جانب سے اسی سال شائع کیا گیا۔ گل کرسٹ نے اس پر ساٹھ روپیے کی سفارش کی تھی۔ لیکن سڈل مسر کو کچھ نہ مل سکا۔ شیام سندرواں نے اسے ناگری رسم خط میں مرتب کر کے ۱۹۰۱ء میں بنارس سے شائع کیا ہے۔

(۲) رام چرت۔ یہ ادھیاتم راماین کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے پر انھیں تین سو روپیے بطور انعام ملے

۱۵۹ سے ہندی سابتیہ کا پرورتی گت اتہاس حصہ نثر جلد دوم ص ۵۰۶، بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

۱۶۰ سے گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹ سے بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۴۵

۱۶۱ سے ایضاً ” ص ۹۹

تھے۔ اس کے علاوہ راماین کی نقل کرنے پر ان کو ۲۶ روپے آٹھ آنے دیے گئے تھے۔ یہ رام حریت
۱۸۰۶ء میں تیار ہوئی اور ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی۔

سدا مسر "نقلیات لقمانی" کے ترجمے میں بھی شریک تھے۔ گل کرسٹ نے اس کے جن تین مرتبین
کے لیے انعام کی سفارش کی تھی ان میں وہ بھی شامل تھے۔

۱۸۔ میر معین الدین فیض :

معین الدین کے بزرگوں کا آبائی وطن سمرقند تھا۔ ان کے بزرگوں نے سمرقند کو خیر باد کہہ کر دلی
کو اپنا مسکن بنایا، جہاں انھیں بڑا عروج حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک ریا کی داغ بیل
ڈالی۔ چونکہ وہ لوگ سادات تھے اس لیے جس محلے میں مقیم ہوئے اس کا نام سید واڑہ پڑ گیا۔ معین الدین
کے بزرگوں نے بارہ پشتیں یہیں گزاریں۔ ان کے آبا و اجداد کو بادشاہ کی خصوصی قربت حاصل
تھی۔ چنانچہ وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔

معین الدین کے والد کا نام سید فخر الدین اور دادا کا نام سید زین العابدین تھا۔ معین الدین دلی
ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ جب دلی بیرونی حملہ آوروں آماج گاہ بنی تو
معین الدین مع متعلقین غازی پور آئے۔ لیکن یہاں انھوں نے دلی کی طرح جاہ و حشمت اور شان
و شوکت کی زندگی نہیں بلکہ گوشہ عزلت کی زندگی اختیار کی۔

ایک زمانہ تھا جب گل کرسٹ نیل کی کاشت اور اپنے تعلیمی پروگرام کے تحت غازی پور میں مقیم
تھا۔ جب اسے معین الدین کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے انھیں بلا کر ملازم رکھ لیا۔ اس دوران
معین الدین ہندوستانی شعرا کے محاورات سے گل کرسٹ کو آگاہ کرتے تھے۔ اس طرح غازی پور
کے زمانہ قیام میں گل کرسٹ کے علم میں کافی اضافہ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ معین الدین نے بھی
گل کرسٹ کی معیت سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

گل کرسٹ کی غازی پور سے مراجعت کے بعد معین الدین اپنے کو بے یار مددگار اور بے مونس
و غم خوار سمجھنے لگے۔ چنانچہ وہ سیدھے کلکتہ پہنچے، جہاں بہادر علی حسینی نے ان کی پذیرائی کی۔ چند دنوں

۱۵ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۷۵

۱۵ ایضاً ص ۱۸۵

کے بعد معین الدین کو ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو تیس روپے ماہانہ مشاہرے پر منشی کے عہدے پر بحال کیا گیا۔ دوران ملازمت "چشمہ فیض" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی۔ "چشمہ فیض" شیخ فرید الدین عطار کی فارسی تصنیف "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ جاوید نہال نے اس کے دیباچے کی عبارت سے ۱۸۰۳ء کی تصنیف قرار دیا ہے۔ لیکن دیباچے کی اس عبارت "ستائیسویں جمادی الاول ۱۲۱۹ھ ہجری مطابق ۱۸۰۴ء عیسوی کو کلکتے میں دستخط سے میر معین الدین فیض کے یہ رسالہ ختم ہوا" سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۰۴ء میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ بھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا ۱۳۶ اوراق کو محیط خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے کی زینت بنا ہوا ہے۔

۱۹۔ سید علی جعفری :

ڈاکٹر جاوید نہال کا یہ خیال درست نہیں کہ "سید علی کو کالج کی باضابطہ ملازمت مل نہ سکی تھی"۔ سید علی جعفری میر شیر علی افسوس کے فرزند ارجمند تھے۔ افسوس نے ان سے "گلشن اخلاقی" کے نام سے ایک کتاب لکھوا کر مسٹر ٹیلر کی خدمت میں پیش کرائی، تاکہ وہ انھیں کالج میں ملازمت دلوا سکیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے وہ اپنی زندگی میں بیٹے کو کالج میں بحیثیت ملازم دیکھ نہیں سکے۔ کیونکہ اس کے کچھ دنوں کے بعد ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ان کی جگہ پر تارنی چرن مسٹر کوترتی ملی، اور اسی روز افسوس کی خدمات اور ان کے پس ماندگان کی پرورش اور دل جوئی کے پیش نظر ان کے بیٹے سید علی کو بھی چالیس روپے ماہوار پر شعبہ ہندوستانی میں ملازم رکھ لیا گیا ہے۔

۱۔ عتیق صدیقی، گل کر سٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰

۲۔ عتیق صدیقی نے اس کا نام "پند نامہ فرید الدین عطار" لکھا ہے۔ گل کر سٹ اور اس کا عہد ص ۱۸۴۔
۳۔ ہو سکتا ہے کالج کی کاروائیوں میں ہی نام ہو۔ لیکن تو سین میں "تذکرہ" کا اضافہ خلاف واقعہ معلوم پڑتا ہے۔

۳۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۹۱

۴۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۴۲

۵۔ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۸۴

ٹیلر اور مارٹن نے ۱۸۱۶ء میں جب شعبے کے منشیوں کا ہندوستانی اور فارسی میں امتحان لیا تو اس میں سید علی بھی شامل تھے۔^۱

پرائس کے عہد پر وینسری میں کالج میں ہندی زبان کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ چنانچہ اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی کی تعلیم پر توجہ مبذول کی۔ انھیں ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام پنڈت کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی امتحان دینے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سکریٹری رڈیل نے ۱۸ مئی ۱۸۲۵ء کو پرائس کو مطلع کیا کہ ۲۲ مئی ۱۸۲۵ء کے بعد انھیں جب موقع ملے منشیوں کا ہندی میں امتحان لیں۔ اس کے بعد ہندوستانی اور بنگلہ شعبے کے اکتیس منشیوں نے ہندی کا امتحان دیا، جن میں سید علی بھی شامل تھے۔ اس امتحان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان منشیوں میں زیادہ تر ”پریم ساگر“ اور ”راج نیتی“ بخوبی پڑھ سکتے تھے۔ لیکن وہ دیوناگری رسم خط نہیں لکھ سکتے تھے۔ مئی ۱۸۳۰ء میں منشیوں کے عہدے لگ بھگ ختم کر دیے گئے تھے، تاہم ہندوستانی اور فارسی شعبے میں چھ چھ اور بنگلہ میں صرف چھ منشی جون ۱۸۳۰ء میں موجود تھے۔ سید علی کا نام یہاں فارسی شعبے کے ذیل میں شامل ہے اور تنخواہ محض چالیس روپے درج ہے۔ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کالج سے کب تک منسلک رہے۔ فراین سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج سے ان کا تعلق ۱۸۳۲ء تک برقرار رہا ہوگا۔

”گلشن اخلاق“ سید علی کی واحد تصنیف ہے جسے انھوں نے ۱۸۰۹ء میں ملازمت سے قبل ترتیب دیا تھا۔ اس پر انھیں بیس روپے ملے تھے۔ یہ ابھی تک شرمندہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس کا ۱۳۰ اولاق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج ص ۹۲

۲۔ ایضاً ص ۱۲۳

۳۔ ایضاً ص ۳۰-۱۲۹

(ج) غیر معروف مصنفین

تصنیف	علاحدگی	ماہانہ تنخواہ	عہدہ	تاریخ تقرر	نام	سال شاعت
مسکین کے مریضے (شرعی) (مطبوعہ)	نامعلوم	۲۰ روپے	منشی	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	میر جعفر	۱۸۰۱ء
خوانِ نعمت (مطبوعہ)	نامعلوم	۳۰ روپے	منشی	۱۸۰۳ء	سید حمید الدین بہاری	۱۸۰۳ء
کلا کام (مطبوعہ)	۲۸ مارچ ۱۸۰۲ء	۲۰	"	۲ مئی ۱۸۰۱ء	کندن لعل	۱۸۰۲ء
حسن و عشق (گل دہر فر) (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	-	لائبریرین	ستمبر ۱۸۰۱ء	غلام حیدر عزت	۱۸۰۳ء
اخلاق النبی (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	۲۰ روپے	منشی	۲ مئی ۱۸۰۱ء	غلام اشرف	۱۸۰۲ء
تواریخ السلاطین (غیر مطبوعہ)	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	"	"	۲ مئی ۱۸۰۱ء	غلام شاہ بھیک	۱۸۰۳ء
قصہ دل و حسن (غیر مطبوعہ)	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	"	(شعبہ فاری) منشی	۲ مئی ۱۸۰۱ء	غلام اکبر	۱۸۰۳ء
تواریخ بنگالہ (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم
گل بکاولی (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم
تواریخ عالم گری (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	۳۰ روپے	"	۹ اگست ۱۸۰۳ء	محمد عمر	۱۸۰۳ء
تواریخ تیموری (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	۲۰ روپے	"	۱۲ نومبر ۱۸۰۳ء	میر تصدق حسین	۱۸۰۳ء
دعاس (غیر مطبوعہ)	نامعلوم	۲۰ روپے	"	۹ اگست ۱۸۰۳ء	غلام سجون	۱۸۰۳ء

۱۔ عتیق صدیقی نے کندن لعل کو غیر ملازم مصنفین کے زمرے میں شامل کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے اگل کرٹ اور اس کا عہدہ ص ۲۰۰)

۲۔ دعاس روک کے بقول ستمبر ۱۸۰۱ء میں غلام حیدر لائبریرین مقرر کیے گئے (جو انورٹ ولیم کالج کی ادنیٰ خاں صاحب ۱۹۴۲ء) ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے مطابق ۱۸۲۵ء میں کالج کے جن منشیوں نے ہندی کا امتحان دیا تھا، ان میں غلام حیدر شامل تھے اور ۱۸۲۲ء کی جو تفصیل درج کی ہے اس میں انھیں بندوستانی و فارسی شے کا سرپرستہ ڈاکٹر ہے اور ان کی تنخواہ چالیس روپے درج کی ہے۔ انورٹ ولیم کالج ص ۱۲۳ ص ۱۲۸) مئی ۱۸۰۵ء سے قبل غلام حیدر کالج سے علاحدہ ہو چکے تھے۔ عتیق صدیقی نے انھیں بھی غیر ملازم مصنفین کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ اگل کرٹ اور اس کا عہدہ ص ۲) ۳۔ میر تصدق حسین نے کچھ دنوں تک لائبریری میں بھی کام کیا۔ بعد میں ان کی خدمات شعبہ فاری میں منتقل کر دی گئیں اسی شعبے سے انھوں نے استعفا دیا تھا۔

کالج کے غیر ملازم مصنفین

اس ضمن میں ان مصنفین کا ذکر کیا جائے گا جو فورٹ ولیم کالج کے ملازم تو نہیں تھے لیکن کالج کے زیر اثر اردو نثر کی خدمت کرنے والوں کے سلسلۃ الذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے کارنامے بجا طور پر اردو زبان و ادب کا قابل قدر سرمایہ کہے جانے کے مستحق ہیں ان کا ذکر ذرا تفصیل سے اور باقی مصنفین کا ذکر نہایت اختصار و ایجاز سے کیا جائے گا۔

رائے بینی ناراین دہلوی :

رام بابو سکسینہ سے لے کر جاوید نہال اور شجاعت علی سندیلوی تک تمام مصنفین نے بینی ناراین کو فورٹ ولیم کالج کے مستقل متوسلین میں شمار کیا ہے، لیکن یہ خیال سر اسر خلاف واقعہ ہے، کیونکہ یہ بات متحقق طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بینی ناراین کا کوئی تعلق فورٹ ولیم کالج سے نہیں تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں

”... کالج سے بہ حیثیت ملازم ان (بینی ناراین) کے تعلق کی کوئی ضعیف شہادت بھی موجود نہیں انھوں نے (اپنی) تصانیف میں جا بجا اپنے مشاغل علمی کے سلسلے میں ارباب کالج کی طرف سے دامے، درمے، سمنے حوصلہ افزائی اور قدر دانی کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے لیکن کالج سے باضابطہ توسل کی طرف کوئی مبہم اشارہ بھی نہیں کیا جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ کسی وقت بھی کالج کے ملازمین کے زمرے میں شامل نہیں رہے۔“

ان کی مشہور تصنیف ”دیوان جہاں“ کی وجہ سے لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی عام ہو گئی ہے کہ بینی ناراین ایک کامیاب شاعر تھے اور ”جہاں“ تخلص کرتے تھے لیکن معتبر روایات اور مستند ماخذ اس عام خیال کے خلاف ثبوت فراہم کرتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر حنیف نقوی متذکرہ مفروضے کو

لے ششماہی ”نوائے ادب“ بمبئی، اپریل ۱۹۷۷ء ص ۱۲

رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

” ایک اور غلط فہمی جو۔۔۔ زیادہ عام اور مقبول ہے، یہ ہے کہ بینی نرائین شاعر بھی تھے اور جہاں تخلص کرتے تھے۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بینی نرائین نے ”دیوان جہاں“ کا دیباچہ نظم میں لکھا ہے اور دوسری تصانیف میں بھی موقع موقع طبع زاد اشعار شامل کیے ہیں، لیکن نہ تو انھوں نے ”دیوان جہاں“ میں خود کو یہ حیثیت شاعر متعارف کرا کے شعر گوئی سے اپنے شغف کی نشاندہی کی ہے اور نہ کسی دوسرے معتبر ذریعے سے ان کا باقاعدہ شعر کہنا ثابت ہے۔ اس طرح یہ بات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ وہ جہاں تخلص کرتے تھے۔ ”دیوان جہاں“ کے دیباچے میں انھوں نے آخری سے پہلے شعر میں اپنے مکمل نام ہی کو بطور تخلص نظم کیا ہے۔ یہی مقطع بعینہ ”باغ عشق“ کے دیباچے میں بھی شامل ہے کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر تخلص کی موجودگی میں نام کے اس استعمال کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔“

بینی نرائین کے والد کا نام رائے شدشت نرائین اور دادا کا نام کھیمی نرائین تھا۔ ان کا قدیم وطن لاہور تھا لیکن پانچ پشتوں سے ان کے آباؤ اجداد نے دہلی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ بینی نرائین دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شدشت نرائین کے انتقال کے بعد بینی نرائین اپنے بڑے بھائی کھیم نرائین کے ساتھ ۱۷۷۱ء کے قریب لکھنؤ آئے، جہاں آندہ کو آصف الدولہ کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ اس درباری توکل کے بعد دونوں بھائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۸۰۲ء میں کھیم نرائین رند نواب سعادت علی خاں کے وکیل کی حیثیت سے لارڈ ولزلی کے ساتھ لکھنؤ سے کلکتہ گئے۔ بینی نرائین بھی اس ”فرہنگ

۱۷۷۱ء نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۷-۱۶

۱۷۷۱ء کھیم نرائین رند طبیب و صاحب دیوان شاعر تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان میں میر، سودا اور میر سوز سے ان کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ ”رند نواب“ میں ”قول“ مت گاہ رکھتے تھے اور مہاراجہ ٹکیت نے دیوان آصف الدولہ کی رفاقت میں اسرافات کرتے تھے۔ رفاقتی تحریریں

کے ہم رکاب تھے۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد رند فورٹ ولیم میں قیام پذیر ہوئے، لیکن چار سال کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا جس کی وجہ سے انھیں فورٹ ولیم چھوڑنا پڑا اور وہ کلکتہ ہی میں ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں طبابت کے پیشے کو انھوں نے اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

گمان غالب یہ ہے کہ بینی ناراین بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ فورٹ ولیم ہی میں مقیم رہے ہوں گے اور انھیں کالج کے دور عروج میں اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوا گا۔ کالج کے ارباب حل و عقد کی طرف سے شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی اور قدر و منزلت دیکھ کر ممکن ہے ان کے دل میں بھی کالج کی ملازمت حاصل کرنے یا کم از کم انعام پانے والے مصنفین کی فہرست میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش ہوئی ہو۔ بہر صورت اسی قسم کی کسی ترغیب کے تحت انھوں نے دو تین کتابیں لکھ کر "صاحبان عالی شان" کی نذر کیں۔ ان کتابوں کے دیباچوں میں بینی ناراین نے دل کھول کر ارباب کالج کی علم دوستی اور معارف پروری کے گن گائے ہیں لیکن یہ تمام کوششیں ان کے لیے کالج کی ملازمت کے دوروازے نہ کھول سکیں۔ البتہ حصول انعام میں انھیں ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔

بین ناراین کے متعلق یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ آخری عمر میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے لیکن دوسری کئی روایات کی طرح یہ خیال بھی

(باقی حاشیہ پچھلے صفحے کا) آخری عمر میں کلکتہ جا رہے تھے اور ہو گلی میں مکان بنا لیا تھا۔ مولوی حفیظ الدین شہیدان کے نامور شاگرد تھے (جمنائے جاوید جلد سوم ص ۵۱۲) رند نے لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنا دیوان جس میں ہر قسم کے شعر موجود تھے مرتب کر لیا تھا اسکے علاوہ وہ فارسی میں "قصہ چار درویش"، "افسانہ حسن و عشق" اور "قصہ سرانجھا" کے ناموں سے تین داستانیں، "حسن آداب و اخلاق" سے متعلق دو رسالے اور "باغ و بہار" اور "گوشہ شاہمولانا" دو مثنویاں بھی تصنیف کر چکے تھے۔ جب نواب سعادت علی خاں کے دکن کی حیثیت سے وہ کلکتہ پہنچے تو شہر میں دو کے رواج عام اور ارباب کالج کی سرپرستی و فیض رسانی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۸۰۹ء میں "افسانہ جان و دل" یا "چهار باغ" کے نام سے ایک حکایت نگین "لکھ کر بہ نظر قدر زانی ڈاکٹر ولیم نپٹر کی نذر کی۔ ان کی اس پیش کش سے انھیں کوئی فائدہ پہنچا نہیں، اس بارے میں تمام ذرائع معلوماً خاموش ہیں اس داستان کا ایک قلمی نسخہ سر سالار جگ موہن جید آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ زندگی دوسری کسی تصنیف کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

قطعاً خلاف حقیقت ہے۔ ان کی زندگی کے دوسرے متعدد گوشے ابھی تک پردہ تاریکی میں ہیں سید محمد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا تھا۔

تصانیف :-

(۱) چار گلشن۔ یہ بنی ناراین کی طبع زاد تصنیف ہے جسے انھوں نے ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) میں تصنیف کیا تھا۔ "چار گلشن" کے مرکزی کردار کیوان شاہ اور فرخندہ ہیں۔ کیوان شاہ یورپ دیش کا بادشاہ اور فرخندہ ہندوستانی بادشاہ بید ازخمت کی بیٹی ہے۔ قصہ آسان اور عام فہم زبان میں ہے جس میں کوئی تعقید نہیں۔ اس کے دو ٹی نسخے برٹش میوزیم لندن اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس کی تصنیف پر بنی ناراین کو ۶۰ روپے انعام ملے تھے۔

(۲) بہار عشق۔ بنی ناراین نے اس کتاب کا ذکر "نوبہار" کے دیباچے میں کیا ہے جس کے مطابق انھوں نے "چار گلشن" کی تصنیف کے بعد "قصہ دل آرام" کو بعبارت خوب و مرغوب تصنیف کر کے شہر میں رواج دیا تھا اور نام اس کا "بہار عشق" رکھا تھا۔ اب تک ہندوستان یا بیرون ہند کے کسی کتب خانے میں اس داستان کا کوئی نسخہ دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی اسے برنائے قیاس ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء کے قریب کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ عبیدہ بیگم نے اسے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ لیکن بقول بنی ناراین اسے "شہر میں رواج دیا ہے" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے فورٹ ولیم کالج کے لیے نہیں لکھا تھا۔

(۳) گلزار حسن۔ بنی ناراین کی اس داستان کا بھی کوئی نسخہ بظاہر محفوظ نہیں۔ اس میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا گیا تھا جسے فارسی اور اردو کے کئی شاعر نظم کر چکے ہیں۔ بنی ناراین کے بقول ان سے پہلے کسی شخص نے اس قصے کو فارسی سے "ہندی" (اردو) میں ترجمہ کیا تھا لیکن عذرت اس کی معلق اور بے محاورہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اسے از سر نو نظم و نثر کا زیور پہنا کر زبان

لے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر سید حنیف نقوی کا مضمون "رائے بنی ناراین دیوان نوائے ادب اپریل ۱۹۰۰ء

۱۰۴ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۴

۱۱ نوائے ادب، اپریل ۱۹۰۰ء ص ۲۵

۱۲ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۲۸

اردو کے معنی میں تصنیف کیا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے مختلف شواہد کی بنا پر اس کا سال تصنیف ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۱۲ء متعین کیا ہے۔ اسے بھی عبیدہ بیگم نے کالج کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ جبکہ بینی ناراین نے اس کو بھی ”شہر میں رواج دیا لکھا ہے۔“

(۴) دیوان جہاں۔ بینی ناراین کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبولیت ”دیوان جہاں“ کو حاصل ہے۔ ”دیوان جہاں“ کو عام طور پر تذکروں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن دراصل یہ تذکرہ نہیں بلکہ بیاض منتخبات کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں شعرا کے حالات بہت ہی اختصار و ایجاز کے ساتھ لکھے گئے ہیں جبکہ کلام کے انتخاب میں بڑی فراخ دلی سے کام کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۲۹ اشعار کا کلام شامل ہے۔ یہ ۱۸۱۲ء میں مرتب ہوا تھا۔ لکشمی ساگر وارث نے شاید اسی کے متعلق لکھا ہے کہ ”میلر کے کہنے پر بینی ناراین کو ان کے ہندوستانی ولودھ سنگرہ (Miscellany) کے لیے اتنی روپیے ملے تھے۔ ۳۰ پروفیسر کلیم الدین احمد نے ۱۹۵۹ء میں پٹنہ کالج کے تحقیقی رسالے ”کرنٹ اسٹڈیز“ کے ایک خاص نمبر کے طور پر شائع کر دیا ہے۔“

(۵) تفریح طبع۔ اس کا واحد قلمی نسخہ جو اب تک دریافت ہوا ہے ڈاکٹر حنیف نقوی کی ملکیت ہے۔ اسے بینی ناراین نے ۱۸۱۷ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے دیباچے کا ابتدائی حصہ منظوم ہے اس کے بعد بینی ناراین نے اپنا مختصر حال اور سبب تالیف نثر میں لکھا ہے، لیکن دیباچے کا اختتام نظم ہی پر ہوا ہے۔ یہ مختلف نقلوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر انتہائی فحش اور مبتذل ہیں۔

(۶) لوزبہار۔ یہ کتاب ”گل و صنوبر“ (فارسی) کا ترجمہ ہے جسے بینی ناراین نے ۱۸۲۲ء میں مکمل کیا تھا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ حکیم سید محمد تقی حسن بلخی متوطن فتوح ضلع پٹنہ کی ملکیت ہے۔ بینی ناراین نے اسے منشی امام بخش کی ترغیب پر کالج کے لیے لکھا تھا۔

(۷) باغ عشق۔ یہ عبدالرحمن جامی کی ”لیلیٰ مجنوں“ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۲۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کا

۱۷ لوزائے ادب بینی اپریل ۷۷ء ۶۱۹ ص ۲۴

۱۸ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۲۹

۱۹ فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۵

واحد قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(۸) تنبیہ الغافلین۔ یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحب زادے مولانا شاہ رفیع الدین کی فارسی تصنیف ”تنبیہ الغافلین“ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے گارسن ڈی لسی کو یہ دھوکا ہوا کہ بنی ناراین مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ ۱۸۲۸ء میں ترجمہ ہوئی ہے۔

مرزا علی لطف :

رام بابو سکسینہ، سید محمد اور جاوید نہال نے مرزا علی لطف کو کالج کے ملازمین کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ لیکن جاوید نہال نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”پتا چلتا ہے کہ کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ کالج کے باقاعدہ متوسلین میں کبھی شامل نہیں رہے۔ چنانچہ عتیق صدیقی نے بھی انھیں کالج سے غیر متعلق مصنفین کی صف میں جگہ دی ہے۔ عبیدہ بیگم نے بھی ان کے حالات قلم بند کیے ہیں لیکن کالج کی ملازمت کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔“

لطف کے بزرگوں کا وطن اسطرآباد تھا۔ جب نادر شاہ ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوا تو ان کے والد مرزا کاظم بیگ خاں بھی اس کے ساتھ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وسالت سے انھیں دربار شاہی میں خاصار سوخ حاصل ہو گیا تھا۔ وہ فارسی کے شاعر تھے اور پھر تخلص کرتے تھے۔

لطف کی ولادت جاوید نہال کے اندازے کے مطابق ۱۷۷۶ء اور ۱۷۷۴ء کے درمیان دلی میں ہوئی تھی۔ جس زمانے میں دلی مہٹوں کی تاخت و تاراج کا مرکز بنی ہوئی تھی وہاں سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ چلے آئے اور آصف الدولہ کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔

۱۔ تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۱۱۲ اور باڈنٹر اردو ص ۱۲۵ اور ایسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۳

۲۔ ایسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۸

۳۔ گل کر سٹ اور اس کا ادب ص ۲۰۰

۴۔ نوٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۰-۲۰۴

۵۔ ایسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۳

آصف الدولہ کے انتقال (۱۷۹۷ء) کے بعد وہ پٹنہ پہنچے۔ ۱۸۰۰ء کے اواخر میں وہ پٹنہ سے مرشد آباد منتقل ہو گئے، اس کے بعد ۱۸۰۱ء کے اوائل میں وہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن افسوس سے ملنے کی عرض سے کلکتہ میں رک گئے۔ یہاں ان کی ملاقات گل کرسٹ سے ہوئی جس کے ایما پر انھوں نے "گلشن ہند" لکھا۔ اس تصنیف پر انھیں کالج کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں ان کی بڑی آدبگت ہوئی۔ چنانچہ چار سو روپے ماہوار کی ملازمت کے ساتھ انھیں ریاست کی طرف سے سواری کے لیے ایک پالکی بھی عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ تاجر حیدرآباد ہی میں مقیم رہے۔ ۱۸۲۲ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

لطف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، فارسی میں وہ بقول خود اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے اور ریختہ میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ شیخہ مولف "گلشن بے خار" نے انھیں میر کا شاگرد بتایا ہے لیکن "سخن شعرا" کے مولف لٹاخ اس کی تردید کر چکے ہیں۔

لطف نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ جس میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی شامل تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔ "گلشن ہند" ان کی واحد تصنیف ہے جو علمی و ادبی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اور جس کی بدولت تاریخ ادب میں آج بھی ان کا وقار قائم ہے۔ یہ علی ابراہیم خاں کے مشہور تذکرے "گلزار ابراہیم" کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ لطف نے بقول خود اس کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلی جلد "سلاطین نامدار" و "امراء عالی مقدار" اور "شعراء صاحب وقار" کے لیے جو "نام آور اور صاحب دیوان" تھے، مخصوص کی گئی تھی اور دوسری جلد میں "شعراء گننام وغیر مشہور و نو مشق" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس تذکرے کی صرف پہلی جلد دستیاب ہے۔ دوسری جلد کا حال کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ جلد اول صرف اڑسٹھ (۶۸) شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ لطف نے اس میں علی ابراہیم خاں کے فراہم کردہ حالات اور کلام دونوں پر اہم اضافے کیے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب

لے بحوالہ ارباب نشر اردو ص ۱۲۷ اور انیسویں صدی میں بنگال کار داد ص ۳۲۴

سے مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اسے "گلزارِ ابراہیم" کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

نہال چند لاہوری :

نہال چند لاہوری کے متعلق بھی رام بابو سکسینڈ، سید محمد، سید رفیق مارہروی، جاوید نہال اور نادم سیتا پوری نے لکھا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے یہ لیکن یہ خیال بھی سراسر خلا واقعہ ہے۔ اس غلط فہمی کا منبع دراصل نہال چند کی تصنیف "مذہبِ عشق" کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ خاکسار ڈیوڈ روبرٹسن (David Robertson) بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا، انھیں کی دست گیری سے صاحبِ خداوند نعمت حاتم زماں، دستگیر درماندگان، منبع جو دو عطا سرِ حشر فیض و سخا، دریائے عنایت و کرامت بحر احسان و شجاعت، جناب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہ اللہ تعالیٰ کے دامن تک رسائی ہوئی۔" گل کرسٹ تک رسائی پانے اور کالج کی ملازمت میں بڑا فرق ہے۔ مذکورہ بالا حضرات نے اسی فرق کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے دھوکا کھایا ہے۔ گل کرسٹ بہت سے ایسے مصنفین کو اپنے گرد جمع کر کے ان سے تصنیف و تالیف کا کام لیتے آ رہے تھے جن کا کالج ت براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ نہال چند کا یہ جملہ کہ "غرض صاحب بہادر کے تفصیلات سے اس ضعیف کی اوتار سزبونی لگی اور آگے کو بھی امید بندھی۔" اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گل کرسٹ تک رسائی کے بعد انھیں وقتی طور پر کچھ راحت مل گئی تھی اور وہ کالج میں ملازمت کے لیے ان کے چشمِ گرم کے امیدوار تھے۔ عتیق صدیقی نے بھی انھیں کالج کے غیر ملازم مصنفین کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

۱۔ تاریخ ادب اردو، حصہ ۱، ص ۱۱۲، باب ۱۲، نثر اردو، ص ۶۲، بندوں میں اردو، ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴

نہال چند نے "مذہب عشق" کے دیباچے میں اپنے جس قدر حالات لکھے ہیں ابھی تک ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ ان کے نام کے بعد لاہوری اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے۔ لیکن ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں گل کرسٹ نے انھیں بارہا سوت کا متوطن قرار دیا ہے۔ "مذہب عشق" کے علاوہ ان کی کسی اور تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ "مذہب عشق" اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس کے مطابق اس کا سال تصنیف ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۳ء) دیا گیا ہے۔ اس میں تاج الملک اور گل بکاولی کا مشہور قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کا ماخذ نہال چند کی لکھی ہوئی یہی داستان ہے۔ یہ ۱۸۰۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس ترجمے پر انھیں ۵۰ روپیے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ کتاب کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دوری اور تیسر بار (افسوس اور روبک کی نظر ثانی کے بعد) کالج کی طرف سے شائع کی گئی۔

مرزا جان طیش :-

عبیدہ بیگم لکھتی ہیں کہ "طیش"۔۔۔ ۱۸۰۸ء میں۔۔۔ پنجاب کے شاعر ہندوستانی سے وابستہ ہو گئے۔ لہٰذا اگے لکھتی ہیں "طیش غالباً ۱۸۱۱ء تک شاعر سے وابستہ رہے۔ لیکن انھوں نے ان بیانات میں کسی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طیش نے کبھی کالج کی ملازمت اختیار نہیں کی۔ کالج کے غیر ملازم مصنفین میں طیش ممتاز خیت کے مالک ہیں۔ ان کا اصل نام محمد اسماعیل عرف مرزا جان تھا۔ ان کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے جہاں سے ان کے ایک بزرگ تیمور کے حملے کے وقت ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور دلی میں آباد

لہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۹۰

لہ نسیم کے مندرجہ ذیل اشعار اس حقیقت کے اعتراف پر دلالت کرتے ہیں

افسانہ گل بکاولی کا افسوں بویہار عاشقی کا
 ہر خند سنا گیا ہے اس کو اردو کی زبان میں سخن گو
 وہ نثر ہے، دادِ نظم دوں میں اس مے کو دو آتشہ کردوں میں

لہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۸۴

ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر فیلین کے بقول طیش ۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۸۷) میں دلی میں پیدا ہوئے۔
 انھوں نے نشوونما اور تعلیم و تربیت بھی وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرزا جہاندار شاہ جو اس بخت
 کی سرکار سے منسلک ہو گئے۔ جب امیر الامرا فراسیاب خاں کے خوف سے شاہزادہ موصوف
 نے دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ کی طرف کوچ کیا (۲۳ جمادی الاول ۱۱۹۸ھ / ۱۲ اپریل ۱۷۸۲ء) تو طیش
 بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ ڈھائی برس لکھنؤ میں قیام کر کے وہ شاہزادے کے ساتھ اکتوبر ۱۸۸۶ء
 میں بنارس آئے۔ شاہزادے کے انتقال (۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ / ۲۱ مئی ۱۷۸۸ء) کے بعد انھوں نے
 بنارس سے مرشدآباد کا رخ کیا، اور عشقی کے بقول وہاں نواب بہر جنگ کی سرکار سے توسل کی بدولت
 ”فراخی حال“ کے ساتھ ان کی گزراوقات ہونے لگی۔ مرشدآباد کے بعد طیش کی اگلی منزل ڈھاکا تھی
 جہاں انھیں شمس الدولہ سید احمد علی خاں نواب ڈھاکا کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا۔
 لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر ”حکیم صاحبان عالی شان کونسل“ شہر کلکتہ
 میں مجسوس کر دیے گئے۔ اس ”بلائے ناگہانی“ سے انھیں کئی برس کے بعد نجات حاصل
 ہوئی اور وہ کلکتہ ہی میں رہنے لگے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ کلکتہ سے دلی چلے آئے اور غالباً وہیں ان کا
 انتقال بھی ہوا۔ اسپرنگر کے بقول ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۶ء سے قبل ان کی وفات ہو چکی تھی۔ قاضی
 عبدالودود کے مطابق ان کا انتقال غالباً ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۷ء) میں ہوا تھا۔

طیش خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ انھیں ساحل اور ہدایت اللہ خاں کی شاگردی
 کا بھی شرف حاصل تھا۔ ان کا شمار اپنے دور کے خوش گو شعرا میں ہوتا تھا، لیکن ان کا کلام قدیم وایا
 کا آئینہ دار ہے اور آج کے قارئین و ناقدین کے لیے جدت و ندرت کا کوئی پہاؤ نہیں رکھتا۔ لکھنؤ کے

۱۷ بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۱۰-۲۰۹ لیکن جاوید نہال ان کی پیدائش ۱۷۸۰ء اور ۱۷۹۲ء کے

درمیان بتاتے ہیں (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۲۳)

۱۷ کلیم الدین احمد، دو تذکرے جلد دوم ص ۵۵۔

۱۸ ایضاً ص ۵۵

۱۹ بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۲۱۲

۲۰ نقوش لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء

زمانہ قیام میں انھوں نے ”مرزا جہاندار شاہ کے حکم سے اپنے دیوان کو مرتب کر کے اس کا تاریخی نام ”گلزار مضامین“ رکھا تھا۔

کلکتہ میں دوران اسیری پیش نے ۱۸۰۲ء میں عنایت اللہ کنبوہ کی فارسی مثنوی ”بہار دانش“ کا منظوم اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام بھی ”بہار دانش“ ہی رکھا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے ارباب کالج کی مدح میں کچھ اشعار شامل کر کے ان کی نذر کی۔ اس پر انھیں کالج کی طرف سے پانچ سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ اس زمانے میں شائع نہیں ہو سکی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں مطبع محمدی کلکتہ میں زیور طباعت سے مزیں ہوئی۔

”شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان“ پیش کی دوسری مشہور تصنیف ہے جو ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲-۹۳ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ فارسی زبان میں اردو محاورات اور ضرب الامثال کا ایک مختصر لغت ہے جس میں بہ کثرت اردو اشعار بطور سند پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں مطبع آفتاب عالم مرشد آباد میں چھپا تھا۔ حال ہی میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدانخش لاہوری کے جنرل کے ایک شمارے میں اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

باسط خاں باسط:

باسط خاں شاہ عالم کے عہد حکومت میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو ان کے والد مردان خاں نے حالات کی نامساعدت کی بنا پر دلی سے ترک وطن کر کے عظیم آباد (پٹنہ) کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ باسط کی تعلیم و تربیت عظیم آباد کے صوبے دار کلیان سنگھ کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کچھ دنوں تک نواب دلاور جنگ کی سرکار سے وابستہ رہے، بعد ازاں ولزلی کے زمانے میں پٹنہ سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں ارباب کالج کی سرپرستی اور قدر دانی نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ ”اگر تو بھی کوئی قصہ لکھ کر سرکار بہادر کی خدمت میں گزارے تو تو بھی فیض پاوے۔ چنانچہ انھوں نے ایک مجموعہ ”گلشن ہند“ کے نام سے تصنیف کر کے گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کی۔

”گلشن ہند“ چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور قصہ حسن ملوک کا مجموعہ ہے، جس میں ”گل و صنوبر“

۱۔ عبد الغفور نساخ، قطعہ منتخب ص ۱۶۷ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۳، ۱۰۴

کا قصہ بھی شامل ہے۔ حسن ملوک کا قصہ اور حکایتیں طبع زاد ہیں۔ لیکن ”گل و صنوبر“ فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔ ”گلشن ہند“ ۱۸۰۳ء میں ترتیب دی گئی تھی۔ کلج کی کاروائیوں میں اس کا نام ”گل و صنوبر“ ہی درج ہے۔ گل کرسٹ کے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں کتابوں کی جو فہرست شامل تھی اس میں اسے مطبوعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس نے ۱۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جو فہرست پیش کی تھی اس میں ”میکل اور پریس میں جانے کے لیے تیار“ کے زمرے میں اسے درج کیا ہے۔ ان دونوں فہرستوں میں ”گلشن ہند“ کے لیے ستر روپے انعام کی سفارش کی گئی تھی۔ لیکن کونسل نے اس پر انعام دینا منظور نہیں کیا۔ یہ سوز شائع نہیں ہو سکی۔

(ب) غیر معروف مصنفین

نام	تصنیف	ماخذ	سال تالیف یا عت سال اشاعت	کیفیت
۱- میر ابو القاسم خاں	حسن اختلاط (مطبوعہ)	- - -	۱۸۰۳ء	گل کرسٹ نے اس پر پچاس روپے انعام کی سفارش کی تھی لیکن انہیں انعام کی کوئی رقم نہ مل سکی۔ موضوع کے اعتبار سے یہ تاریخی کتاب ہے۔
۲- توتارام	قصہ دل کارام دل بہا (مطبوعہ)	طبع زاد	۱۸۰۳ء	اسکے مطبوعے نسخے کا کہیں تانہیں چلتا، البتہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔
۳- شیخ محمد بخش	۱۱) وہ مجلس (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	وہ مجلس	۱۸۰۳ء	منظہر علی خاں دلائے اسکی اصلاح کی تھی اور جن نظموں کا ترجمہ نثر میں کیا گیا تھا انہیں نظم میں منتقل کیا۔ اصلاح کا کام ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا۔
	۱۲) قصہ فیروز شاہ (مطبوعہ)	- - -	۱۸۰۳ء	اس تصنیف پر محمد بخش کو پچاس روپے بطور انعام ملے تھے۔
	۱۳) قصہ فرعون (غیر مطبوعہ)	- - -	۱۸۰۳ء	

۱۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۸۸ لے ایضاً ص ۱۹۱
 ۲۔ ڈاکٹر جاوید نبیل کا یہ خیال خدان واقف ہے کہ شیخ محمد بخش اردو اور فارسی شعبے کے ملازم تھے۔ (بیسویں صدی میں بنگال کا اردو)

نمبر	نام	تصنیف	ماخذ	سال تالیف سال اشاعت	کیفیت
۴-	شاگر علی	الف لیله (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	الف لیله	۱۸۰۳ء	
۵-	مرزا منگل شاہ	باغ سخن (غیر مطبوعہ)	بوستان سعدی	۱۸۰۳ء	اس ترجمے پر نشان کو چار سو روپے دیے گئے تھے۔
۶-	نور خاں	مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر (غیر مطبوعہ)	---	۱۸۰۴ء	یہ ۱۱۸۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا قلمی نسخہ لائبریری میں موجود ہے۔ آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔
۷-	نور علی	بہار عشق (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	نیل دمن	۱۸۱۰ء	نور علی کو اس ترجمے پر کالج کی طرف سے پچاس روپے عطا کیے گئے تھے۔
۸-	محمد علی	شہنامہ ہندی (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	شمشیر خانی	۱۸۱۱ء	
۹-	مرزائی بیگ	بدیادین (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	اودھ بلاس	۱۸۱۴ء	اس کی لپی ناگری اور زبان ہندی ہے۔

۱۰- ڈاکٹر عبیدہ بیگ نے نور علی کو شعبہ ہندوستانی کے منشیوں میں شامل کیا ہے جو درست نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۸۶

دوسرا باب

دلی کالج

دلی کالج

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

دلی کالج ہندوستان کا دوسرا عظیم و وسیع تعلیمی و تصنیفی اور اشاعتی ادارہ تھا جو انگریزوں کی فکر رسا کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس ادارے سے ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو کو وہ فروغ ملا جو فورٹ ولیم کالج سے بھی نہ ملا تھا۔ اس لئے کہ فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں ان میں محدودے چند کو چھوڑ کر باقی قصہ اور کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن دلی کالج میں مختلف موضوعات مثلاً ادبیات، اخلاقیات، سائنس اور علوم جدید، تاریخ اور جغرافیہ، ریاضیات، قانون، طب زراعت وغیرہ پر کتابیں تالیف، تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ اس طرح مختلف موضوعات اور شعبہ ہائے زندگی سے اردو کی شناسائی ہوئی۔ اس اعتبار سے دلی کالج کا پلہ فورٹ ولیم کالج سے کہیں بھاری ہے۔ دونوں کالجوں کے قیام میں کوئی زیادہ وقفہ بھی نہیں۔ یہی کوئی پچیس سال کا۔ لیکن اس مختصر مدت میں دونوں کالجوں کے مقاصد قیام میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ولایت سے نوازا انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص اردو سے واقف کرانا تھا، تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی باشندوں سے انفرادی اور سرکاری معاملات میں گفت و شنید کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کو فروغ دے سکیں، بلکہ اس کی حکومت کو مضبوط و مستحکم اور پائیدار بنا سکیں۔ لیکن اس کے بالعکس دلی کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانی لوجواؤں کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور انگریزی زبان سے واقفیت بہم پہنچانا تھا۔ دلی کالج میں روز اول سے مشرقی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو و ہندی کی تعلیم کا انتظام کماحقہ طور پر تھا۔ اس کالج نے اردو زبان

و ادب کی جو پیش بہا خدمات انجام دیں ان سے انکار سورج کی روشنی سے انکار کے مترادف

ہے۔

دلی کالج کے قیام میں دو جماعتیں نمایاں طور پر سرگرم نظر آتی ہیں۔ پہلی جماعت وہ تھی جو عیسائی افکار و نظریات کی حامل تھی، اس کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے تو وہ اس کی وساطت سے عیسائیت کا مطالعہ کریں گے جسے وہ آسانی سے قبول بھی کر سکتے ہیں۔ ولبر فورس (Wilber Force) اور چارلس گرانٹ اسی گروہ کے نمائندے تھے۔ ولبر فورس انگلینڈ کی پارلیمنٹ کا ایک سرگرم رکن تھا، جو مذہبی خیالات و نظریات سے مرثارا اور اس زمانے کے عیسائیوں کی مذہبی، اخلاقی اور نیم سیاسی جماعت فرقہ کلاہم (Clapham) کا نفس ناطقہ اور روح رواں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمپنی ولایت سے لیے تجربہ کار اشخاص ہندوستان بلائے جو مدرسے کے علاوہ مشنری کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔ دوسری شخصیت چارلس گرانٹ کی تھی۔ چارلس گرانٹ پہلی بار اکیس برس کی عمر میں ۱۷۷۷ء میں کلکتہ آیا اور ۱۷۷۹ء کے قحط میں خرابی صحت کی وجہ سے ولایت واپس گیا۔ دوسری بار ۱۷۷۳ء میں وہ کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے ہندوستان آیا لیکن عیش عشرت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے جلد ہی کافی مقروض ہو گیا علاوہ بریں اس کی دو بچیاں چھپک کی شکار ہو گئیں جس سے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ اس نے اوباشی اور بد اطواری سے بچنے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ گزشتہ گناہوں کی تلافی کے لیے وہ عیسائی مشنوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت زیادہ حصہ لینے لگا۔ بالآخر ۱۷۷۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر ولایت چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ولبر فورس سے ہوئی۔ یہ ملاقات گرانٹ کے مذہبی افکار و خیالات پر بہت اثر انداز ہوئی۔ گرانٹ نے ایک کتابچہ آبنر ویشنری (Observations) لکھا، جس میں اس نے ہندوستانیوں کو تبلیغ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تجویز پیش کی اور اس کی پہلی منزل یہ بنائی کہ ہندو

لے مالک رام، قدیم دلی کالج ص ۱۹

۱۷ کتابچہ کا پورا نام تھا۔
Observations on the state of Society among
the Asiatic subjects of Great Britain, particularly with respect
to morals; and the means of improving it.

میں انگریزی زبان کی تعلیم کا عام رواج ہونا چاہیے۔ سید نور اللہ اور نایک کے حسب تحریر۔
 ”اس سلسلے میں برطانوی رائے علما کو موافق بنانے اور پارلیمنٹ کو ہندوستانی عوام
 کی تعلیم کی فوری ضرورت کا احساس دلانے میں ”ابزرولیشنس“ (گرانٹ کے کتابچے)
 نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ یہ کتاب، ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی اور اس کی بہت سی جلدیں تقسیم
 ہوئیں۔ مشنریوں کے دوستوں نے اسے اپنے احتجاج کی بنیاد بنایا۔“ ۱۰
 دوسری جماعت وہ تھی جو الیٹ انڈیا کمپنی کے قدیم اور اعلا ملازمین و کارپردازوں پر مشتمل تھی اور
 ہندوستان کے قیام کے دوران مشرقی زبانوں خصوصاً عربی اور فارسی سے بڑی حد تک واقف ہو گئی تھی،
 اس گروہ کی تجویز تھی کہ مشرقی زبانوں کے قدیم علمی و ادبی ذخیرے کو طبع کرا کے محفوظ کر دینا چاہیے اور
 آئندہ ہندوستانی کالجوں اور مدرسوں میں ان زبانوں کی تعلیم و ترویج کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔
 نور اللہ اور نایک نے کمپنی کے ملازمین کی اس تجویز کا مجمل نقشہ یوں کھینچا ہے۔

”جس وقت مشنری انگلستان میں کمپنی کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کے لیے احتجاج کرتے تھے،

اس وقت ہندوستان میں کمپنی کے حکام مشرقی تعلیم کی توسیع کے لئے جرات مندانہ اقدام کا

مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج (ان دو

اداروں کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے کی سی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علوم

کی تباہی دیکھ کر انھیں دکھ ہوتا تھا اور وہ اس قدیم ملک کے کلاسیکی علوم کے احیاء

اور فروغ کے لئے زیادہ موثر اقدام اور زیادہ مالی وسائل کی مانگ کر رہے تھے۔

اس طرح دلی کالج اور اس عہد کے دوسرے تعلیمی اداروں کے قیام کے دو مقاصد بنی طور پر سامنے

آتے ہیں۔ اولاً ہندوستانی درس گاہوں میں انگریزی تعلیم جاری کر کے ہندوستانیوں کو عیسائیت سے

قریب لانا، جیسا کہ بعض عیسائی مبلغوں خصوصاً ولبر فورس اور چارلس گرانٹ کے خیالات سے ظاہر

مشرق کی علوم و ابستہ کی از سر نو تعلیم و ترقی اور ان زبانوں کے مخطوطات کی لمباعت و اشاعت، جیسا

کہ کمپنی کے بعض قدیم اور اعلا ملازمین کی سفارشات سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۰ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۰

۱۱ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۱

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس جماعت کی تجویز اور سفارش پر کمپنی نے تعلیمی ذمہ داری اپنے سر لی اور یہاں دلی کالج اور دوسرے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ اس امر سے مزید واقفیت کے لیے کمپنی کے ۱۷۹۳ء اور ۱۸۱۳ء کے چارٹر کا سرسری مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

۱۷۹۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو ولبر فورس نے پر جوش الفاظ میں کہا تھا کہ ”قانون میں یہ لکھا جائے کہ کمپنی کا یہ فرض ہو گا کہ وہ وقتاً فوقتاً ولایت سے ایسے تجربہ کار اور اہل علم لوگوں کو ہندوستان بھیجتی رہے، جو مدرس اور مشنری کے فرائض سرانجام دے سکیں۔“ اس لیے کہ اس سے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام شروع کیا جاسکے۔ لیکن کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مخالفت سے یہ قانون منظور نہ ہو سکا۔ لیکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر تجدید کے لیے پیش ہوا تو پارلیمنٹ میں کافی گرم بحث ہوئی۔ ۱۷۹۳ء میں مسئلہ صرف ایک تھا۔ لیکن اس بار دو مسئلے تھے ایک تو وہی جس کا سطور بالا میں ابھی ذکر ہوا ہے۔ دوسرا مسئلہ مشرقی علوم والسنہ کے ان محبوں اور واقف کاروں کا تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدیم ملازم تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کمپنی مشرقی علوم کی ترقی و ترویج میں ہاتھ بٹائے، جس کی صورت یہ ہو کہ پرانے علمی و ادبی سرمائے کو طبع کرا کے اسے محفوظ کر دیا جائے اور آئندہ سے ہندوستان کی بھی درس گاہوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ فریقین کے ان دونوں مطالبات اور تجاویز پر کافی بحث و تمحیص کے بعد دونوں جماعتوں کے مطالبات کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ تسلیم کر لئے گئے۔ پہلی جماعت کی تجویز کے مطابق عیسائی مبلغوں کو ہندوستان آنے اور یہاں تبلیغ کرنے کی پوری آزادی مل گئی، لیکن کمپنی پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری کا مطالبہ منظور نہیں ہوا۔

دوسرے گروہ کے مطالبات کے لیے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔ یہی قرارداد بعد میں چارٹر کا ۲۲ واں سیکشن بنی۔

”گورنر جنرل ان کاؤنسل کا یہ حکم آئینی ہو گا کہ --- ہر سال ایک معتد بہ رقم (جو ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی) الگ نکالی جائے اور اسے (۱) ادب کے احیاء اور اس کی ترقی کیلئے (۲) پڑھے لکھے لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے اور (۳) ہندوستان کے برطانوی

سے جو الہ قدیم دلی کالج ص ۱۹

مقبوضات میں رہنے والوں کو سائنس کے علم سے متعارف کرانے اور اس کی ترویج کے لئے ضروری کیا جائے۔" ۱۸

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چارلس گرانٹ اور ولبر فورس کے بیس سالہ احتجاج پر برطانوی پارلیمنٹ نے پانی پھیر دیا۔ کیوں کہ ان کے مطالبات میں کافی کاٹ چھانٹ ہوئی۔ یا یوں سمجھئے کہ عیسائی ممالک کو ہندوستان آنے کی اجازت کے علاوہ ان کی کسی بات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ واضح رہے کہ ۱۷۹۵ء کے بعد کمپنی نے عیسائی مبلغوں کے ہندوستان آنے اور مذہبی تبلیغ پر پابند لگادی تھی۔ اس سے پہلے وہ بلا جھجھک ہندوستان کے گوشے گوشے میں دن دن آتے پھرتے تھے۔ اس قرارداد کے نتیجے میں کمپنی کو ۱۷۹۵ء کی یہ پابندی اٹھالینا پڑی۔

اس کے برخلاف مشرقی جماعت کے سارے مطالبات من عن قبول کر لیے گئے، بلکہ اس میں کچھ اضافہ بھی کر دیا گیا، اور وہ یہ کہ "ہندوستان کے برطانوی مقبوضات میں رہنے والوں کو سائنس کے علم سے متعارف کرایا جائے" اس میں یہ اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ تجویز کا یہ جزو عیسائی مبلغوں کے منشا کے عین مطابق تھا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ برطانوی پارلیمنٹ میں بھی مشرقی مکتب خیال سے متاثر ارکان موجود تھے اور انھوں نے محض ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہی اس شق کا اضافہ کیا تھا۔ جیسا کہ نور اللہ اور جے۔ پی۔ نایک کا خیال ہے۔

"اس سیکشن کے تجویز کرنے والے حقیقتاً مشرقی مکتب خیال سے متاثر تھے کیوں کہ وہی لوگ ادب (جس سے ان کا مطلب عربی اور سنسکرت کا کلاسیکی ادب تھا) کے احیاء اور اس کی ترقی اور پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی ہمت افزائی کی بات کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں مغربی سائنس کی تعلیم کی بھی فکر تھی۔ کیوں کہ اس زمانے کے ہندوستانی عوام اس معاملے میں بالکل کورے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے برطانوی مقبوضات میں رہنے والوں میں سائنس کی ترویج کے لیے کوشش ہونی چاہیے۔"

۱۸ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۲

۱۹ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۲

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی رعایا کی فلاح و صلاح کو رنمنٹ کو منظور تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی نوجوانوں کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ اگر مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم بھی دی جائے تو ان کی بصارت و بصیرت میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگی۔

لیکن ہندوستان کے بعض ارباب علم اور دانشوروں نے برطانوی پارلیمنٹ کے اس اقدام کو شعبہ کاری اور بازی گری کا نام دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق انگریزوں نے مغربی علوم فنون کی تعلیم کو اپنی سیاسی حکمت علمی کے پیش نظر رواج دیا تھا، تاکہ ہندوستانی نوجوان مغربی علوم فنون کی تعلیم کے حصول کے بعد انگریزی تہذیب تمدن سے قریب آسکیں اور اگر یہ نہ بھی ہو تو انگریزی تہذیب اور حکومت سے جو بغض و بعد اور مغائرت ہے اس میں کسی حد تک کمی آجائے، اس طرح انگریزی حکومت کی برتری اور برتری انھیں گوارا ہو جائے گی۔

ان ہی نظریات و خیالات کا اعادہ مالک رام نے بھی کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں
 ”انھوں (انگریزوں) نے اندازہ کر لیا کہ بہت جلد انھیں باقاعدہ نظم و نسق کی تنظیم کے لیے یہاں کے باشندوں کی پوری مدد اور علمی تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لئے انھوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر دلی کالج قائم کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل کو مغربی علوم و فنون سے روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ یورپی تہذیب و تمدن سے قریب ہو سکے، اور اس طرح خود انگریزی سیاست اور حکومت بھی ان کے لئے قابل برداشت ہو جائے۔ اس لیے اس کالج میں نہ صرف انگریزی زبان کی درس و تدریس کا انتظام کیا گیا، بلکہ یہاں بہت سی انگریزی کی علمی اور فنی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ لیکن یہ سیاسی ”شر“ اردو زبان کے لیے بہت بڑے ”خیر“ کا منبع بن گیا۔“

اگر مالک رام ہندوستان کی نئی نسل کو مغربی علوم و فنون سے روشناس کرانے کو ”شر“ سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغربی علوم و فنون سے واقف ہندوستانی انگریزی تہذیب و تمدن سے قریب ہو سکیں گے اور اس طرح انگریزی حکومت ان کے لئے قابل برداشت ہو جائے گی۔ تو یہ محض ان کا ذاتی خیال ہے، جو سراسر خلاف واقعہ ہے۔ انگریزوں کے ہر اچھے برے کام کو شبہہ کی نظر سے دیکھنا سراسر ناانصافی ہے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل بہر حال ہمارا وظیرہ ہونا چاہیے۔

مغربی علوم و فنون کے گرویدہ ہم آج نہیں ہوئے ہیں، انیسویں صدی کے اوائل ہی میں ہمیں ان کی اہمیت و افادیت کا احساس ہو گیا تھا۔ تحقیقی انکشافات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمارے بعض دوراندیش بزرگوں نے مغربی علوم کی تعلیم کا مطالبہ دلی کالج قائم ہونے سے پہلے ہی کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مذہبی درس گاہوں کی جگہ ایسے کالجوں کی مانگ کر رہے تھے جن میں سائنس اور مغربی علوم اور دوسرے مفید مضامین کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہو۔ مزید برآں یہ کہ ان میں یورپی مدرسین ہی درس و تدریس کے فرائض انجام دیں، ہندوستانی نہیں۔

راجارام موہن رائے کی قیادت میں ہندوستانیوں کی طرف سے ۱۸۲۳ء کو ایک یادداشت گورنر جنرل کو پیش کی گئی تھی۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کلکتے میں سنسکرت کالج کے قیام کی تجویز کو ختم کر کے گورنمنٹ کو چاہیے کہ ایک ایسے روشن خیال اور ترقی پذیر تدریسی نظام کی ترویج کرے جس میں فلسفہ، ریاضی، کیمیا، اناٹومی اور دوسرے مفید مضامین شامل ہوں۔ اس کے اخراجات منظور شدہ رقم سے پورے کیے جاسکتے ہیں جو یورپ سے تعلیم یافتہ قابل افراد کو ملازم رکھنے اور کتابوں اور دوسرے ضروری ساز و سامان سے لیس کالج قائم ہونے پر صرف ہونے چاہئیں۔

راجارام موہن رائے کا مجوزہ و متخیلہ کالج دلی کالج سے کوئی مختلف چیز نہ تھا۔ اور پھر جدید اور مغربی علوم کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحی کا یہ نظریہ کہ "مغربی علوم کو اپنی زبان کے ذریعے پھیلاؤں۔۔۔ جدید سے جدید علم کے پڑھانے اور تحقیق کرنے کا سامان بہم پہنچائیں۔۔۔ نئی چیزوں اور نئے خیالات کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں" کیا معنی رکھتا ہے؟

نورٹ ولیم کالج یقیناً انگریزوں نے محض اپنی سیاسی کامیابی کے پیش نظر قائم کیا تھا، اس کے قیام میں ہندوستانیوں کے مفاد کا روبرو بھی دخل نہ تھا۔ لیکن دلی کالج عرف ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ کیوں کہ (۱۸۹۳ء) کے چارٹر کی پیشگی کے وقت واپس فورس کی یہ تجویز کہ کمپنی ہندوستان میں ایسے اشخاص کو بلائے جو یہاں مدرسے اور مشنری کی انجام دہی میں چاق و چوبند ہوں لیکن کمپنی کے ڈائریکٹروں کی مخالفت سے برطانوی پارلیمنٹ نے اس کے اس مطالبے

W. H. Sharp's Selections from Educational Records, Pt. 1, P. 101

۱۸۲۳ء

کو مسترد کر دیا اور اس کی اشک شوئی کے لیے ۱۸۱۳ء میں اسے صرف جزوی طور پر منظور کیا، جس کا گذشتہ اوراق میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مشرقی جماعت کے مطالبات ڈاکٹروں کی مخالفت کے باوجود پہلی ہی پیشی میں منظور کر لیے گئے۔ (۲) ۱۷۹۳ء سے پہلے عیسائی مبلغوں اور پادریوں کے ہندوستان آنے اور مذہبی تبلیغ پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور تشویق کے لیے ارباب کمپنی اپنا تعاون پیش کر رہے تھے مثلاً "وارن ہٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں کلکتے میں مدرسہ عالیہ اور جو ناٹھن ڈنکن (Jonathan Duncan) نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا تھا" (۳) دلی کالج کے پرنسپل وہ لوگ کبھی نہیں بنائے گئے جن کا تعلق مغربی جماعت سے تھا یا ولبر فورس اور چارلس گرانٹ کے ہم نوا تھے، بلکہ اس کے علی الرغم مشرقی ادب و السنہ کے واقف کار اور قدر شناس اور اس تحریک کے فعال اشخاص ہی اس کے پرنسپل بنائے گئے، جن کی گراں قدر خدمات اظہار من الشمس ہیں۔ مسٹر ٹیلر، فلیکس بوٹروا اور ڈاکٹر اشپرنگر نے مشرقی زبان و ادب کی جو بے یوٹ اور مہتمم بالشان خدمات انجام دی ہیں ان سے کون انکار کی جرات کر سکتا ہے؟

اپنے اس موقف کی مزید توضیح کے لیے ہم چند ہندوستانی مورخوں اور دانشوروں کی رائیں پیش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دلی کالج کے قیام میں انگریزوں کا مطمح نظر کیا تھا۔ دورِ خامر کے ممتاز مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جو مسلم فرماں رواؤں اور انگریز حکمرانوں سے متعلق منصفانہ تحقیق اور غیر جانب دارانہ انکشافات کے لیے مشہور ہیں، لکھتے ہیں۔

"کمپنی نے سب سے اول تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے منظور کیا، رقم اگرچہ بڑی نہ تھی، لیکن اس سے اتنا اوفور ثابت ہو گیا کہ رعایا کی حالت کا بہتر بنانا گونڈٹ کا فرض ہے۔"

سید نور اللہ اور نایک معترف ہیں کہ۔

۱۷ اس کے ایک سو سے زائد طلبہ کو تین تین روپے کا ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا

۱۷ نور اللہ اور نایک تاریخ تعلیم ہند ص ۶۱

۱۷ A New History of India Revised Edition (Urdu) P. 431-32

”۔۔۔ کمپنی کی تبدیلی مذہب کی ان سرگرمیوں کا ہندوستان کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اور پھر ہندوستان میں تعلیم کی جو جدید تحریک ۱۸۱۳ء کے چارٹر سے شروع ہوئی اس میں ان سرگرمیوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔“

ڈبلیو۔ ایچ۔ شارپ نے بھی اس دفعہ کو ہندوستانیوں کے حق میں بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اس دفعہ (۱۷۳) کے معنی یہ تھے کہ کمپنی ایک لاکھ روپیے کی اس رقم کو صرف کرنے کے لئے خود اپنی ایک ایجنسی قائم کرے اور ہندوستانیوں کو مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور دوسری انقلابی تجویزوں کے برخلاف ایک غیر مذہبی اور پرانے مروجہ ڈھنگ سے تعلیم دینے کی کوشش کرے۔ اس تجویز کی تائید کرنے والوں کا خیال تھا کہ مشرق و مغرب دونوں کی سائنس کی پرورش اور آبیاری کے ذریعے مشنری تنظیموں کے طوفان کو روکنے کے لیے ایک قابل اعتماد اور مضبوط بند کی تعمیر ہو سکے گی۔^{۱۷}

خواجہ احمد فاروقی تحریر فرماتے ہیں۔

”دلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی (Orientalists) عمل پیرا تھے اور جو اس وقت جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستانی علم کی دید و دریافت کی بڑی قدر تھی۔۔۔ بعض برطانوی حکمران ہندوستانی علوم کی سرمد بازاری پر آزر دہ تھے اور ان کا احیا چاہتے تھے۔“^{۱۸}

اس سلسلے کی آخری اور اہم ترین شہادت اس عہد کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کی ۶ مارچ ۱۸۱۱ء کی لکھی ہوئی وہ سفارسی یادداشت ہے جس نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۲۳) کو منظور کرانے میں دم عیسیٰ اور دیگر کا کام کیا تھا۔ کمپنی کا یہ سب سے زیادہ با اختیار افسر مشرقی علوم کا کتنا دلدادہ اور ان کے انخطاط و تنزل سے کس قدر آزر دہ و رنجیدہ تھا اس کا اندازہ اس کے اس بیان سے کیا جا

۱۷ تاریخ تعلیم ہند ص ۵۸

۱۸ Selections from Educational Records Pt. 1 P. 22

۱۹ مقدمہ ماسٹر رام چندر ص ۴

سکتا ہے۔

”یہ ایک عام خیال ہے کہ ہندوستان میں سائنس اور ادب رو بہ زوال ہیں۔ میں نے اس دل چسپ موضوع پر جتنی بھی تحقیقات کیں مجھے اس خیال کا بہت واضح اظہار ملا۔ صرف یہی نہیں کہ پڑھے لکھوں کی تعداد کم ہو گئی ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے جو اب بھی علمی کاموں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، علوم کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے مجرد علوم (سائنس) متروک ہو چکے ہیں، ادب لطیف نظر انداز ہوتا جا رہا ہے۔ اور عوام کے مخصوص مذہبی نظریات سے متعلق علوم کے علاوہ علم کی تمام دوسری شاخیں بے توجہی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہو رہا ہے کہ بہت سی قابل قدر کتابیں بے مصرف ہو گئی ہیں یا سرے سے ضائع ہو چکی ہیں۔ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے کی بات ہے کہ اب اگر حکومت نے مشفقانہ دست گیری نہ کی تو علم و ادب کا احیا کتابوں کے فقدان یا کتابوں کے سمجھانے والوں کی کمی کی وجہ سے ناممکن ہو جائے گا۔“

ہندوستانی ادب کی اتنی زبوں حالت کیوں ہوئی اس کا خاص سبب ادب کی اس ہمت افزائی کی کمی میں ملے گا جو پہلے دیسی حکومتوں کے حکمراں راجوں مہاراجوں اور امیرانہ کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہمت افزائی مطلعے اور دوسری ادبی کاوشوں کے لئے زبردست محرک ہوتی ہے۔ خاص طور سے ہندوستان میں جہاں علمی کام کرنے والوں کو کوئی اور معقول سہارا نہیں ملتا۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کہ ایک قوم جو اپنی سلطنت کے دوسرے حصوں میں شعر و ادب سے محبت اور اس کی کامیاب پرورش کے لیے ممتاز ہو، وہ ہندوؤں کے ادب کی مشفقانہ خبر گیری اور یورپ کے علماء کے سامنے اس ادب کے ذخائر کو کھولنے کے لیے امداد دینے میں ناکام ہو۔“ لہ

لارڈ منٹو کی اس سفارش پر جو سر اسٹرن مشرقی علوم و السنہ کی حمایت میں تھی، کلکتہ ریویو کے ایک مقالہ

لے بحوالہ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۲-۸۱

لکار نے طنز کیا تھا کہ ”لارڈ منٹو کی یادداشت تمام تر ہندوستانی علوم کا مرثیہ ہے، اس میں ہندوستان کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔“

کمپنی پر ہندوستان کی تعلیمی ذمہ داری اس کے منشا کے خلاف زبردستی تھوپی گئی تھی۔ ریوزنڈ ٹوف (Rev. A Dabbs) کے بقول ”تعلیمی پالیسی ہم نے شروع نہیں کی، دراصل اسے سرسڑھ دی گئی۔“ کیوں کہ ان دنوں تعلیم خود انگلستان میں بھی اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس لیے فطری طور پر کمپنی ہندوستان میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ کمپنی کو رفاہ عام کے مقابلے میں مالی منفعت زیادہ عزیز تھی، اس لیے وہ ایسی ہر ذمہ داری سے کتراتے تھے جس سے اس کے منافع میں کمی کا اندیشہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ہندوستانیوں نے خود اس سلسلے میں کمپنی سے کبھی کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں پھیلے ہوئے مزاج سے سب سرسڑھ حال اور پریشان تھے۔ ان کے پیش نظر اس وقت بہتر ملکی نظم و نسق کے سوا اور کچھ نہ تھا، حکمرانوں کے سامنے اپنی تعلیم و تہذیب کی بقا کے لیے لب کشائی ان کی ہمت اور جرات سے بالاتر تھی۔

اس صورت حال کی بنا پر دس برس تک چارٹر کی دفعہ (۱۸۳۳) پر عمل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ پہلی بار ۱۷ جولائی ۱۸۲۲ء کو گورنر جنرل (لارڈ ہیننگز) نے ایک قرارداد کے ذریعے اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے اقدام کیا، اور *General Committee of Public Instruction* (مجلس تعلیمات عامہ) کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی کا سربراہ ڈاکٹر ولسن (Dr. H. H. Wilson) کو مقرر کیا گیا، جو سنسکرت کا عالم اور مشرقی علوم کا حامی تھا۔ اور اس کمیٹی سے متعلق و ملحق مجلسیں (*Local committees*) دلی اور دیگر برطانوی مقبوضات میں بھی قائم کی گئیں۔ مجلس تعلیمات عامہ کا صدر مقام کلکتہ رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی رکھی

۱۳۔ بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۱۳

۱۴۔ بحوالہ ذوق جستجو ص ۲۲۶

۱۵۔ نور اللہ و نایک، تاریخ تعلیم ہند ص ۹۲

۱۶۔ ذوق جستجو ص ۲۲۶

گئی کہ منجملہ اور جگہوں کے دلی میں بھی ایک اعلیٰ پیمانے کی مشرقی درس گاہ قائم کی جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دلی، اگرہ، بریلی وغیرہ مقامات کا تعلیمی جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان مقامات میں تعلیمی سرگرمیوں کی کیا کیفیت ہے اور جو مدارس چل رہے ہیں ان کی حالت کیسی ہے۔ اس سلسلے میں مجلس تعلیمات عامہ نے جو اقدام کئے ان کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

۱۸۲۳ء کے اواخر میں مجلس تعلیم عامہ (General Committee of Public Instruction) نے ایک مطبوعہ گشتی چھٹی دلی، اگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی جس میں ان اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کیے گئے تھے، نیز یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ ان مقامات میں توسیع و ترقی تعلیم کے لئے کیا کیا وسائل اور ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے استفسارات یہ تھے کہ ان اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون سے مکتب یا تعلیم گاہیں ہیں۔ ان میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد و اعانت کے مستحق معلوم ہوتے ہیں اور اس امداد کی کون سی صورت زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی۔ ان سب امور کے بیان کرنے کے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی کہ گورنمنٹ کا منشا دلی میں کالج قائم کرنے کا ہے۔

دلی کی مقامی مجلس کے سکریٹری جوزف ہنری ٹیلر تھے۔ مسٹر ٹیلر اور دیگر اراکان مجلس نے پوری مستعدی کے ساتھ دلی کا تعلیمی جائزہ لیا اور ایک مبسوط رپورٹ تیار کی، جو جنوری ۱۸۲۲ء میں گورنمنٹ کو پیش کی گئی۔ اس رپورٹ کے خالص خاص امور یہ تھے۔

دلی میں مسلمانوں کے بہت سے مدرسے قائم ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی بھی حالت بہتر نہیں جس کی وجہ سرمائے کی قلت ہے۔ ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبہ کا بیش تر وقت حفظ قرآن اور فقہی تعلیم میں صرف ہوتا ہے۔ ان مدارس میں جس ہیچ پر تعلیم دی جاتی ہے اس سے برائے نام ہی فائدہ ہوتا ہے اس لیے طلبہ کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ حاضری

لے مرحوم دلی کالج ص ۳۰۳

کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ چونکہ اب وہ مخیر حضرات جن کی داد و دہش اور جو دو نوازش سے یہ مدرسے چلتے تھے اب انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں وہ خود نانِ شبینہ کے محتاج ہیں اس لیے ان مدرسوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ شہر کے علما و فضلا در بدر خاک چھانٹتے پھرتے ہیں۔ نیز جو مدرسے حکومتِ وقت کی طرف سے قائم تھے سیاسی اتھل پھل کی وجہ سے ان کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا ہے۔ ان رقوم کا از سر نو جاری ہونا بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ مجلس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ دلی میں جلد از جلد ایک اعلا درجے کا مدرسہ قائم کیا جائے جس میں اعلا قابلیت کے مدرسین مقرر کیے جائیں۔ مجلس نے بالخصوص میر غازی الدین خاں کا ذکر کیا تھا کہ اس مدرسے کی حالت تو اور بھی خراب ہے، عمارت خستہ و شکستہ اور مرمت طلب ہے اور تعلیم کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ مسٹر ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۲۳ء میں مدرسہ غازی الدین میں نو طلبہ تھے اور مولوی عبداللہ ان کو درس دیتے تھے یہ

رپورٹ کا اختتام دلی کی عظمت رفتہ و حشمت گذشتہ کی یاد دہانی اور موجودہ ویرانی کی طرف انعطافِ توجہ کے ساتھ وہاں کالج قائم کرنے کی پر زور اور دردمندانہ اپیل پر ہوا ہے۔ اس کا یہ حصہ بطور خاص ملاحظہ طلب ہے۔

.. جب آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گذشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جبکہ دلی اس کی عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا شان دار دار الخلافہ تھی، جو علوم و فنون کی سرپرستی اور ہنر پروری کے لیے چار دانگ عالم میں مشہور تھی اور اس کے زرخیز اور خوش حال خطوں کے فرزند علم کے شوق میں اس مشرقی علوم کے گہوارے میں جوق جوق آتے تھے اور جہاں ایسے ایسے شاعر اور حکیم پیدا ہوئے ہیں جن کے نام اب تک تاریخ کے صفحات پر یادگار ہیں۔ اور پھر جب آپ کے ارکان اُن بے شمار تعلیم گاہوں کے کھنڈروں کو خیال کریں گے جو ان شاہانہ فیاضیوں کے آثار ہیں جو علم کی اشاعت اور ترقی کے لیے وقف تھیں اور اب خراب و خستہ اور شکستہ حال ہیں۔ اور جب وہ گذشتہ عہد کی ان مقدس علمی یادگاروں کو دیکھیں گے

لے خواجہ احمد فاروقی، ذوق و جستجو، ص ۲۳۷

جن پر اب ویرانی و بے کسی بستی ہے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تو ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ارکان کے دلوں میں دلی کی ہمدردی کا جوش پیدا ہو گا اور آپ، جن کے ہاتھوں میں رعایا کی دماغی ترقی و اصلاح کا کام تفویض کیا گیا ہے، ضرور دلی کے لئے اس عطیے کا ایک حصہ مخصوص کریں گے جو گورنمنٹ نے اس غرض کے لئے منظور کیا ہے۔

جنرل کمیٹی نے یہ رپورٹ مع اپنی سفارش کے انگلینڈ بھیج دی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اسے صرف منظوری ہی عطا نہیں کی بلکہ دلی میں ایک کالج کے قیام کا حکم صادر کر دیا اور لکھا کہ غازی الدین خاں کے مدرسے کی عمارت میں کالج قائم کیا جائے چونکہ اس مدرسے کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور فوری توجہ کی محتاج تھی اس لیے اس کی مرمت کے لیے بھی کچھ روپے خرچ کرنے کی اجازت دی گئی۔

لے بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص

زمانہ قیام کی تاریخ

برطانوی پارلیمنٹ کے فرمان کی تعمیل میں ۱۸۲۵ء میں غازی الدین خاں کے مدد سے میں "دلی کالج" کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ مسٹر جوزف ہنری ٹیلر، جو دلی مقامی مجلس کے سکریٹری تھے، اس کے عارضی پرنسپل، کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے سکریٹری اور پرنسپلینٹ مقرر ہوئے۔ یہ ان کا ماہانہ مشاہرہ ایک سو پچھتر روپے طے پایا، جو بعد میں بڑھ کر تین سو روپہ ہو گیا۔ ایک سو بیس روپے پر ایک ہیڈ ماسٹر، پچاس پچاس روپے پر دو مدرسین اور باقی منشی تیس تیس اور پچیس پچیس روپے مہانہ پر ملازم رکھے گئے۔ شروع میں کالج کے پورے مصارف کے لیے محض چھ ہزار روپے سالانہ مقرر ہوئے تھے اور صرف مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم ہی کا انتظام تھا۔ طالب علموں کی امداد اور بہت افزائی کی غرض سے پہلے سال تین تین روپے ماہ وار کے نو اسی وظائف بھی جاری کیے گئے تھے۔ یہ ایک سال کے بعد یعنی ۲۶ جولائی ۱۸۲۶ء کو گورنر جنرل نے ایک رپورٹ پیش کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سال کے عرصے میں کالج نے نمایاں ترقی کی اور طلبہ کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک سو بیس ہو گئی۔ ۱۸۲۷ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۲۰۴ تک پہنچ گئی تھی۔

کالج کی مجلس انتظامیہ :-

کالج کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود کے لیے ایک کمیٹی کا قیام ضروری تھا۔ چنانچہ دلی کی مقامی

اے مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۶ - ۵

اے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا یہ بیان درست نہیں کہ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل نہیں تھے وہ محض اس کے پرنسپلینٹ تھے امدان کو ایک سو پچاس روپے ماہانہ الاونس ملتا تھا اور پرنسپل کو سو روپہ دیا جاتا تھا۔ (ذوق و جستجو ص ۲۴۶)

اے خواجہ احمد فاروقی - مقدمہ ماسٹر رام چندر - ص ۱۳

اے خواجہ احمد فاروقی - ذوق و جستجو ص ۲۴۶

مجلس ہی کو کالج کی مجلس انتظامیہ میں تبدیل کر دیا گیا لیکن اس کے اختیارات محدود تھے۔ تمام انتظامی اور تعلیمی امور کے لیے لفٹنٹ گورنر کی منظوری لازمی تھی لیکن اکثر و پیش تر یہی ہوتا کہ کالج کی فلاح و بہبود سے متعلق مجلس انتظامیہ جو رائے دیتی تھی اسے منظور کر لیا جاتا تھا۔ مجلس تعلیمات عامہ مجلس انتظامیہ کی رائے سے اختلاف کی مجاز تھی لیکن ایسا موقع شاذ و نادر ہی آیا ہو گا کہ مجلس انتظامیہ کی رائے کو ٹھکرا دیا گیا ہو۔

مجلس انتظامیہ کا صدر کوئی سرکاری افسر اور کالج کا پرنسپل اس کا سیکریٹری ہوتا تھا۔ شروع میں کمیٹی کے مندرجہ ذیل عہدہ دار و ارکان تھے۔

- | | |
|----------------------------|-------------------------|
| ۱۔ صدر۔ سرٹی۔ ٹکاف | (دلی کے ریڈیٹنٹ کشنر) |
| ۲۔ سیکریٹری۔ جے۔ ایچ۔ ٹیلر | (کالج کے عارضی پرنسپل) |
| ۳۔ رکن۔ مسٹر کالون | (جو انٹنٹ مجسٹریٹ دہلی) |
| ۴۔ ڈاکٹر اس | (سول سرجن دہلی) |

بتدریج کمیٹی کے ارکان میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء-۱۸۵۴ء میں ان کی تعداد بڑھ کر نو ہو گئی تھی، جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

- | | |
|----------------------------|---------------------------|
| ۱۔ صدر۔ جے۔ پی۔ ہورر | (مجسٹریٹ و سیکریٹری دہلی) |
| ۲۔ سیکریٹری۔ جے۔ کارگل | (پرنسپل دلی کالج) |
| ۳۔ رکن۔ مہر جے۔ تھیوفلس | (اسسٹنٹ مجسٹریٹ دہلی) |
| ۴۔ کیپٹن آر۔ سی ڈگلس | (صدر امین اعلا دہلی) |
| ۵۔ "۔ مفتی صدر الدین آزرده | (کشنر دہلی) |
| ۶۔ "۔ نواب حامد علی | (سول اینڈ سٹیشن جج دہلی) |
| ۷۔ "۔ سامن فریزر | (مجسٹریٹ و کلکٹر دہلی) اے |
| ۸۔ "۔ مسٹر۔ آر۔ بی۔ مورگن | |
| ۹۔ "۔ پی۔ اے۔ ایجرٹن | |

کالج میں انگریزی یا مغربی شعبے کا قیام :-

دلی کالج قائم کرنے کا مقصد مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی علوم فنون سے ہندوستانیوں کو واقف کرانا تھا۔ اس لیے سر چارلس ٹی۔ مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی کی سفارش پر ۱۸۲۸ء میں انگریزی شعبے کا اضافہ کیا گیا اور اس کے لیے الگ سے تین ہزار سالانہ کی رقم منظور کی گئی۔ اس طرح کالج میں دو شعبے قائم ہو گئے۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی یا انگریزی شعبہ۔ اس ابداع و اختراع سے دلی میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور ان کے بزرگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ اقدام ہمارے نوجوانوں کو مذہب سے برگشتہ کرنے اور درپردہ عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتے میں ہندو کالج قائم کیا تھا، اس کے خلاف بھی بنگال میں زبردست شورش برپا ہوئی تھی لیکن وہاں راجا رام موہن رائے جیسا دور اندیش، روشن خیال اور زبردست رہنما موجود تھا، اس لیے یہ ہنگامہ اٹھا تو سہی مگر چند ہی دنوں میں کافور ہو گیا۔ دلی میں بھی یہ طوفان زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کا یہ سوئے ظن حسن ظن میں تبدیل ہو گیا اور ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور انگریزی زبان کا بھی مطالعہ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انگریزی شعبہ علاحدہ ہونے پر ہندوستانی طلبہ مشرقی شعبہ چھوڑ کر انگریزی شعبے میں داخلہ لینے لگے۔ اس کے انداد کے لیے مشرقی شعبے کے وظائف بند کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ غالباً یہ زمانہ ۱۸۳۰ء کا رہا ہوگا۔

اعتماد الدولہ کا صدقہ جاریہ :-

شاہ اودہ کے وزیر اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں نہایت شریف، منکسر المزاج، آقا اور دریا دل انسان تھے۔ خدمت خلاق اور خدا ترسی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ صدقہ جاریہ کے طور پر ایک رقم محفوظ کر کے اس کے ذریعے دلی کے مسلمان طلبہ کے لیے عربی، فارسی اور دینی تعلیم کی ایک درس گاہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے انھوں نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپیے کی خطیر رقم لے مشرقی شعبے میں قدیم مشرقی زبانیں مثلاً عربی، فارسی، اور سنسکرت اور مغربی شعبے میں انگریزی زبان اور یورپ کے جدید علوم کے علاوہ جدید ہندوستانی زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔

حکومت کو تفویض کی اور کہا کہ اس کی صورت وقف کی ہوگی اور یہ رقم گورنمنٹ کے پانچ فیصد والے قرض میں لگادی جائے جس کے منافع سے درس گاہ کا خرچ پورا ہو سکے۔ گورنمنٹ نے یہ رقم شکر یہ کے ساتھ قبول کر لی۔ لیکن مجلس تعلیمات عامہ نے نواب صاحب سے یہ گزارش کی کہ اتنی رقم سے ایک اعلا درجے کے مدرسے کا خرچ پورا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لیے نیا مدرسہ قائم کرنے کی بجائے اسے دلی کالج کی آمدنی میں شامل کر لیا جائے جس کے لئے گورنمنٹ نے منظوری بھی دی ہے اور یہ کالج ۱۸۲۵ء سے قائم بھی ہے جس میں مشرقی علوم کی تعلیم کماحقہ دی جا رہی ہے۔ اگر آپ یہ تجویز قبول کر لیں گے تو گورنمنٹ کالج کے معاملات کے افسر سمجھے جائیں گے اور پروفیسروں اور غالب علموں کا تقریباً آپ کے نام سے کیا جائے گا۔ بہر حال انہوں نے اس مشورے کو برسرِ چشم قبول کر لیا اور ۱۸۳۰ء میں ایک وصیت لکھوائی۔

”۔۔۔ میں ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم نیک نیتی سے اس کالج کی امداد کے واسطے پیش گورنمنٹ کی تحویل میں چھوڑتا ہوں جو نواب غازی الدین خاں مرحوم نے میرے وطن دہلی میں عربی و فارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا۔ جو میرے مذہبی علوم ہیں اور اخلاق کے سرچشمے ہیں۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ رقم موقوفہ کا منافع ان علوم کے طلباء اور اساتذہ پر خرچ کیا جائے۔“

گورنمنٹ نے ان کی اس دریادلی اور فیاضی کے اعتراف میں ایک کتبہ کالج کے اندرون صحن کے صدر دروازے کی اوپری منزل پر نصب کرایا۔ اس وقت سے کالج نے بڑا عروج پایا کیوں کہ اس کالج کی آمدنی یک بارگی دگنی ہو گئی۔ اس عطیے کی رقم کے سود سے سات سو روپیے ماہانہ کی آمدنی

۱۰ ص۔ بحوالہ مرحوم دہلی کالج۔ ص ۱۰

۱۱ ص۔ کتبہ پر یہ عبارت کندہ ہے

نہ بر لوج نصیحتے بماند و لیک

جزائے عمل ماند و نام نیک

بیاد حیات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر شہراب جنگ کہ یک لک و ہفتاد ہزار

روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقعہ دہلی خاص مولد و موطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض

نمودہ اند منقوش گردیدہ۔ در سنہ ۱۸۲۹ عیسوی۔ (قدیم دلی کالج ص ۸۰-۷۹)

ہوتی تھی جب کہ مجلس تعلیمات عامہ نے صرف چھ ہزار روپے سالانہ یعنی پانچ سو روپے ماہانہ ہی منظور کیا تھا۔ اور انگریزی شعبے کے اضافے کے بعد تین ہزار سالانہ کی رقم الگ سے منظور ہوئی تھی۔
تعلیمی تاریخ کا نیا دور :-

۱۸۳۵ء میں ہندوستان میں تعلیمی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں ہندوؤں کے طریقہ تعلیم میں بعض اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کے اثرات سے دلی کالج بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ہوا یہ کہ کمپنی کے ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۲۳) کو لے کر ہندوستان میں سرکاری حلقے اور مجلس تعلیمات عامہ نے دوسرے جماعتوں کی حیثیت اختیار کر لی۔ ایک جماعت مشرقی علوم والسنہ کی دلدادہ تھی تو دوسری اس کی مخالفت اور انگریزی کی حامی تھی مشرقی جماعت نے ثابت کرنا چاہتی تھی کہ دلی کالج جن مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے وہ چارٹر کی دفعہ (۲۳) کے عین مطابق ہے۔ دوسری جماعت (انگریزی جماعت) مشرقی علوم کی تعلیم کو بیکار خفص تصور کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دفعہ (۲۳) کا مقصد مشرقی علوم کی تعلیم نہیں بلکہ مغربی علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم و ترویج ہے۔ مگر ابتدا میں اس گروہ میں کوئی ایسا ترجمان موجود نہ تھا جو اس کے وقت کو منطقی استدلال کے ساتھ بہتر طور پر پیش کرتا اور حریف پر غالب آتا۔ بعد میں اتفاق سے اس جماعت کو لارڈ میکالے جیسے قادر الکلام مقرر اور مغربی علوم اور انگریزی زبان کی محبت سے مرثدا خفص کی حمایت حاصل ہو گئی، جس سے اس کی کوششوں میں ایک نئی توانائی آگئی۔

لارڈ میکالے جون ۱۸۳۲ء میں گورنر جنرل کی کونسل کے ایک رکن کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور محکمہ قانون کا قلم دان بھی انہی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے آئندہ مغربی گروہ کے لوگ جیتے نہیں سمائے۔ کیوں کہ انھوں نے متذکرہ بالا کمی پوری کر دی تھی۔ مجلس تعلیمات عامہ نے اس سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا اور تقسیم آدھوں آدھوں کی تھی یعنی پانچ ارکان مشرقی جماعت کے مقابلے میں مغربی جماعت سے وابستہ تھے۔ لہذا وہاں کوئی فیصلہ ہونا نہ سکا۔ لارڈ میکالے نے مجلس کے اندر زحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انھیں معاہدہ امتداد یعنی رکن قانون ہونے کی حیثیت سے لازماً یہ قضا میرے سامنے آئے گا۔ بالآخر وہی ہوا جس کے وہ تھی تھے۔ مجبوراً یہ فیصلہ لارڈ میکالے کے سامنے پیش کیا گیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لارڈ میکالے نے اس

کے متعلق ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۲۳) کی رو سے لفظ "ادب" سے مراد انگریزی ادب بھی تو ہو سکتا ہے اور "ہندوستانی اہل علم" کا نام اس شخص کو بھی دیا جاسکتا ہے جو لاک کے فلسفے کا ماہر ہو اور اسے ملٹن کی نظمین ازبرہوں۔ جہاں تک "مغربی علوم اور سائنس کی ترقی و اشاعت" کا سوال ہے تو یہ صرف انگریزی کو ہی ذریعہ تعلیم بنا کر ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر دفعہ (۲۳) سے وہ مراد نہیں جو میں نے قلم بند کہا ہے تو میں اسی پر راضی ہوں کہ اس دفعہ کی مزید توضیح کے لیے اسے مکر پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے، یا پھر اس میں ترمیم کی جائے۔ لیکن جہاں تک ذریعہ تعلیم کا سوال ہے تو ہندوستان کی بول چال کی زبان میں ابھی اتنی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اسے جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لیے استعمال کیا جاسکے کیونکہ تمام ہندوستانی زبانیں ابھی کم عمر اور ناچستہ ہیں۔

مشرقی جماعت نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خلاف یہ استدلال پیش کیا کہ ہندوستان کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے لہذا یہ خدشہ ہے کہ کہیں یہ لوگ تعلیم ہی سے یکسر معرض و متنفر نہ ہو جائیں۔

غرض کافی بحث و تمحیص کے بعد لارڈ میکالے نے حسب ذیل سفارشات قلم بند کیں۔

(۱) عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت فوراً بند کر دی جائے۔

(۲) کلکتے کا مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج بند کر دئے جائیں۔

(۳) سنسکرت کالج بنارس اور دلی کالج حسب ضرورت جاری رکھے جاسکتے ہیں لیکن

اس شرط پر کہ اگر اب وہاں کوئی طالب علم داخلہ لینے کو آئے تو اسے تعلیمی وظیفہ ہرگز نہ

دیا جائے۔ اور

(۴) ان اقدامات سے جو روپے اس سے مختلف اہم شہروں میں مدارس کھولے جائیں

جن میں انگریزی پوری توجہ سے پڑھائی جائے۔

Selections from Educational Records vol. 1, P. 107

Selections from Educational Records vol. I, P. 107-108

۳۰۰ بحوالہ قدیم دلی کالج ص ۲۲

مجلس تعلیمات عامہ کی مشرقی جماعت نے میکالے کی ان سفارشات کی پرزور مخالفت کی اور پرنسپل نے تو اس کا جواب بھی لکھا۔ لیکن گورنر جنرل لارڈ ڈبلیو نے یہ کہتے ہوئے کہ کونسل کے کسی رکن کے خلاف انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ ان کے دلائل پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ اور میکالے کی ہم نوائی کرتے ہوئے، مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک قرارداد کے ذریعے حکم صادر کر دیا کہ ”ہندوستان میں گورنر جنرل ان کونسل نے کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن (مجلس تعلیمات عامہ) کے سیکریٹری کے ۲۱ اور ۲۲ جنوری کے مراسلوں اور دوسرے متعلقہ کاغذات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔“

(اول) ہنر لارڈ ڈشپ کی رائے ہے کہ برطانوی حکومت کا عظیم مقصد ہندوستان میں یورپی ادب اور سائنس کی ترقی ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ تمام امدادی رقمیں جو تعلیم کے لئے تھیں ان کا بہترین مصرف یہ ہے کہ انھیں انگریزی علم پر لگایا جائے۔

(دوم) لیکن ہنر لارڈ ڈشپ کا ارادہ دیسی علوم کے کسی کالج یا اسکول کو بند کرنا نہیں ہے۔ اور اگر دیسی باشندے کسی ایسے ادارے سے فائدہ اٹھانا چاہیں گے تو ہنر لارڈ ڈشپ ہدایت کرتے ہیں کہ کمیٹی کے زیر نگرانی اداروں کے تمام موجودہ پروفیسروں (کو تنخواہیں) اور طالب علموں کو وظیفے ملتے رہیں گے۔ مگر ان اداروں میں داخلہ لینے والے نئے لوگوں کو کوئی وظیفہ نہیں ملے گا۔ اور یہ کہ جب کبھی مشرقی علوم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو کمیٹی حکومت کو تعداد، صورت حال اور عہدے کی تفصیلات سے مطلع کرے گی تاکہ حکومت دوسرے تقرری مصلحتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکے۔

(سوم) گورنر جنرل ان کونسل کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کمیٹی نے خاصی بڑی رقم مشرقی تخلیقات (کی اشاعت) پر صرف کی ہے۔ ہنر لارڈ ڈشپ ہدایت کرتے ہیں کہ اب امداد کا کوئی حصہ اس طرح کے مصرف میں نہ لایا جائے۔

(چہارم) ہنر لارڈ ڈشپ ہدایت کرتے ہیں کہ ان اصلاحات کے لیے جو سرمایہ کمیٹی

۱۔ مجلس تعلیمات عامہ کے سیکریٹری، جو مشرقی زبان و ادب کے بہت بڑے حامی تھے۔

کو تفویض ہوگا وہ اب سے دیسی آبادی کو انگریزی زبان کے ذریعہ انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دینے پر صرف ہونا چاہیے اور ہنر لارڈ ڈشپ کیٹی سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس مقصد کے حصول کا ایک منصوبہ حکومت کی خدمت میں پیش کرے۔

اس قرار داد کے جاری ہوتے ہی ہندوستانیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس کی مخالفت صرف انہی لوگوں نے نہیں کی جن کی روزی پر اس سے آپخ آتی تھی۔ بلکہ بہت سے یورپی مستشرقین بھی اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ شیک پیر نے، جو مجلس تعلیمات عامہ کے صدر تھے اس کی صدارت سے دست بردار ہو کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اب ان کی جگہ مسند صدارت پر بھی میکالے ہی رونق افروز ہوئے۔

غرض اس قرار داد کے ذریعے سے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو مزموم کوشش کی گئی اس سے ہندوستانی طلبہ کافی پریشان ہوئے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ نادار اور غیر مستطیع طالب علموں کے وظائف بند کر دیے گئے جن کے سہارے وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لہذا انھیں تعلیمی سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ دیگر ملازمین جن کی روزی دلی کالج یا ایسے ہی مشرقی مدارس سے وابستہ تھی یا وہ لوگ جو ایسے ہی مدارس سے اپنی ملازمت کی امیدیں وابستہ کیے تھے وہ سرگردان اور پریشان نظر آنے لگے۔

لارڈ آکلینڈ کی آمد :-

ولیم بیٹنگ کے بعد جب آکلینڈ ۱۸۳۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل ہو کر آئے تو یہاں کے تعلیمی اوق پر ایک ایسا ستارہ نمودار ہوا، جس کے ضیا پاشیوں سے یہاں کے مشرقی تعلیمی حلقوں میں امید کی ایک نئی کرن جگمگا اٹھی۔ انھوں نے آتے ہی یہاں کے تعلیمی مسئلے کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مشرقی جماعت کی اصل ناراضگی طلبہ کے وظائف اور مشرقی علوم و فنون کی کتابوں کی طباعت و اشاعت بند کرنے کی بنا پر ہے، لہذا انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی وجہ سے چنانچہ انھوں نے ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک قرار داد مجلس تعلیمات عامہ کے نام جاری کی جس کے خاص امور یہ تھے۔

۱۔ بہت سے ہندوستانیوں کی تعلیم ہندوستان میں ۱۰۳-۱۰۲

۱۱) موجودہ مشرقی تعلیمی ادارے بدستور جاری رکھے جائیں اور پروفیسروں کی جگہ خالی ہونے پر فاضل اور سند یافتہ طلبہ اسی تنخواہ پر کام کریں گے۔ علاوہ بریں طالب علموں کے وظائف بند نہ کیے جائیں۔
(۲) منظور شدہ رقوم سے مشرقی علوم و فنون کی کتابوں کی طباعت و اشاعت حسب معمول جاری رکھی جائے۔

(۳) ایسی مدرسوں کا فرض ہو گا کہ اپنے طالب علموں کو مشرقی زبان میں تعلیم دیں۔ اس مقصد کی بجآوری کے بعد انگریزی زبان کا "اضافی" انتظام کریں اور اگر اس راہ میں مالی مشکلات حاصل ہوں تو اس کے لیے الگ سے روپے منظور کیے جائیں گے۔

گورنر جنرل نے ان مدوں پر خرچ کی گئی اکیس ہزار کی زائد رقم کی بھی منظوری دی۔ اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ اس معمولی رقم کے مزید خرچ سے یہ قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کمپنی نے ان کے اس فیصلے کو بلا پس و پیش قبول کر لیا۔ ابھی تک دلی کالج میں اردو اور انگریزی زبانوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو رہی تھی۔ لیکن آکلینڈ نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ جب تک ایسی زبانوں میں نصابی کتابیں تیار نہیں ہو جاتیں تب تک انگریزی کی وساطت سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا جائے اور جب ایسی زبانوں میں بقدر ضرورت کتابیں تصنیف ہو جائیں تب طلبہ کو اختیار ہو گا وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں یا انگریزی میں۔

آکلینڈ کے اس فیصلے پر مشرقی جماعت نے ایسی زبانوں میں کتابیں تیار کرنے کی ایک تحریک چلائی، لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دلی کی مقامی مجلس نے ۱۸۳۵ء میں "ایجوکیشن کمیٹی" قائم کی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ انگریزی بورد نے تعلیم بنانے کی مزموم دستاویز شائع ہوئی تھی۔ اس کمیٹی کا مقصد ایسی زبانوں میں درسی کتابوں کی تالیف و تصنیف تھا۔ اس کے پہلے اسکول بک سوسائٹی نے ہزاروں کتابیں ایسی زبانوں میں شائع کی تھیں۔ لیکن اس کی توجہ صرف ایسی زبانوں سے زیادہ سنسکرت اور عربی کی طرف مبذول رہی۔

جب آکلینڈ نے ایسی زبانوں میں کتابوں کی تیاری کی طرف توجہ دلائی تو یہ کمیٹی بھی یہاں تک

لے واضح ہو کہ گورنمنٹ نے مشرقی علوم کی کتابوں کی اشاعت نیز طلبہ کے وظائف سے اپنے جینی رقم پت کرتے کی اجازت دی تھی اس سے اکیس ہزار روپے زیادہ خرچ ہو چکے تھے۔

میں آئی اور ۱۸۲۱ء میں "ایک ضمنی کمیٹی" قائم کی جس کے ارکان میں یورپی مستشرقین مسٹر پرنسپ
 مسٹر سدرلینڈ، مسٹر ایڈورڈ ریان (Ryian) اور ملٹ بھی شریک تھے۔ اس کمیٹی نے تجویز
 پیش کی کہ۔

(۱) صرف و نحو پر کتابیں تیار ہونا چاہئیں۔

(۲) ایسے افراد کا انتخاب ہونا چاہیے جو اس کے اہل ہوں اور بلا معاوضہ یا معمولی تنخواہ پر کام کر سکیں۔

(۳) ہر شعبہ علم سے متعلق کتابوں کی تیاری بہ تدریج عمل میں آنا چاہیے۔

بہر حال ایجوکیشن کمیٹی یا اس عہد کی دوسری انجمنوں نے جو بھی کتابیں لکھوائیں اور شائع کیں،

وہ صرف مدارس تک محدود رہیں۔ مدرسوں کے احاطے کے باہر ان کی مانگ نہیں کے برابر تھی تاریخ

ہندیا نیچرل فلاسفی وغیرہ موضوعات پر کتابیں لکھوائی جاتیں تو یقیناً وہ مقبول انام ہوتیں۔ اور

ان کی ہندوستان میں کھپت بھی ہوتی۔ لیکن ان کی قیمت اتنی زیادہ ہو جاتی کہ ہندوستانی آسانی

سے ادا نہ کر پاتے۔ یہ سب پریشانیاں تھیں، جن کے باعث دلی کی مقامی مجلس اپنے اس مقصد

میں پوری طرح ناکام رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایسے تجربہ کار اور باشعور مترجم ذیل

سکے جو بلا معاوضہ یا کم تنخواہ پر کام کرتے اور نہ اسے صاحب ثروت اشخاص کی سرپرستی ہی حاصل

ہو سکی جو اس سمجھتے ہوئے چراغ کو روشن رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے۔ لہذا ان کے لڑکھڑاتے

ہوئے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی جماعت کی کوششیں صدا بہ صحران ثابت

ہوتیں۔

فیلکس بوٹرو پرنسپل :-

دلی کالج کے قیام کے وقت سے مسٹر جوزف ہنری ٹیلر اس کے عارضی پرنسپل چلے آ رہے تھے۔

وہ اس کے پرنسپل ہی نہیں بلکہ اس کی انتظامیہ کمیٹی کے سکتر اور کرتادھرتا بھی تھے۔ ان متنوع

و گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے پرنسپل کا کام کما حقہ، انجام نہیں دے پاتے تھے، جس سے اس

بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کسی ایسے شخص کو پرنسپل بنایا جائے جو اپنا پورا

وقت کالج کی دیکھ بھال اور درس و تدریس میں صرف کر سکے۔ اس کے لیے حکومت سے

منظوری بھی مل گئی تھی اور ۱۸۲۷ء میں مسٹر ٹیلر کا نام بھی لیا گیا تھا۔ لیکن کئی سال تک اس

پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ۱۸۴۱ء میں ایک فرانسیسی مستشرق کو جس کا نام فیلکس بوترو (Felix Boule) تھا، چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر دلی کالج پرنسپل مقرر کیا گیا۔
 مسٹر بوترو اوائل عمری ہی میں ہندوستان آگئے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے ہندوستانی زبان میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ ہندوستانی زبانوں میں نہ صرف گفتگو کرتے بلکہ مضامین بھی لکھ لیتے تھے۔ مزید برآں انھوں نے تعلیم کی تکمیل بھی ہندوستان ہی میں کی تھی۔ جس وقت بوترو کالج کے پرنسپل تھے اس زمانے کے حالات کی دیدہ و دریافت کے لئے اس خط سے زیادہ معتبر کوئی دستاویز موجود نہیں، جو انھوں نے ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء کو گارسن ڈی ٹسی (۱۸۷۸ء - ۱۹۴۷ء) کے نام لکھا تھا۔ اس لیے ہم اس خط کا پورا متن یہاں نقل کر رہے ہیں۔

دہلی۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء

دہلی کالج میں تعلیم کے دو شعبے ہیں۔ پہلے میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ جدید یورپ کے علوم (sciences) پڑھائے جاتے ہیں۔ اور دوسرے میں قدیم مشرقی زبانیں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ کالج میں بیس پروفیسر ملازم ہیں۔ دلی کالج کے زیر نگرانی دو دوئم درجے کے کالج بھی ہیں۔ ایک میرٹھ میں دوسرا بریلی میں۔

ہندوستانی زبان نے دو تین سال میں ایسی اہمیت حاصل کر لی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔ یہ بہار اور مغربی صوبوں کی یعنی راج محل سے لے کر ہر دو ارتک کی سرکاری زبان بن گئی ہے۔ ہر دو ارتک ہمالیہ کے دامن میں ایک قصبہ ہے۔ مزید برآں یہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اور کم سے کم چار کروڑ اشخاص اسے روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب انگریزی خدمات نے اسے عدالتوں اور سرکاری اخباروں میں جاری کر دیا ہے۔

تقریباً چھ مہینے سے میں نے کوئی بیس مترجم کالج میں ملازم رکھے ہیں۔ یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے علاوہ انگریزی کی بعض کتابیں متعلقہ علوم طبیعیات، حاشیات، تاریخ، فلسفہ، قانون اور برطانوی ہند میں رائج الوقت قانون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔

راماین اور مہا بھارت کا ترجمہ یقیناً خالی از دل حسبی نہ ہوگا۔ فی الحال میں نے ان دو نظموں کے ایک خلاصے سے ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ بعد میں اصل کے مکمل ترجمے کی طرف توجہ کروں گا۔

(ژورنال آسیانک۔ فروری ۱۸۴۲ء)

دستخط بوتروس

مسٹر بوتروس کا پرنسپل ہونا دلی کالج کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ کیوں کہ وہ اس اصول کے پر زور حامی اور مؤید تھے کہ یہاں کے طلبہ کی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونا چاہیے لیکن یہاں دسی زبانوں میں کتابیں ناپید تھیں اور کتابوں کے بغیر کام چلتا محال تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۸۴۳ء میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن قائم کی جس کا نام (Society for the Promotion of Knowledge in India Through the medium of Vernacular Language) (انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنڈملکی) تھا۔ لیکن اتنے بڑے نام کا یاد رکھنا آسان نہ تھا اس لیے بعد کے مصنفوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جن میں دو نام زیادہ مقبول ہوئے: "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" (Delhi Translation Society) اور "ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (Vernacular Translation Society)۔ اس سوسائٹی کی دیکھ بھال اور اسے بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی جو مندرجہ ذیل چھ ارکان پر مشتمل تھی۔

پرنسپل دلی کالج	سکرٹری	(۱) فیلکس بوتروس
دلی	رکن	(۲) ٹامس سٹکاف
"	"	(۳) چارلس گرانٹ
"	"	(۴) ک۔ ریون شا

لہ اس خط کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج کے شروع میں یعنی صفحہ اول سے پہلے اور فہرست کے بنیاد پر لکھا ہے جس پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔

کلتہ	رکن	(۵) ولیم سان کونٹون
"	"	(۶) دوار کا ناتھ ٹنگور

اس سوسائٹی کے معاونین اور حامیوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ معظیوں کی کل تعداد ایک سو سولہ تھی جس میں بادن انگریز تھے جو چندے میں بھی تقریباً برابر کے شریک تھے۔ یہ ہندوستان کی جن معزز ہستیوں نے اپنے گراں قدر عطیات سے اس سوسائٹی کو نوازا تھا ان میں شاہ اودھ اور حیدرآباد کن کے سالار جنگ، ہرات الملک بہادر اور راجہ رام کشن کے نام نمایاں ہیں۔ سوسائٹی کے قیام کا مقصد جملہ علوم و فنون کی کتابیں ہندوستانی زبانوں میں مہیا کرنا تھا۔ چونکہ مغربی و مشرقی علوم و فنون کی کتابیں دیسی زبانوں میں موجود نہ تھیں اس لیے یہ سب ہو کر عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ انگریزی زبان کی اہم کتابیں بھی اردو ہندی اور بنگلہ میں ترجمہ کرائی جاتیں اور خاص طور پر درسی کتابوں کو اولیت دی جائے۔

ترجمے کا کام شروع ہوا تو منصوبے کے مطابق مختلف موضوعات پر کتابیں تیار کی گئیں جن سے مشرقی طلبہ کو بہتر فائدہ پہنچا۔ اب وہ سائنس، ریاضی، فلسفہ، تاریخ و جغرافیہ اور قانون وغیرہ کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرنے لگے۔ اس طریقہ تعلیم سے مشرقی شعبے کے طلبہ سائنس اور جدید علوم کے حصول میں مغربی شعبے کے طلبہ کے دوش بدوش ہی نہیں آگئے بلکہ بعض میدانوں میں ان پر سبقت بھی لے گئے۔ اس ضمن میں ماسٹر رام چندر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھیں اپنے دور میں جو امتیاز حاصل ہوا اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔

بوٹرو کے دوران پرنسپل اردو میں کتابوں کے ترجمے اور تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے "اگرچہ اس (اردو) زبان میں کتب علمی انگریزی کی ابتدا سے کم و بیش ترجمے ہوتے رہے۔ مگر زیادہ تر اور قابل شمار ترجمے دہلی میں بوٹرا صاحب بہادر پرنسپل سابق دہلی کالج کی تجویز اور کوششوں سے ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۵ء تک ہوئے۔"

۱ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۲۶ لے لیکن صرف اردو ہی میں کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، ہندی اور بنگلہ میں نہیں سہ مولانا محمد حسین آزاد جلد اول مرتبہ آغا محمد باقر، ص ۶۱-۶۲

مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام :-

کالج میں انگریزی شعبے کا اضافہ ۱۸۲۸ء میں کیا گیا تھا۔ لیکن اعتماد الدولہ کے وقف کے بے جامہ اور انگریزی کی مخالفت کی بنا پر ۱۸۳۱ء میں اس شعبے کو مشرقی شعبے سے علاحدہ کر دیا گیا تھا، جہی سے یہ دونوں شعبے الگ الگ عمارتوں میں کام کر رہے تھے۔ یہ ۱۸۴۲ء میں مسز پورٹرنے دوبارہ دونوں شعبوں کو یک جا کر دیا۔ اس انضمام سے طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین کے مدرسے میں کلاسز کا چلنا محال ہو گیا۔ اس لیے وہاں سے کالج کو کشمیری دروازے کے اندر داراشکوہ کے کتب خانے والی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اجمیری دروازے والی عمارت کالج کے پرنسپل کے قبضے میں تھی جو کبھی کبھی بورڈ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ”قبض کی تیلیوں“ والا مشہور مشاعرہ۔۔۔ غازی الدین خاں کے مدرسے ہی میں ہوتا تھا۔ جس میں ٹامس نگران نے ۱۸۴۱ء میں یہ مشورہ دیا تھا کہ انگریزی شعبے کے لیے جگہ ایسی ہونا چاہیے کہ وہ یورپی بنگلوں کے قریب ہو۔ عموماً یورپی بنگلے کشمیری دروازے کے باہر تھے۔ اس تبدیلی سے ان کے عندیہ کی بھی تکمیل ہو گئی۔

ان دونوں شعبوں کو ملانے سے کالج کی تعطیلات میں اہم تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اب سبھی طلبہ کو صرف اتوار کو چھٹی دی جانے لگی اور مسلمان طلبہ کو جمعہ کو اتنی چھٹی دی جاتی کہ نماز جمعہ ادا کر سکیں۔ اس سے قبل عیسائی طلبہ کو اتوار کے دن مسلمان طلبہ کو جمعہ کے روز اور ہندو طلبہ کو ہر ماہ کی پہلی، آٹھویں، پندرھویں اور بائیسویں تاریخ کو چھٹی دی جاتی تھی۔

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص۔ ۲۷

۲۔ خواجہ احمد فاروقی نے ”واقعات دارالحکومت دہلی“ از بشیر الدین احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”دہلی کالج

۱۸۴۲ء تک اجمیری دروازے میں رہا۔ بعد میں کشمیری دروازے کے قریب نئی عمارت میں

منتقل ہو گیا۔ (ذوق و جستجو۔ ص ۲۳۸)

۳۔ خواجہ احمد فاروقی۔ ذوق و جستجو۔ ص ۲۳۸

۴۔ آب حیات ص ۲۲۵

مسٹر بوترو کے ان دو کارناموں، دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام اور انگریزی اور مشرقی فوجوں کے انضمام سے اردو ادب اور مشرقی شعبے کے طلبہ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اردو ادب میں علوم جدیدہ کے موضوعات پر کافی کتابیں ترجمہ یا تالیف ہوئیں، جن سے اردو کے علمی سرمائے میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہ کتابیں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوئیں۔

بوترو کا مشروط استعفا :-

کالج اور سوسائٹی کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف و منہمک رہنے اور ہندوستان میں طویل قیام کی وجہ سے بوترو کی صحت خراب ہونے لگی اور وہ کبھی کبھار بیمار رہنے لگے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ اپنے وطن فرانس چلے جائیں تو تبدیلی آب و ہوا سے شاید کچھ خوش گوار نتیجہ نکل سکے۔ ڈاکٹروں کے اس مشورے پر ۱۸۴۵ء میں انھوں نے مشروط استعفا لکھا کہ اگر میں دو برس بعد فرانس سے واپس آؤں تو میرے استعفیے پر کوئی عجز نہ کیا جائے اور اس دو سال کے وقفے کو تعطیلِ علالت تسلیم کیا جائے اور مجھے حسب سابق پرنسپل کا عہدہ دیا جائے۔ فرانس پہنچنے کے بعد ان کی صحت بحال ہو گئی۔ وہاں انھوں نے شادی بھی کی، لیکن دوبارہ ہندوستان بہنا خدا کو منظور نہ تھا۔ فرانس ہی میں ۱۸۶۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح وہ صرف پانچ سال دلی کالج کی خدمت انجام دے سکے۔ گارسن ڈی ٹسی کا یہ بیان جو انھوں نے ۱۸۵۲ء کے خطبے میں دیا ہے قطعی درست نہیں کہ دلی کالج کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے فلیکس بوترو ہی ہے۔

ڈاکٹر اشیر نگر دلی کالج میں :-

مسٹر بوترو کے مشروط استعفیے اور فرانس مراجعت کے بعد الاز اشیر نگر (Alloys) کالج کے پرنسپل اور دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہ تھے توجرمن نژاد، لیکن عربی و فارسی میں اچھی مہارت رکھتے تھے اسلامی اور مشرقی علوم سے انھیں غیر معمولی شغف تھا اسی ذوقِ جستجو نے انھیں ہندوستان آنے اور دلی کالج کی پرنسپل شپ قبول کرنے کی ترغیب دی۔

۱۰ خطبات گارساں و تاسی ص ۱۰

اشپرنگر نے آتے ہی مشرقی شعبے کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ یورپ میں عربی و فارسی کی جو کتابیں طبع ہو چکی تھیں انہوں نے انہیں وہاں سے منگا کر داخلِ نصاب کیا اور بعض کے اردو ترجمے کرائے۔ علاوہ بریں دلی کالج سے بعض اردو جرائد کا اجرا بھی انہیں کی دل چسپیوں کا رہن منت ہے۔

مارچ ۱۸۴۸ء میں اشپرنگر حکومت کے ایما سے اودھ کے شاہی کتب خانے کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے کے لئے لکھنؤ پہنچے، اور وہاں تقریباً ۲۲ مہینے قیام کیا۔ اس قلیل مدت میں انہوں نے تقریباً دس ہزار کتابوں کی ورق گردانی کی اور ان میں سے اہم اور مفید کتابوں کی ایک جامع فہرست تیار کی جو "اودھ کٹیلاگ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس فہرست میں ہر کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کا مختصر حال بھی لکھا گیا ہے۔

اشپرنگر کی عدم موجودگی میں کالج کے سابق و عارضی پرنسپل اور موجودہ فرسٹ اسٹنٹ اور ہیڈ ماسٹر مسٹر ٹیلر قائم مقام پرنسپل رہے۔ جنوری ۱۸۵۰ء میں اشپرنگر لکھنؤ سے واپس آئے لیکن اب زیادہ دنوں تک دلی میں رہنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ تین چار مہینے کے بعد وہ علالت کی وجہ سے شملہ چلے گئے۔ اس کے بعد وہ فارسی کے ترجمان اور ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد بن کر کلکتہ چلے گئے۔

کارگل پرنسپل :-

۱۹ اپریل ۱۸۵۰ء کو اشپرنگر شملہ گئے تو کالج کی باگ ڈور جان کارگل کے ہاتھ میں آئی۔ دستور کے مطابق سوسائٹی کے سکریٹری کی ذمہ داریاں بھی انہیں سنبھالنا پڑیں۔ جان کارگل کو پرنسپل بننا بھی مشکل سے دو سال ہی ہوئے تھے کہ ۱۸۵۲ء میں مشرقی شعبے کے سائنس کے استاد رام چندر اور کالج کے ایک سابق طالب علم چمن لال عیسائی ہو گئے۔ یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس کے نتیجے میں خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور کالج کو یک بارگی بڑا دھچکا لگا۔ طلبہ نے اس سال نہ صرف یہ کہ داخلے سے احتراز کیا بلکہ بعض طالب علموں نے کالج سے نام کٹا کر دوسرے مدرسوں میں ہوا خلے بھی لیے۔ لیکن مرد ایام کے ساتھ ساتھ لوگ اس واقعہ کو بھولتے اور نظر انداز کرتے گئے۔ اور ۱۸۵۳ء تک طلبہ بھر کثرت سے داخلہ لینے لگے۔

۱۸۵۲ء میں جب مسٹر کارگل نے اپنے عہدے سے استعفا دیا تو پھر مسٹر ٹیلر کو قائم مقام پرنسپل بنایا گیا۔ مسٹر ٹیلر نہ صرف کالج کے بانیوں میں سے تھے بلکہ جب تک وہ زندہ رہے کالج کے سرگرم معاون اور روح رواں بنے رہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ یعنی تیس برس تک اس ادارے کی خدمت کی اور اس مدت میں جو کارنامے انجام دیے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین اور قابل ستائش ہیں۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ :-

۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ جسے ہندوستانی مورخین پہلی جنگ آزادی سے موسوم کرتے ہیں اور انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، یہ ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ کا ایک ایسا اہم واقعہ ہے جو بیک وقت زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوا اور جس کی ہوش ربا یادیں برسوں ذہنی یک سوئی اور طمانیت قلب کا شیرازہ منتشر کرتی رہیں۔ اس ہنگامے کے دوران ہزاروں قیمتی جانیں نذر اجل ہوئیں اور صد ہا عالمی شان عمارتیں دیکھتے دیکھتے خاک کے ڈھیر بن گئیں۔ تعمیر و ترقی سے متعلق تمام سرگرمیاں ایک طویل عرصے تک معطل رہیں۔ کچھ ادارے مہینوں بند پڑے رہے۔ اس انقلاب عظیم سے دلی کالج سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ بند ہوا تو سات سال تک بندی رہا۔ اور اس کے باقی اور مخلص خادم مسٹر ٹیلر بھی اس شورش کی نذر ہو گئے۔ مالک رام نے اس ہنگامے اور ٹیلر کی موت کا مجمل لیکن جامع نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

• اڑھنی پیر کے دن صبح کے وقت جب میرٹھ کی فوج شہر میں آئی اور انگریزوں کا قتل عام شروع ہوا تو انگریزی فوج کے کماندان کے مشورے پر ٹیلر صاحب اور کالج کے دوسرے مہاسین سب نے بھاگ کر سرکاری میگزین میں پناہ لی۔ یہاں اندر دس بارہ آدمی تھے۔ اسی سپاہ نے میگزین کا محاصرہ کر لیا۔ اور سپاہی ٹیلر کی مدد سے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگے، گھرے ہوئے انگریزوں کو اپنے بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی، تو انھوں نے میگزین کے بارود کو آگ لگا دی۔ پوری عمارت بھگ سے اڑ گئی۔ خود بھی مرے اور سیکڑوں ہندوستانی بھی ان کے ساتھ اجل کا شکار ہو گئے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اتنے بڑے حادثے کے

باوجود ٹیلر صاحب کسی طرح یہاں سے بچ نکلے اور کالج واپس آگئے۔ وہ اپنے بوڑھے مسلمان خاندان کی مدد سے قریب ہی مولوی محمد باقر (مولوی محمد حسین آزاد کے والد) کے مکان پر پہنچے۔ ٹیلر صاحب کا ان سے پرانا یارانہ تھا۔ مولوی محمد باقر نے انہیں اپنے مکان کے تہ خانے میں چھپا دیا۔ وہ یہاں ایک رات، ایک دن رہے، لیکن نہ جانے کیسے اگلے دن یہ خبر محلے بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ محمد باقر کے ہاں ایک گورا چھپا بیٹھا ہے۔ لوگ غم و غصے سے پاگل، ان کے مکان پر چڑھ ڈرے۔ مولوی محمد باقر نے دیکھا کہ اب مخلصی کی کوئی صورت نہیں تو انہوں نے ٹیلر کو ہندوستانی کپڑے پہنا کر وہاں سے کھسک جانے کو کہا۔ یہ غریب اس سیت کڑائی میں جا رہے تھے کہ لوگوں نے انہیں پہچان لیا۔ بس کیا تھا بھڑنے انہیں نرغے میں لے لیا اور لاٹھیاں مار مار کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس شورش کے نتیجے میں کالج کی لائبریری اور لیبارٹری بھی بری طرح تباہی و بربادی کا شکار ہوئی۔ کتابوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ پھاڑا پھینکا اور جلا دیا گیا۔ بعض لوگ کچھ قیمتی اور مفید کتابیں اٹھائے گئے جو کلاسروں کے ہاتھ کوڑی کے مول بچ دی گئیں۔ سائنسی آلات کو توڑا پھوڑا اور ان میں سے پتیل تا بنا حسہ وغیرہ نکال کر انہیں اس قدر برباد کر دیا گیا کہ وہ دوبارہ کام کے نہ رہے۔

جب ہنگامہ ختم ہوا تو حکومت بدل چکی تھی۔ اب ہندوستان کی زمام سلطنت براہ راست برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لیے حکام کو از سر نو نظم و نسق قائم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دوستوں کو جزا اور دشمنوں کو سزا دینے کی دھن سوار تھی۔ انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ کالج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔ جن ہندوستان کو کالج کے معاملات سے دل چسپی تھی وہ اپنی جان اور عزت و آبرو کے لیے سرگرداں تھے۔ عائد اور مغز زین کو کھلے عام گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اور جو لوگ روپوش تھے، ان میں سے اکثر کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔

کالج کی نشاۃ الثانیہ :-

کالج ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بند ہوا تھا۔ اس کے ٹھیک سات سال بعد یکم مئی ۱۸۶۴ء کو اسے دوبارہ جاری کیا گیا، لیکن نہ وہ زمین تھی نہ وہ آسمان۔ وہ لوگ جنہیں علوم شرقیہ سے والہانہ محبت تھی خود بے ٹھکانا ہو چکے تھے۔ اس تبدیلی کے ساتھ کالج کی عمارت بھی تبدیل کر دی گئی۔ کشمیری دروازے والی عمارت کو خیرباد کہہ کر اب اسے کمیٹی کے کتب خانے والی عمارت میں جو چاندنی چوک میں گھنٹا گھر کے بائیں جانب واقع تھی، لے آیا گیا۔

کالج کھلنے کو تو کھل گیا لیکن اس کی گئی ہوئی رونق اور چہل پہل واپس نہ آسکی۔ حکام کا رویہ بھی کالج کی جانب سرد مہری ہی کارہا۔ کالج کھلنے کے چار پانچ مہینے تک اس کے کڑا دھڑا پروفیسر ہین (Halkam) رہے۔ جب مسٹر ایڈمنڈ ولونٹ (Admand Wilmont) ولایت سے پرنسپل بنا کر بھیجے گئے تو مسٹر ہیلٹن انگریزی پڑھانے لگے۔ ۱۸۶۵ء میں ہیلٹن انسپکٹر مدارس ہو کر پنجاب چلے گئے، تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے جی۔ کے کک (G. K. C. C. K.) کو بلا یا گیا۔ فروری ۱۸۶۸ء میں ولونٹ بھی کالج سے دست کشی اختیار کر لی۔ تو کک صاحب کو ترقی دے کر پرنسپل بنا دیا گیا۔

مسٹر ولونٹ نے بڑے ریاض سے ریاضیات پر پھر دینا شروع کیا تھا۔ ان کی اس بدعت سنہ یعنی لکچر میٹھڈ (Lecture Method) سے بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں۔ لیکن وہ ایک حادثے کی بنا پر کالج کی خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ وہ علم ہندسہ کے جید عالم تھے اور انٹرنس کی جماعت کو ریاضی پڑھاتے تھے۔

غدر کے بعد کالج دوبارہ شروع ہو تو سنسکرت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہندو طلبہ بھی عربی پڑھنے لگے۔ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے اس پر شور مچایا تو ایک پنڈت جی کو سنسکرت پڑھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس سال ایف۔ اے۔ کے پچیس طلبہ میں سے اکیس نے سنسکرت لی تھی۔

کالج کا زوال اور خاتمہ :-

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد حکومت نے دلی والوں کے ساتھ جس سرد مہری بلکہ انتقام

کا دیہ اختیار کیا اس کے زیر اثر دلی کالج کے وظائف کی رقم بھی کم ہو کر صرف چھٹا حصہ رہ گئی۔ چنانچہ کالج میں وہ کشش باقی نہ رہی جو غدر سے پہلے تھی۔ نتیجے کے طور پر طلبہ کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ اس کے برعکس بنارس، آگرہ اور بریلی کے کالجوں کے وظائف بدستور جاری رہے۔ حالانکہ کالج کے پرنسپل نے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر وہی حالت رہی تو پنجاب کے تمام کالج ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن لفٹیننٹ گورنر نے اس کا سنسنے کا اس کا اڑا دیا۔

۱۸۵۷ء میں جب دلی میں انگریزوں پر عرصہ حیات تنگ تھا تو پنجاب نے انہیں کمک پہنچائی تھی، چنانچہ حالات پر دوبارہ قابو پانے کے بعد انہوں نے اہل پنجاب کے مقابلے میں دلی والوں کو نیچا دکھانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس فارمولے کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ دلی کالج کو محکمہ تعلیم پنجاب کے انتظام میں دے دیا جائے۔ اس طرح دلی کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی امتحان لینے کی مجاز بھی نہ تھی اور کالج کی اعلا جماعت کے طلبہ کلکتہ یونیورسٹی سے امتحان دیتے تھے۔ طلبہ کے وظائف بند ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی اور مشرقی علوم فنون کی تعلیم سے حکومت بہت زیادہ تغافل برتنے لگی تھی۔ اس کے باوصف بھی کالج شتم پشتم چلتا رہا۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر لائسنڈ (Dr. Laidlaw) گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بن کر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا کالج خوب چمکے۔ پرنسپل شپ کے دوران انہوں نے سرکاری حلقے میں کافی اثر و رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے سرکار کے اعلا افسروں سے کیا کہا سنا کہ حکومت نے دلی کالج کو لاہور کالج میں ضم کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس حکم کے تحت اپریل ۱۸۷۷ء میں دلی کالج توڑ کر اس کے تمام طلبہ اور اساتذہ کو لاہور گورنمنٹ کالج بھیج دیا گیا۔ اس طرح اہل دلی اپنے محبوب دلی کالج سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

دلی کالج دوسرے نام اور شکل میں؛

دلی کالج کے خاتمے کے بعد دلی کے بعض عاقد تعلیمی ضروریات کے پیش نظر ایک ایسا کالج

لے وہ ایک علم مستشرق تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم ترکی میں مکمل کی تھی۔ تنہائی میں سنسکرت میں تقریر کرنے کی مشق کیا کرتے تھے۔

قائم کرنا چاہتے تھے جو دی کالج کا لیم بدل ہو سکے۔ پنا پنے اس مقصد کے لیے دلی میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ دلی کے علاوہ علی گڑھ کے بھی معزز اشخاص مدعو کیے گئے۔ اس جلسے کے روح رواں بقول سرسید احمد خاں مرزا الہی بخش کے فرزند ثریا جاہ مرزا محمد کیواں تھے۔

یہ جلسہ ۹ دسمبر بروز یک شنبہ ۱۸۸۲ء دن چاندنی محل میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے علاوہ ہندوؤں اور انگریزوں نے بھی شرکت کی، جن میں مارٹر مدن گوپال، مرزا اسمیلان جاہ (ثریا جاہ کے چھوٹے بھائی) مولوی سید فرید الدین اور سرسید احمد خاں کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں لوگوں نے اپنے اپنے چندے لکھوائے۔ سب سے زیادہ چندہ ایک ہزار روپے مرزا الہی بخش نے دیا۔ نواب ضیاء الدین احمد بہادر بہ سبب علالت جلسے میں شریک نہ ہو سکے تھے، ان کے نام پانچ سو روپے لکھے گئے۔ جب استطاعت سمجھی لوگوں نے چندے لکھوائے۔ کچھ لوگوں نے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ سے معاونت کا وعدہ کیا۔ اس طرح ایک خطیر رقم جمع ہو گئی۔

اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں دلی کالج ہی کی عمارت میں انگلو عربک اسکول قائم کیا گیا۔ دو سال بعد ۱۸۸۳ء میں اسے ہائی اسکول کی منظوری مل گئی۔ چونکہ انگریزوں کے زخم بھی پوری طرح مندمل نہ ہوئے تھے اس لیے چالیس برس تک یہ ہائی اسکول سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کافی تک دو کے بعد ۱۹۲۲ء میں اسے انٹرمیڈیٹ کا درجہ دیا گیا اس طرح ۱۹۲۹ء میں ڈگری کالج اور ۱۹۴۰ء میں پوسٹ گریجویٹ کالج تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب ملک آزاد اور تقسیم ہوا تو پھر اس کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے بروقت اس کی دست گیری کی چنانچہ یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۹۴۸ء میں حکومت ہند نے کالج کی تنظیم نو کے لیے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی، جس کی سربراہی ڈاکٹر ذاکر حسین کو سرفراز کیا گیا۔ موصوف کے حسن تدبیر سے کالج نے بڑا نام پیدا کیا۔

مرکزی وزارت تعلیم نے ۱۹۶۴ء میں ایک ٹرسٹ اور ایک نئی مجلس منتظم کی تشکیل کی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات کے اعتراف اور بقائے نام کی غرض سے اس کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین

نے انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ص ۵۵

ڈاکٹر سرسید احمد خاں۔ انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ص ۵۲ غالباً سن ۱۸۸۱ء رہا ہوگا۔

میموریل کالج رکھا گیا چونکہ یہ نام طویل تھا، اس لیے اب صرف ڈاکٹر حسین کالج ہی برقرار ہے۔ اس میں ایم۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ سی۔ کے درجات تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لوگوں کی سہولت کے پیش نظر شبینہ درجات بھی قائم ہیں۔ کالج کا الحاق دہلی یونیورسٹی سے ہے۔ نواب اعتماد الدولہ کا وقفہ اب اسی کالج کو منتقل کر دیا گیا ہے۔

دلی کالج کی تاریخ کے کچھ دیگر گوشے

سنہ	تعداد طلبہ مع قومیت			تعداد طلبہ شعبہ جات		تعداد طلبہ اور وظیفہ خوار		تعداد بیس دہندہ	فیس سالانہ دہندہ
	ہندو	مسلمان	عیسائی	جملہ	انگریزی	مشرقی	انگریزی		
۱۸۲۵ء				۸۹				۸۹	
۱۸۲۶ء				۱۲۰					
۱۸۲۷ء				۲۰۳					
۱۸۲۸ء				۴۱۳				۲۲۳	۱۳۳
۱۸۲۹ء				۳۸۱				۲۳۰	۱۲۹
۱۸۳۰ء				۴۱۵				۲۱۷	۱۲۷
۱۸۳۱-۳۲ء	۲۰۱	۱۵۸	۵۰	۳۴۳				۱۱۷	۱۴۴
۱۸۳۲-۳۳ء	۱۲۴	۱۰۸	۷	۲۳۹				۹۸	۱۲۳
۱۸۳۳-۳۴ء	۱۱۴	۸۹	۸	۲۱۱				۸۹	۸۹
۱۸۳۴-۳۵ء	۱۴۰	۸۰	۴	۲۲۴					۱۰۳
۱۸۳۵-۳۶ء	۷۳	۱۰۵	۱۱	۱۸۹					۱۰۳
۱۸۳۶-۳۷ء	۹۳	۶۰	۳	۱۵۶					۸۲
۱۸۳۷-۳۸ء	۲۱۴	۱۰۲	۱۰	۳۲۶					۱۴۹

یہ اس گزشتہ شمارہ کی ترتیب میں ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی کی تصنیف "ہمارے رام چندر" اور خاص طور سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب "مرحوم دہلی کالج" سے مدد لی گئی ہے۔

سنة	تعداد طلبہ مع قومیت				تعداد طلبہ شعبہ جات		تعداد طلبہ وظیفہ خوار		تعداد ضمیمہ دہندہ	اروپہ میں (ہائے اسکول سالانہ امتحان)
	ہندو	مسلمان	عیسائی	جملہ	انگریزی	مشرقی	انگریزی	مشرقی		
۱۸۲۲-۲۳	۱۲۴	۱۲۸	۱۲	۲۸۴	۱۲۲	۱۴۲				
۱۸۲۳-۲۴	۱۷۹	۱۱۱	۱۵	۳۰۵	۱۴۲	۱۲۳				
۱۸۲۴-۲۵	۲۹۹	۱۲۴	۱۵	۴۳۸	۲۲۵	۲۱۵				
۱۸۲۵-۲۶	۲۳۰	۱۳۲	۱۳	۳۷۵	۱۹۴	۱۷۹				
۱۸۲۶-۲۷	۲۰۹	۱۰۷	۱۸	۳۳۴	۱۳۴	۱۹۸			۱۹۲	۱۴
۱۸۲۷-۲۸	۲۲۲	۱۰۹	۱۴	۳۵۹	۱۲۸	۲۳۱			۲۲۱	۲۱
۱۸۲۸-۲۹	۲۲۲	۱۰۵	۱۲	۳۳۹	۱۱۳	۲۲۴			۴۲۲	۷۷
۱۸۲۹-۳۰	۲۳۱	۹۲	۱۱	۳۳۴	۱۱۲	۲۲۲			۹۵۸	۱۲۵
۱۸۳۰-۳۱	۲۰۴	۱۰۵	۲۲	۳۳۳	۱۱۱	۲۲۲			۱۳۵۸	۱۸۱
۱۸۳۱-۳۲	۲۱۷	۹۳	۱۰	۳۲۰	۱۲۱	۱۹۹			۱۹۱۰	۲۳۰
۱۸۳۲-۳۳	۲۰۴	۱۱۲	۱۵	۳۳۳	۱۲۲	۲۱۱			۲۰۸۲	۲۲۹
۱۸۳۳-۳۴	۲۲۳	۹۷	۱۰	۳۵۰	۱۳۳	۲۱۷				
۱۸۳۴-۳۵	۱۵۸	۸۲	۲	۲۴۵						
۱۸۳۵-۳۶				۳۲۵						

۲۳۰-۳۱-۳۲

۲۳۰۵ روپے ایک آنہ اور تین پائی۔

دلی کالج کے اجتہادی و تعمیری کارنامے

دلی کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد خواہ مغربی علوم والسنہ کی تعلیم رہا ہو خواہ مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔ خواہ اس کا مقصد ہندوستان کے ارباب علم و فضل کی سوسلہ افزائی کر کے ہندوستانوں کی تالیف قلب ہو، بہر صورت مغربی و مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم کا یہ خوش گو اور امتزاج ہندوستانیوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہوا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ جدید و قدیم اقدار کے خوش آئند ارتباط و امتزاج کی بنیاد رکھی اور اس جمہوری انداز نظر کی تاسیس و فروع کا سلمان کیا جو آج ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جس کی روشنی اور مدد سے ہم اپنے سماج اور ملک کا لائحہ عمل متعین کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب نے یورپ کو صنعتی اعتبار سے بیدار کیا جس سے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر میں مشینی دور کا آغاز ہوا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے حالات بھی اس کے متقاضی ہوئے کہ یہاں ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جہاں ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم والسنہ کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم اور سائنس سے بھی استفادہ کر سکیں۔ دلی کالج کے نصاب تعلیم کے سرسری مطالعے سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مشرقی علوم کے ساتھ تقریباً تمام مغربی علوم اور مضامین بھی شامل تھے۔ ہندوستانی طلبہ بڑے شوق و انہماک سے ان جدید علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور سائنس کے عملی تجربات میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ اور جب اپنے گھر جاتے تو اس کے عجائبات اپنے بزرگوں سے بیان کرتے تھے۔

دلی کالج کے ماحول نے وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو مذہبی منافرت، قومی تعصب اور لسانی تنگ نظری سے بلند تر رکھ کر ان میں وسعت قلب اور کشادگی ذہن پیدا کی۔ ان لوگوں

کو جہاں مشرق کی علمی و اخلاقی روایات عزیز تھیں، وہیں مغربی افکار و نظریات سے بھی کسی قسم کا بُعد نہ تھا۔ یہ طلبہ کالج سے صرف ادیب اور شاعر ہی بن کر نہیں نکلے تھے بلکہ ان میں ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل بھی ہوتے تھے اور بہتر ضرورت ان ہی میں سے بعض لوگ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں پر بھی مامور کیے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر کالج کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھنے کے بعد طلبہ کے مزاج میں جو تغیر اور فکر و نظریں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجے میں ہندوستانی ادب اور سماج میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور ایسی روایات قائم ہوئیں جن کا خوش گوار نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر دلی کالج نہ ہوتا تو شاید اس دور میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبانی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ضیاء الدین امیر نام علی (ایڈیٹر صلائے عام) مدن گوپال (ایڈوکیٹ) اور پیر زادہ محمد بخش (سٹیشن ہج) جیسی ہمہ جہت ہستیاں ہندوستان کی سرزمین پر پیدا نہ ہوئی ہوتیں۔ دلی کالج نہ ہوتا تو یہ لوگ کیا ہوتے اس کا جواب ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح دیا ہے۔

”اگر میں دلی کالج میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹارگٹیشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علی بصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے دلی کالج ہی میں سے سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں دلی کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا تعجب، برخوردار غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔“

بہر حال اس سلسلے میں دورائیں نہیں ہو سکتیں کہ دلی کالج نے صرف ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جن کی کوششوں اور کاوشوں سے ہمارے سرمایہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا بلکہ ساقی ساقی ایک ایسی فعال اور بیدار مغز جماعت بھی پیدا کی جس نے ہندوستان کی تعمیر نو میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس لیے اگر دلی کالج کو ”شخصیتوں کا جنم داتا“ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مولوی عبد الحق

شہ جوالہ داستان تاریخ اردو ص ۲۶۴

نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

”دلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ہیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے اور

جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور

اپنی زبان کو جگمگا دیا۔ علم کے وہ پجاری اُج ہماری زبان کے دیوتا ہیں“ لے

عبدالرحمن پرواز اعتراف کرتے ہیں کہ

”اس کالج سے وسیع النظری اور رواداری کی نضا قائم ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد و یکجہت

کے جذبات پروان چڑھے۔ تحقیق و ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا۔ علمی و ادبی بیداری

پیدا ہوئی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ

شخصیتیں پیدا ہوئیں“ لے

ماہرین تعلیمات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو اس کا

خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ دلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعہ تعلیم اردو

زبان تھی اور صرف عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کے لیے ہی اردو کا استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ سائنس،

ریاضی، جغرافیہ و تاریخ، قانون، طب اور منطق و فلسفہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی ایک

وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک اردو کسی علاقائی اور مذہبی و ملی تفریق کے بغیر ہندوستان کی مقبول عام

زبان بن چکی تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زبان میں تمام موضوعات کے لیے اظہار خیال کا ذریعہ

پننے کی صلاحیت موجود تھی۔ ناظم تعلیمات احاطہ بنگال مسٹر کرنے کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۵۳ء

میں اس کی ان امتیازاتی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

”ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اسے بالائی اور

زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعہ تعلیم دی جاتی

ہے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور سے ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ و اخلاق و فلسفہ

(مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقہ تعلیم پر مسٹر برٹروس نے اپنے زمانہ

لے بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۶

لے مفتی صدرالدین آزر دہ ص ۳۳

پرنسپل میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جڑ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھتے اور پھولنے پھلنے دیا جائے۔ چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں نے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا۔ لے

دلی کالج کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قابل قدر اضافے ہوئے۔ کالج کے قیام سے قبل اردو میں نہ صرف یہ کہ مغربی علوم و فنون سے متعلق کتابیں نایاب تھیں بلکہ مشرقی علوم پر بھی معقول کتابوں کا فقدان تھا۔ اردو نشر میں تالیف یا ترجمہ کی صورت میں جو کتابیں دستیاب تھیں وہ فورٹ ولیم کالج کی لکھی ہوئی تھیں اور اکثر و بیشتر قصوں اور کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ چونکہ دلی کالج کا دائرہ کار فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھا اس لیے یہاں جدید مضامین و موضوعات پر بہ کثرت کتابیں ترجمہ اور تالیف ہوئیں تاکہ مشرقی شعبے کے طلبہ کو مغربی علوم کے حصول میں دشواریاں پیش نہ آئیں۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف یہ کہ اردو سرمائے میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی مقبولیت بھی عام ہوئی۔ اور یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو کو وہ وسعت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ اسے یکساں طور پر مشرقی، مغربی، دونوں علوم و فنون کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دلی کالج کے زیر نگرانی "دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی" کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا تھا کہ اردو میں جدید نصابی مضامین سے متعلق کتابیں تیار کرائی جائیں۔ اس کی کوششوں سے ریاضیات، سائنس، تاریخ و جغرافیہ، قانون، طب، فلاحیت و زراعت، اخلاقیات وغیرہ پر سو سو سے زیادہ کتابیں ترجمہ یا تالیف ہوئیں۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں نئے نئے الفاظ اور مختلف النوع اصطلاحات کا اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ اس تحریک کی بدولت عثمانیہ یونیورسٹی جیسے عظیم ادارے کو معرض وجود میں لانے کی راہ ہموار ہوئی تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا

لے بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۲۷

جاسکتا ہے کہ دلی کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا پیش رو تھا، کیونکہ یہی کالج ہندوستان کی پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی اور جدید علم و فنون کی تعلیم اردو زبان میں دینے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اس زمانہ میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد) بعض انگریزوں نے اردو کی

لغات، صرف و نحو کی کتابیں اردو لسانیات اور اردو تاریخ پر بعض کتابیں لکھ کر

اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقہ اثر محدود اور ادارہ

کے مصنفوں کا مقصد مخصوص تھا اس لئے ان کے رجحانات نے اس وقت کسی

تحریک کی صورت اختیار نہیں کی البتہ ۱۸۵۷ء سے کوئی پچیس تیس سال پہلے خود

دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا۔ جہاں پہلی مرتبہ جدید علوم و فنون کی تعلیم

مشرقی زبان میں دینے کا تجربہ کیا گیا، اور اس کے لئے انگریزی

سے بعض درسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، (اس طرح) مختلف علوم و فنون کی کتابوں

کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل ہونے لگا تھا، جس کے ساتھ زبان

میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحات کا اضافہ ہو رہا تھا یہ

دلی کالج سے قبل ہندوستان میں عام طور پر تین قسم کی درسگاہیں پائی جاتی تھیں، اولاً وہ مکتب

اور مدرسے جو مسلمانوں کی طرف سے چلائے جاتے تھے اور جن میں عربی، فارسی اور اسلامیات

کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ درسگاہیں مسلمانوں کے مذہبی شعف اور عقائد کی نائندگی کرتی

تھیں، اور ان کے تمام کے پس پشت ثواب اور اجر آخرت کا جذبہ کار فرما رہا تھا، دوسری

قسم کی درسگاہیں وہ ہوتی تھیں جنہیں ہندو قائم کرتے تھے اور جو یوگیا مندر یا پاٹ

شالہ کہی جاتی تھیں مسلمانوں کے مکاتب و مدارس کی طرح یہ ادارے بھی دھارمک

شکث کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان میں سنسکرت اور دھرم شاستر کی

تعلیم کو اولیت دی جاتی تھی، تیسری قسم کی درسگاہوں کے تحت وہ اسکول آتے تھے

جن کا نظم و نسق انگریز مشربوں، پادروں اور چیلنوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو عیسائیت

و مسیحیت کی تعلیم و تبلیغ کی غرض سے کھولے جاتے تھے،

ان اسکولوں میں انگریزی زبان کی تدریس کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ان روایتی قسم کے تعلیمی اداروں کے برخلاف دلی کالج ایسا تعلیمی ادارہ تھا جس میں بہ یک وقت عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کے پہلو بہ پہلو دوسرے مشرقی و مغربی علوم کی تعلیم بھی کما حقہ طور پر دی جاتی تھی۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا۔ (اور جہاں) ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی وہ جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ بڑھایا جاتا تھا۔

دلی کالج کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس کا فیضان ہندو، مسلمان اور عیسائی تمام فرقوں کے طلبہ کے لیے عام تھا۔ یہاں سب ایک ساتھ بیٹھتے اور اس مادہ علم سے یکساں طور پر مستفید ہوتے تھے۔ ٹھیک یہی بات اساتذہ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان میں بھی ہندو، مسلمان، عیسائی، ملکی اور غیر ملکی بھی شامل تھے۔ کالج کے پرنسپل برطانوی (ٹیلر، کراگل، سٹن، ولونٹ اور کک) جرمن (اشپینگر) اور فرانسیسی (بوترو) قوم کے ہوئے۔ لیکن باقی اساتذہ میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی، جن میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دلی کالج ایک ایسی ”بین الملکی انجمن“ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ہندوستان، انگلینڈ، فرانس اور جرمن کے ہندو، مسلمان اور عیسائی علماء و فضلاہ جوڑ کر بیٹھتے، نژادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نئے نئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے اور علم کی ضیا پاشیوں سے طلبہ کے دل و دماغ کو منور کرتے تھے۔ باہمی ارتباط و اختلاط کے اس ماحول میں تربیت یافتہ طلبہ اور ان کے اساتذہ کے درمیان گاہ بگاہ مذہبی، ثقافتی، سائنسی اور سیاسی موضوعات و مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک دلی کالج قائم رہا مہذب علمی تبادلہ خیال اور ثقافتی لین دین کا مرکز بنا رہا۔ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ مختلف و متنوع خیالات و نظریات کے حامل ہوتے، کوئی مغربی تہذیب و ادب کا گرویدہ ہونا تو کوئی مشرقی تمدن اور علوم و السنہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنا تھا۔ ذوق کی اس بوقلمونی اور افکار و نظریات کی اس رنگارنگی نے ہندوستانی طلبہ و اساتذہ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے نتیجے میں

لہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۷۲

خیالات کی تبدیلی، فکر کی اصلاح اور معلومات میں اضافے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس سے نہ صرف یہ کہ افادی ادب کی بنیاد پڑی بلکہ نئے تہذیبی اور سائنسی دور کی ابتدا بھی ہوئی اور ہماری نسلوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس میں فکر و خیال کی اس نئی رو کے زیر اثر ہمارے ملک میں ایسے روشن ضمیر اور بالغ النظر افراد پیدا ہوئے جنہوں نے ہمارے سماج اور ادب کا رخ تعمیر و ترقی کی ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا اور جن کے احسانات ہماری علمی و تہذیبی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے۔

اپنی ان گونا گوں خدمات و خصوصیات کے باوصف دلی کالج ہمیں ایسا کوئی ادبی شاہکار ورثے میں نہ دے سکا جس کی لازوال قدر و قیمت خواص کی طرح عوام میں بھی اس کا نام اور شہرت و مقبولیت برقرار رکھتے میں مددگار ثابت ہوتی۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی طرح یہاں بھی خالص ادبی اور عام دلچسپی کے موضوعات اور مباحث پر متعدد کتابیں تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔ لیکن ان میں میرامن کی "باغ و بہار" خلیل علی خاں اشک کی "داستان امیر حمزہ" حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی اور" قصہ حاتم طائی" بہادر علی حسینی کی "اخلاق ہندی" اور نہال چند لاسوری کی "مذہب عشق" جیسا قبول عام کسی کتاب کو حاصل نہ ہو سکا۔ دلی کالج کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کی ان تصانیف کے چالیس پچاس سال بعد وجود میں آئی تھیں۔ اس اعتبار سے انھیں ادبی چاشنی اور لسانی لطافت و نفاست سے اور زیادہ مزین و مملو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں کے مصنفین و مترجمین نے اس پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی اس لیے ان کے کارنامے ادبیت کے اس اعلا و ارفع معیار تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کالج کا ماحول اور اس کے مطالبات و مقتضیات فورٹ ولیم کالج کے ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد سے یکسر مختلف تھے۔ یہاں تمام تر زور مغربی علوم و فنون کی توسیع و ترقی اور تشویق و ترویج پر صرف کیا گیا اور ادب کی طرف کسی نے خاص توجہ مبذول نہیں کی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بقول "انگریزی اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ زیادہ تر ادبی تھی لیکن دلی میں اس کی حیثیت سائنسی ہے"۔

دلی کالج کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت مقالہ نگاری اور صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور اردو کے طلبہ اور قارئین جدید علوم و فنون خصوصاً مغربی فلسفے اور سائنس سے روشناس ہوئے اس کالج نے مغربی و مشرقی علوم پر بے شمار مفید اور کارآمد کتابیں مرتب کرا کے جدید و قدیم کے خوش گوار امتزاج سے ایک ایسی شمع روشن کی جو آج بھی جادہ نوردان شوق کے لیے مشعل ماہ بنی ہوئی ہے۔ اور جس کی ضیا پاشیوں سے ہماری علمی تاریخ کا ایک باب رہتی دنیا تک منور و تابناک رہے گا۔

دلی سوسائٹی کی تالیفات اور تراجم (فہرست نمبر ۱)

دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، ذیل میں ان کی ایک جامع فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ تحقیق و تلاش سے اس میں مزید اضافے کیے جاسکتے ہیں۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
مذہبات و اخلاقیات				
۱۔ سنن ترمذی		مملوک العلی		حدیث کی شہد کتاب ترمذی شرف کار دو ترجمہ ہے۔
۲۔ رسالہ احکام الایمان				
۳۔ رسالہ در اثبات وجود باری	ریون شا			
۴۔ مختصر قدوری				
۵۔ ترجمہ Smith's Moral				
دستکمند				
۶۔ نچرل تھیالوجی	پالے			
۷۔ خلاصہ رامین و مہابھارت	فلیکس بوترو			زیر ترجمہ
ادبیات				

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۸۔ عجایب روزگار	رام چندر		دہلی اردو اخبار، ۱۸۴۷ء	
۹۔ حدائق البلاغت	امام بخش صہبائی		لیتھوگراف پریس دہلی، ۱۸۴۳ء	حدائق البلاغت (فارسی) کا ماخذ ہے۔
۱۰۔ طبقات شعرائے ہند	ایف فلین اور کریم الدین		مطبع العلوم، ۱۸۴۸ء	اس کی تالیف میں ڈی ڈی کے تاریخ سے کافی مدد لی گئی ہے۔ اس کا اردو نام "تاریخ عرب" ہے۔
۱۱۔ تذکرۃ فرائد الہدیہ	مولوی کریم الدین		مطبع العلوم، مدرسہ دہلی، ۱۸۴۷ء	
۱۲۔ الف لیلہ	جعفر علی محمد حسن علی خاں اور سعید الدین خاں		مطبع العلوم، مدرسہ دہلی، ۱۸۴۳ء	
۱۳۔ انتخاب دوادین	مولوی امام بخش صہبائی		دہلی اردو اخبار پریس، ۱۸۴۴ء	
۱۴۔ قواعد اردو	"		مطبع العلوم، مدرسہ دہلی، ۱۸۴۹ء	
۱۵۔ رسالہ متفنی الجمالۃ	مولوی کریم الدین		مطبع رفاہ عام، دہلی، ۱۸۴۵ء	
۱۶۔ العلامہ علم عروض کا سفر یوسف خاں کتل پوش کا انگلستان میں			مطبع العلوم، مدرسہ دہلی، ۱۸۴۷ء	اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۸۴۳ء میں مطبع نول کشور سے بھی شائع ہوا تھا۔
۱۷۔ ترجمہ گلستان سعدی	شیخ سعدی	مولوی حسن علی خاں		
۱۸۔ کریم اللغات (فارسی)	مولوی کریم الدین			یہ بعد میں کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے
۱۹۔ راجین				
۲۰۔ مہا بھارت				انتخاب مہا بھارت
۲۱۔ محاورات اردو	سبحان بخش			
۲۲۔ سنسکرت اور انگریزی درامے				

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۲۳۔ چشمہ ریاض	مولوی احمد علی			مختصر قواعد اردو
۲۴۔ صرف و نحو انگریزی	پنڈت رام کشن			اشپرنگر کی مدد شامل بھتی
۲۵۔ تذکرہ ہندو شعرا	موتی لال کاجو بسمل			
۲۶۔ ہدایت المبتدی				
۲۷۔ قصہ یوسف سلیمانی				
ریاضیات:				
۲۸۔ اصول علم مثلث و تراش اے مخروطی و علم ہند بالجبر	Boucharlet and Samson	ماسٹر رام چندر	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۳۶ء	انگریزی کتاب کا ترجمہ
۲۹۔ اصول علم حساب	De Mangam	ہردیوسنگھ بھود شرف علی اور پنڈت ابو دھیا پشاد	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۳۷ء	انگریزی کتاب دہلی Arithmetic کا ترجمہ
۳۰۔ رسالہ درپائش خطوط و سطح مستوی و مجسم و جسامت ثلثی مجسمات	ایلیٹ گنٹلی	بہاری لال	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۵۰ء	انگریزی کتاب کا ترجمہ
۳۱۔ اصول علم حساب، جزئیات و کلیات	J.L. Bauchard	رام چندر	مطبع رفاه عام دہلی ۱۸۴۵ء	اس کتاب کے ترجمے میں رام چندر نے اضافہ بھی کیا ہے
۳۲۔ ہندسہ بالجبر	wand	رام چندر و رادھا کشن	مطبع دہلی اردو اخبار ۱۸۵۳ء	
۳۳۔ رسالہ پائش زمین کا	Theodalis	ہردیوسنگھ	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۵۸ء	قادر علی نے اظہار ثانی کی تھی
۳۴۔ اصول جبر مقابہ		رام چندر	دہلی اردو اخبار پریس دہلی ۱۸۵۵ء	
۳۵۔ شرح الفہم		رام چندر	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۹ء	
۳۶۔ تحریر اقلیدس (لارہ ل) مقالہ		ملوک العلی	مطبع العلوم مدرہ دہلی	ترجمہ از عربی

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۳۷۔ فوائد الافکار فی اعمال العباد	دبیر الدولہ فرید الدین	سید احمد خاں بہادر	۱۸۲۶ء چھاپہ خانہ سید الاخبار دہلی	
۳۸۔ الجبر (ترجمہ برجز)	برجز	رام چندر		
۳۹۔ استعمال آلات ریاضی				
۴۰۔ میکانیات	لارڈ ٹرنر			
۴۱۔ Dynamics کا ترجمہ				
۴۲۔ حرکیات و سکونیات	ینگ			
۴۳۔ لیلو و تی (حساب)	بھاسکر			
تاریخ :				
۴۴۔ تاریخ کشمیر	محمد اعظم	منشی اشرف علی	۱۸۲۶ء مطبع العلوم، مدرہ دہلی	
۴۵۔ تاریخ بنگال، ابتدائے	مارش مین	منشی نور محمد	" ۱۹۲۶ء	
۴۶۔ عملداری کمپنی بہادر سے ۱۸۴۰ء تک	Marshman	منشی نور محمد		
۴۷۔ پنجاب کے سکھ عہد کی تاریخ اور سوانح مہاراجہ رنجیت سنگھ	ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ	شنکر داس	۱۸۲۶ء دہلی اردو اخبار پریس، دہلی۔	رام چندر نے اس کی تصحیح کی تھی۔
۴۸۔ توڑک تیموری		مولوی سجان بخش	" ۱۸۳۵ء	فارسی کتاب کا ترجمہ
۴۸۔ مارش مین صاحب کی خلاصہ	مارش مین	سرورپ زاین اور شیو زاین	" ۱۸۲۲ء	
۴۹۔ تواریخ حصہ اول: ابتدائے آفرینش سے تولد ہونے عیسیٰ تک				
۴۹۔ مارش مین کی خلاصہ التوار				
۵۰۔ حصہ دوم تولد عیسیٰ سے شاہ شارمین تک		سرورپ زاین و شیو زاین	" ۱۸۲۲ء	شیوارڈ (Steward) نے اصلاح دی تھی
۵۰۔ تواریخ یونان	گولڈ اسمتھ	منشی وزیر علی	۱۸۲۶ء مطبع العلوم مدرہ دہلی	۱۵۲ صفحے کے بعد کا ترجمہ شیو پرشاد نے کیا تھا۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۵۱۔ تواریخ بیری اوزکری	لارڈز	شیو پرشاد	دہلی اردو اخبار پریس ۱۹۳۵ء	سیوٹیڈ سے اس پر اصلاحات دی گئی
۵۲۔ تواریخ روم	گولڈ اسمتھ	شیو پرشاد	۱۹۳۵ء	اس پر بھی سیوٹیڈ ڈک اصلاح کی گئی
۵۳۔ تاریخ ایران	گولڈ اسمتھ	منشی حسینی	۱۹۳۵ء	
۵۴۔ تذکرہ کنبرا اعظم		پنڈت مرپ زاین	مطبع العلوم، دہلی، ۱۹۳۴ء	انگریزی سے ترجمہ
۵۵۔ تذکرہ سسر		موتی لال کاجو	۱۹۳۴ء	
۵۶۔ تاریخ مغلیہ		منشی حسینی و نور محمد	۱۹۳۴ء	
۵۷۔ ترجمہ تاریخ حکما اور تذکرہ المفسرین اور تذکرہ الفقہاء خلاصہ	علامہ عبدالرحمن جلال الدین سیوطی	مولوی سبحان بخش	۱۹۳۸ء	عربی سے ترجمہ
دقیات الاعیان ابن خلکان کا (عربی سے)				
۵۸۔ تاریخ ابوالفداء		کریم الدین و محمد امیر	۱۹۳۷ء	عربی سے ترجمہ
۵۹۔ تذکرہ ڈیمو سٹھینز		شیو زاین	مطبع العلوم، دہلی، ۱۹۳۸ء	انگریزی سے ترجمہ
۶۰۔ تذکرہ الکاملین	ما سٹر رام چندر		۱۹۳۶ء	
۶۱۔ تاریخ ہند				زما قدیم سے زمانہ حال تک
۶۲۔ تاریخ الگلستان	گولڈ اسمتھ	مخدوم حسین صاحبان دہلی کالج		خلاصے کا ترجمہ
۶۳۔ تاریخ اسلام				
۶۴۔ انتخاب پومارکس لالوز (مشابہ یونان و روما)				
۶۵۔ تاریخ چارلس دوم				ذریعہ ترجمہ

۱۔ سیوطی محض تاریخ حکما اور تذکرہ المفسرین ہی کے مولف ہیں۔

۲۔ چھ جلدوں میں سے پانچ کا ترجمہ کریم الدین نے کیا۔ صرف تیسری جلد کا ترجمہ محمد امیر نے کیا تھا۔ المباحثہ شرعیہ نے پہلے چھ جلدوں میں ۷۸

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۶۷۔ حکماء یونان				
۶۷۔ تاریخ مسعودی				
۶۸۔ تاریخ بمبئی	اشپرنگر			
<u>جغرافیہ :</u>				
۶۹۔ جغرافیہ ہند	Murray	سر پ زاین اور شیو زاین	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۳۸ء	Encyclopaedia of Geography کا ترجمہ
۷۰۔ جغرافیہ بزبان اردو			۱۸۵۳ء	
۷۱۔ اٹلس (جغرافیہ)				
۷۲۔ جغرافیہ قدیم کے نقشے				
۷۳۔ جغرافیہ طبعی	ٹریل			
<u>سائنس اور علوم :</u>				
۷۴۔ تشریح اور تمہیم علم طبیعی کی	Arnall	سر پ زاین اور شیو زاین	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۵ء	انگریزی کا ترجمہ
۷۵۔ رسالہ علم طبیعی		اجودھی پشاد اور شیو پشاد	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۳۸ء	"
۷۶۔ رسالہ علم ہیئت	Herschel	اجودھی پشاد اور رام چندر	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۳۸ء	انگریزی کتاب "Astronomy" کا ترجمہ۔ ۱
۷۷۔ رسالہ مقناطیس		سید کمال الدین حیدر	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۵۰ء	انگریزی کا ترجمہ
۷۸۔ اصول قولہ دمایات	تھامس ویبستر (Thomas Webster)	اجودھی پشاد	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۵۰ء	"
۷۹۔ رسالہ علم ادات	ینگ Young	پنڈت رادھاشن	مطبع العلوم مدرہ دہلی ۱۸۵۲ء	"

۱۰ آخری بار سوال باب اور ضمیمہ "Encyclopaedia Britannica" کے ماخوذ ہے۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۸۰۔ رسالہ کیمسٹری	پارکر			زیر ترجمہ
۸۱۔ علم معدنیات				
۸۲۔ علم مناظر	فیلپ Philip	موتی لال کابجو ^ط		لاٹیری آف یوزفل نالج کے رسالے کا ترجمہ
۸۳۔ حرارت				
۸۴۔ ترجمہ (Hydraulics)				
۸۵۔ ترجمہ (Double Refractions & Polarisation of Light)				
۸۶۔ رسالہ علم برق	زاجب ^ط			
۸۷۔ گالون ازم	"			
۸۸۔ رسالہ مرایا و مناظر	برشل	نیدت موتی لال کابجو ^ط		
قانون :				
۸۹۔ قوانین دیوانی	پرنسپ	منشی حسینی	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۳ء	۱۸۲۸ء تک پرنسپ کی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۸۲۹ء سے ۱۸۴۲ء تک گشتی اور توضیحات سے
۹۰۔ اصول دھرم شاستر	ڈبلیو۔ ایچ۔ بکنان ^ط	رام کشن	۱۸۴۱ء	
۹۱۔ کلیات قوانین دیوانی		مقعد مولوی صاحب	۱۸۴۳ء	
۹۲۔ اصول قواعد اخلاق اور قوانین	Bentham & Dumont.	نیدت رام کشن	مطبع رفاہ عام، دہلی ۱۸۴۳ء	انگریزی سے ترجمہ

۱۔ بنگال اور اضلاع شمال و مغربی کے تمام قوانین اور مددش میں کے سرکلر کا خلاصہ بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں دھرم شاستر اور شرح شریف ہندی بھی شامل ہے۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۹۳- اصول پولیسی کل اکونومی	John Stewart Mill	منشی وزیر علی	مطبع رفاہ عام، دہلی ۱۸۴۲ء	انگریزی سے ترجمہ
۹۴- اصول قوانین ممالک مختلفہ	F. Boutros	پنڈت رام کشن	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۳ء	"
بعض مثالوں کے تواریخ سے	"	"	۱۸۴۴ء	"
۹۵- اصول سرکاری محال کے	"	"	"	"
ایک خلاصہ قوانین سرکاری محال	"	"	"	"
۹۶- اصول علم انتظام مدن	Francis Wayland	دھرم ناراین	۱۸۴۶ء	"
۹۷- ترجمہ نسخہ رہنمائی قانون مال	"	متعدد مولوی صاحبان	۱۸۴۶ء	فارسی سے ترجمہ
۹۸- اصول گورنمنٹ کے	Norton	رام چندر اور پتھر	۱۸۴۸ء	سید محمد نے اصلاح کی تھی
۹۹- سراجیہ (اسلامی قانون وراثت)	مکناس	سید محمد اور حسینی	"	"
۱۰۰- قانون محمدی فوجداری	"	ماسٹر حسینی	"	"
۱۰۱- قانون مال	مارش مین	حسن علی خاں	"	"
۱۰۲- خلاصہ قانون فوجداری	اسکیپ وکھ	ماسٹر حسینی	"	"
۱۰۳- اسسٹنٹ مجسٹریٹ گائیڈ	"	"	"	"
طب :				
۱۰۴- رسالہ پنج بیان اعمال جراحی کے	Cooper	جوزف ہنری ٹیلر	مطبع العلوم، مدر دہلی ۱۸۴۸ء	انگریزی کا ترجمہ
۱۰۵- رسالہ علم طب میں	پنڈت رام کشن	"	۱۸۴۷ء	"
۱۰۶- علم و عمل طب	"	"	"	زیر ترجمہ (عربی سے)
۱۰۷- حفظان صحت	"	"	"	ترجمہ عربی سے
۱۰۸- عضویات	"	"	"	زیر ترجمہ

۱- باب ۹ (دفعہ ۲) تک کا ترجمہ بھان بخش نے کیا، باب ۹ (۲) اور باب دس کا مولوی امام بخش صہبائی نے، باب ۱۱ تا ۱۴ تک کا مولوی

احمد علی نے، باب ۱۵ تا ۲۲ تک کا میر سید محمد خوش نویس نے اور مولوی حسن علی خاں نے باب ۲۳ سے آخری باب ۳۰ تک کا۔

(فہرست نمبر ۲)

دلی ٹرانس لیش سوسائٹی نے تالیف و ترجمہ کے علاوہ جو دہری ضروریات کے تحت بطور خاص تیار کرائی گئی تھیں، متعدد ایسی کتابیں بھی شائع کیں جو علم و ادب کے اعلامیہ کی نمائندہ ہیں اور نصاب کے نقطہ نظر سے مفید و کارآمد تصانیف کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

کتاب	مصنف	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۱۔ فسانہ لیلیٰ مجنوں کا	محمد حسین تحلی عرفیہا جی	مطبع زمانہ عام، دہلی ۱۸۳۲ء	منظوم مشہور مشنوی ہے
۲۔ شمشیر خانی یعنی خلاصہ شاہنامہ	منشی مول چند	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۳۲ء	منظوم ترجمہ شرح امام بخش کی تصحیح کے بعد شائع
۳۔ دیوان خواجہ میر درد دہلوی	میر درد		
۴۔ نل دمن	فیضی		
۵۔ دیوان سودا	مزار فیع محمد سودا		
۶۔ دیوان میر تقی میر	میر تقی میر		
۷۔ دیوان جبرأت	جبرأت		
۸۔ زلیخا (یوسف زلیخا)	جامی، عبدالرحمن		یہ فارسی کی مشہور مشنوی ہے
۹۔ بدر منیر (سحر البیان)	میر حسن		
۱۰۔ شکستلا	کالی داس		
۱۱۔ رگھو دس	”		ڈراما
۱۲۔ جامع الحکایات	سید الدین محمد عوفی		
۱۳۔ تاج الملوک و بکاوی (گلزار نسیم)	دیا شنکر نسیم		
۱۴۔ قصہ چہار درویش معروف بہ باغ و بہار	میر امن دہلوی		
۱۵۔ کلیلہ و دمنہ			

دلی کالج کے مصنفین

(الف) نامور اساتذہ اور ان کے کارنامے

ڈاکٹر الائنز اشپرنگر بہ

اشپرنگر دلی کالج کے تیسرے پرنسپل تھے جن کا تعلق جرمن قوم سے تھا۔ ٹیبلر ۱۲ برس تک اور بوتروچار سال کالج کے پرنسپل رہے لیکن اشپرنگر لگ بھگ تین سال تک ہی اس عہدے پر فائز رہے۔ اس قلیل مدت میں بھی انھوں نے مشرقی علوم اور مشرقی شعبے کی جو خدمات انجام دیں وہ ان کے پیش روؤں سے کہیں زیادہ گراں قدر ہیں۔ وہ بڑے ذہین ذکی، اعلا صلاحیت کے مالک اور علوم مشرقیہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ مشرقی اور اسلامی علوم سے اس قدر اہٹاک اور انسلاک سے ان کی ماقبل زندگی کا عمیق تعلق ہے۔

اشپرنگر کی ولادت ۲ ستمبر ۱۸۱۳ء کو ٹائروول (نیدر ہولینڈ) کے قصبہ ناسروت (Nassereut) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام کرسٹوفر اشپرنگر تھا۔ اشپرنگر کی تعلیم کی ابتدا ہی آنا اسٹریٹ سے ہوئی۔ ابھی سن تیز کو پہنچے ہی تھے کہ انھیں مشرقی اور اسلامی علوم والسنہ سے خاص شغف پیدا ہو گیا۔ یہ شغف اس حد تک بڑھا کہ وہ کسی مشرقی ملک میں پہنچ کر مشرقی علوم والسنہ کی تحصیل کا منصوبہ بنانے لگے تاکہ مشرق و مغرب کے مابین معاشرت و منافرت کا ہو کشیف پردہ حائل ہے اگر اتہٹایا جاسکے تو کم از کم اس قدر شفاف اور لطیف کر دیا جائے کہ مشرقی و مغربی کے اقوام ایک دوسرے کو دیکھ بھال اور سمجھ بوجھ سکیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مشرقی ممالک میں سفر کیا اور تدریس دہی، جس کے لیے انھیں کافی پارٹیلینا پڑے۔ سب سے پہلے انھیں برطانیہ کی شہریت حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوئی تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے ہندوستان پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس خواب

۱ E.C. Buckland, Dictionary of National Biography, P. 398

کو بروئے عمل لانے کے لئے اشپرنگر ۱۸۲۶ء میں ۲۳ برس کی عمر میں انگلینڈ پہنچے، اور لائڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) سے طب میں فراغت حاصل کی۔ ۱۸۳۱ء میں لندن یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف میڈسن (M.D.) کی ڈگری تفویض کی۔ دورانِ تعلیم اشپرنگر کو برطانوی شہریت بھی حاصل ہو چکی تھی، چنانچہ آگے کے مراحل آسان ہو گئے۔

۱۸۲۳ء کے اوائل میں اشپرنگر ایٹ انڈیا کمپنی کی میڈیکل سروس میں داخل ہوئے اور اسی سال "اسسٹنٹ سرجن آف بنگال" کی حیثیت سے کلکتہ پہنچے۔ جب مسٹر بوترون نے اپنا مشروط استعفا دیا تو ۱۸۲۵ء میں وہ دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مسٹر بوترون نے مشرقی شعبے اور طلبہ کی جانب خاص توجہ مبذول کی تھی۔ اس کی ترقی کے لیے ۱۸۲۳ء میں دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی قائم کر کے کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس شعبے کی ترقی اور اس کے طلبہ کی فلاح و بہبود کے لیے جس جوش اور لگن سے کام شروع ہوا تھا ایسا لگتا تھا کہ بوترون کی ہندوستان سے واپسی کے بعد وہ جوش و خروش ماند پڑ جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر اشپرنگر بوترون پر بھی سبقت لے گئے۔ انھوں نے آتے ہی مشرقی شعبے کی طرف خاص توجہ کی اور اس کے نصاب میں کچھ اہم تبدیلیاں کر کے اسے زمانے کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ طلبہ کو ان کے مضامین سے رغبت پیدا کرنے کے لیے کچھ مفید اور اہم کتابیں داخل نصاب کیں بعض کتابیں ہندوستان میں کمیاب بلکہ نایاب تھیں اور یورپ میں شائع ہو چکی تھیں وہ وہاں سے منگالی گئیں۔ مہتممی اور حمار کے نسخے بہم پہنچائے اور خود بھی نصاب کے لیے تاریخ۔ نیمینی مرتب کی اور اسے چھپوایا۔ علاوہ بریں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے جن کتابوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ انھیں ترجمہ کراتے اور چھپواتے۔ چونکہ وہ دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی کے سکریٹری بھی تھے اس لیے اس کام میں دیر نہ لگتی تھی۔ قیام دلی ڈاکٹر اشپرنگر کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس عہد میں دلی مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کامرکز تھی۔ اور وہ جس عہدے پر فائز تھے اس کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ دلی کے شرفاء و امراء و علماء و فضلا سے تعلق استوار کرنے میں انھیں بڑی آسانی ہوئی جسکی وجہ سے اشپرنگر کو اپنے مقاصد کے حصول میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ دلی کے علماء و فضلا کی صحبت نے مشرقی علوم و فنون کے حصول میں ان کے لیے

لے جارج اسمتھ نے اشپرنگر کے پرنسپل بننے کا سنہ ۱۸۲۸ء لکھا ہے، جو درست نہیں ہے (کان سائزڈ کٹری آف نیشنل بایوگرافی ص ۱۲۹)

سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دلی آئے ابھی تین برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۴ دسمبر ۱۸۴۸ء کو گورنمنٹ نے انھیں عارضی طور پر لکھنؤ کے ریزی ڈنٹ کا ایڈیشنل اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ اس عارضی تقرری کا یہ مقصد تھا کہ وہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی ایک جامع فہرست مرتب کریں۔ اشپرنگر کے لکھنؤ میں ورود و قیام اور اس زمانے کی مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں۔

”۳ مارچ سنہ ۱۸۴۸ء کو اشپرنگر لکھنؤ میں وارد ہوئے اور یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء تک

وہ مقیم رہے۔ بائیس ماہ کے اس قیام میں ایک مہینا بعض دوسرے فرائض کی انجام

دہی میں صرف ہوا۔ تین مہینے بیماری کی بیکاری میں گزرے باقی ڈیڑھ برس کا زمانہ

فہرست مرتب کرنے میں لگا۔ اس زمانے میں کوئی دس ہزار کتابیں ڈاکٹر اشپرنگر

کی نظر سے گزریں، جن میں بہت سی کتابیں ناقص تھیں، جن کے نام، مصنف اور

تاریخ تصنیف کا پتا بہت تلاش سے بھی نہ لگا، اور آخر ان کو قلم انداز کر دینا پڑا۔ لہ

اشپرنگر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہر تیسرے مہینے اپنے کام کی رپورٹ بھیجتے رہیں۔ ان کی

پہلی رپورٹ کے مطابق لکھنؤ کے شاہی کتب خانے تین مقامات پر تھے۔ پہلا موتی محل کے بیرونی

دفار میں، دوسرا توپ خانے میں اور تیسرا فرخ بخش محل میں۔

موتی محل کے کتب خانے میں تین ہزار سے زائد کتابیں تھیں، جن میں عربی، فارسی، پشتو اور دو اور چغتائی

دوڑکی کے مخطوطے شامل تھے۔ ان میں ایک ہزار سے زیادہ مخطوطوں کے دوسرے اور تیسرے نسخے بھی موجود تھے۔ ان کی زبان واد

تعداد حسب ذیل تھی

”عربی۔ ۵۷۳، فارسی۔ ۱۱۳۸۵، اردو۔ ۶۰، چغتائی و ترکی۔ ۲۱، پشتو۔ ۳، موتی تعداد ۲۰۴۲۔“

لہ تقریظ یادگار شعرا ص ۳

۱۷ یہ توپ خانہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی، جس میں توپیں، بارود اور جنگ سے متعلق چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ اس کے تین

حصوں میں فوجوں کے لیے اسٹور تھا اور شمال کی جانب اوپری منزل میں کتب خانہ تھا۔

۱۸ یہ غازی الدین حیدر کی قیام گاہ تھی۔ غازی الدین حیدر نواب سعادت علی خاں بن نواب شجاع الدولہ کے بیٹے تھے۔

ان کی یادگاریں لکھنؤ میں اب بھی موجود ہیں، جن میں قدیم رسول اور شاہ نجف شامل ہیں۔ شاہ نجف نے تین کتب خانے بنوائے۔

اس کا نام شاہ نجف اس لیے پڑا کہ یہ روضہ حضرت علی کے روضہ اقدس کے مشابہ ہے۔

۱۹ محمد عتیق صدیقی، اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء ص ۲۰

توپ خانے والے کتب خانے میں کارآمد اور بیش بہا کتابیں بار برداری کے چالیس بڑے نیم شکر شترناصند و قوں (Camel Trunks) میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو چوپوں نے کاٹ کھٹایا تھا۔ توپ خانے کے آخری حصے میں مفید کتابیں کئی یورپوں میں بند تھیں، جن میں "تاج اللغات" اور "ہفت قلم" کی تمام جلدیں دیکھوں کی افزائش نسل کی وجہ سے چھلنی بن گئی تھیں۔ سب سے زیادہ کتابیں اسی کتب خانے میں موجود تھیں۔ لیکن نسبتاً وہ زیادہ بوسیدہ اور کرم خوردہ بھی تھیں۔ اشپرنگر نے ان کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہاں ایسی کتابیں ملیں جو دنیا میں کسی اور جگہ نہیں مل سکتی تھیں" اس نے اپنی فہرست کیلئے اس کتب خانے سے ۱۱۲۳ کتابیں منتخب کی تھیں، جو ۲۲ مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں اردو کے ۶۲ اور ہندی کے ۱۵ مخطوطات بھی شامل تھے۔ یہ

فرخ بخش محل میں واقع کتب خانے میں تقریباً ایک ہزار عمدہ اور نایاب مخطوطے موجود تھے۔ یہ مخطوطات بڑے سلیقے سے الماریوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں یہ ذخیرے بلوائیوں کی نذر ہو گئے۔ اشپرنگر نے بڑی جاں فشانی، دیدہ ریزی اور سعی پیہم سے عربی، فارسی اور ہندوستانی مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی، جو "اودھ کٹیلاگ" (Audh Catalogue) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسکی ترتیب میں علی اکبر پانی پتی نے ڈاکٹر اشپرنگر کی بڑی مدد کی تھی۔ علی اکبر دلی کالج کے طالب علم تھے۔ اشپرنگر انھیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی جاں کاہی اور جفا شعاری سے متاثر ہو کر اشپرنگر نے لفٹنٹ گورنر سے سفارش کر کے انھیں آگرہ کالج میں عربی کا پہلا پروفیسر مقرر کر دیا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں عنفوان شباب میں وہ موت کی نذر ہو گئے۔

جنوری ۱۸۵۰ء میں "اودھ کٹیلاگ" کی ترتیب سے فارغ ہو کر اشپرنگر نے اپنی اصل خدمت پدمراجت کی۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۰ء کو وہ برنبائے علالت چھٹی لے کر شملہ چلے گئے اور اس کے ایک ہی ماہ بعد یعنی مئی ۱۸۵۰ء میں انھیں حکومت کی طرف سے فارسی کا ترجمان اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا معتمد مقرر کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ سات سال رہے۔ اس دوران انھوں نے مدرسہ عالیہ اور

۱۔ محمد عتیق صدیقی، اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء ص ۲۱

۲۔ اس کا پورا نام "A Catalogue of Arabic, Persian and Hindustani Manuscript of the Libraries of the King of Audh" تھا۔

ہنگلی کے مدرسے میں پرنسپل کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے علاوہ وہ فورٹ ولیم کالج کے ممتحن بھی مقرر ہوئے تھے۔ کالج کے خاتمے کے بعد جنوری ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی کے ایام سے جب بورڈ آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے رکن منتخب ہوئے۔

دلی کے قیام کے دوران اشپہ نگر نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے کتابیں لکھیں بلکہ ان کی ترغیب سے بہت سی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ انھوں نے ایک رسالہ "فوائد الناظرین" ماہر ٹرام چندر کی ادارت میں جاری کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر سید احمد خاں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید" اشپہ نگر ہی کی تحریک سے متاثر ہو کر تصنیف کی تھی۔ اشپہ نگر نے "قرآن السعدین" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری تھا جس میں مغربی ممالک کی خبریں، سائنس کے موضوعات پر کالج والوں کے مضامین، دوسرے اخبارات کے اقتباسات اور انگریزی کتابوں کے تراجم شائع کیے جاتے تھے۔ دوران قیام کلکتہ جب وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے تو وہاں بھی انھوں نے علامہ فضلہ کی مدد سے عربی و فارسی کی متعدد کتابوں کی اشاعت کا انتظام و اہتمام کیا۔ دوران قیام ہندوستان اشپہ نگر نے دو سال کی چھٹی لے کر عراق، شام اور دیگر اسلامی ممالک کا سفر بھی کیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں اشپہ نگر نے ہندوستان کو خیر باد کہا۔ لیکن مشرقی علوم والہ کی خدمات کا جذبہ اب بھی کم نہ ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ پہنچنے کے بعد برلن یونیورسٹی اور اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) میں مشرقی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جرمنی کے قیام کے دوران انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور تعلیمات کے عنوان سے جرمنی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی۔ جو ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان برلن سے شائع ہوئی۔ اس کی تصنیف کا مقصد ان غلط فہمیوں کا ازالہ تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف اقوام مغرب کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی تھیں۔ جرمنی میں اسی برس کی عمر میں ۱۸۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

لے فارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۶۱

Concise Dictionary of National Biography by G. Smith P. 122
 "Lehen and Lehred Mohammad" لے جرمن زبان میں کتاب کا نام ہے

ڈاکٹر اشپیرنگر کو مشرقی علوم سے جو شغف تھا اس میں مکروہ اور یا اور ظاہر داری و زمانہ سازی کا سرمد دخل نہ تھا۔ جدید انکشافات سے یہ امر باریہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ انھیں علوم شرقیہ سے جو دلچسپی تھی وہ خلوص پر مبنی تھی۔ جو کتابیں انھوں نے ہندوستان میں جمع کی تھیں انھیں یہاں سے واپس لے کر اپنے ساتھ لے گئے اور اس غرض سے کہ یورپین ان کے مطالعہ سے مستفید ہو سکیں اس پیش بہا علمی ذخیرے کو برلن کے سرکاری کتب خانے کے سپرد کر دیا۔

ڈاکٹر اشپیرنگر ہر شعبہ ادب سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن اردو سے انھیں خاص شغف تھا۔ اردو کی پر لکھ اور عربی فارسی سے جو جمل عبارت آرائی اور لفظی ترجمے کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اسے نقصان دہ سمجھتے تھے اور اس کے مقابلے میں آسان، صاف اور رواں عبارت کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ دلی کالج کی ۱۸۴۵ء کی رپورٹ میں انھوں نے دقیق اور مولویانہ طرز تحریر کے نقایص اور صاف تھری عبارت کے فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”مولوی صاحب جو اپنے شاگردوں سے فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کراتے ہیں وہ اس قدر لفظی ہوتا ہے کہ میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ اگرچہ طالب علم استاد کی منشا کے مطابق ترجمہ کر لیتا ہے لیکن اصل مفہوم سے نا آشنا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ہوتی ہے۔ ان کے خیالات ملایانہ طرز تعلیم کی وجہ سے نہایت محدود ہوتے ہیں۔ میری رائے میں مشرقی شعبے کے تمام نقایص میں سے سب سے پہلے اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد دوسرے ہی امتحان ترقی نظر آئے گی۔“

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اشپیرنگر کی قیادت ہر اعتبار سے دلی کالج کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوئی۔ ان کی وجہ سے دلی کالج کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ انھوں نے یہاں صرف تین برس گزارے تاہم اس مختصر مدت میں بھی کالج کی شہرت کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ان کی انھی ناقابل فراموش خدمات کی بنا پر مشرقی علوم والسنڈ کے یورپی عالموں میں ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۱۔ بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۲۲ - ۲۱

تصنیفات :

(۱) اودھ کٹیلاگ۔ یہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی ایک جامع فہرست ہے، جسے ۱۸۵۲ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ یہ ۶۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۳۲ مخطوطات کا ذکر ہے۔ اودھ کٹیلاگ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کے تحت فارسی اور اردو شعرا کے تذکروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ باب دوم میں فارسی شعرا کی بعض تصانیف کا ذکر ہے۔ تیسرا باب ہندوستانی شعرا کی پیش بہا اور نادر کتابوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور شاید ہی حصہ سب سے مفید اور اہم بھی ہے۔ اس میں ایسی بہت سی نادر اور نایاب کتابوں کا ذکر ہے، جو اب عنقا ہیں اور جن کے بارے میں ہماری تمام تر معلومات کا یہی واحد ماخذ باقی رہ گیا ہے۔

اودھ کٹیلاگ کے پہلے باب کا وہ حصہ جس میں شعر لے اردو اور ہندی کے مختصر حالات لغیر نمونہ کلام درج ہیں اور جو صفحہ ۱۹۳ سے ۳۰۶ تک یعنی ایک سو چودہ صفحات کو محیط ہے، طفیل احمد نے ۱۹۳۲ء میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ”یادگار شعراء کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی جانب سے پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اسے ۱۹۸۵ء میں دوبارہ شائع کر دیا ہے۔ ” یادگار شعرا“ میں ۱۵۱۲ شعراء اردو کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کی ابتدا شیخ نجم الدین علی خاں معروضہ بک آبرو کے ذکر سے اور خاتمہ حکیم یونس کے حالات پر ہوا ہے۔ اس میں طفیل احمد کا مختصر زیبا چہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے۔

”اودھ کٹیلاگ“ اغلاط سے مبرا نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے اس کی افادیت و اہمیت میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی فہرست ہے جس سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے بہت سے ایسے گوشے جو ابھی تک قہ گنما میں ہیں، سامنے آجاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مکمل کٹیلاگ کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ ترجمہ ہمارے ادبی سرمائے میں یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

۱۔ فہرست کا آغاز باب الاباب سے اور اختتام ”شتر عشق“ مسند حسین علی خاں پر ہوتا ہے۔

۲۔ محمد رضا انصاری (چیرمین اردو اکادمی لکھنؤ) کا یہ بیان صحیح نہیں کہ ”یادگار شعرا“ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ (پیش لفظ یادگار شعرا ص ۲)

در اصل اشپینگر "اودھ کٹیلگ" کو پانچ جلدوں میں مرتب کرنا چاہتے تھے۔ پہلی جلد کے منظر عام پر آنے کے بعد اشپینگر اور گورنر جنرل کے دفتر سے جو مراسلت ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد بھی مرتب ہو کر پریس جانے کے لئے تیار تھی، گورنر جنرل اس کی طباعت کے اخراجات بھی منظور کر چکے تھے۔ لیکن دریں اثنا کسی خاص سبب سے اشپینگر کو یورپ واپس جانا پڑا۔ یورپ مراجعت سے قبل ستمبر ۱۸۵۶ء میں انھوں نے گورنر جنرل سے دوسری اور بقیہ تین جلدوں کو لندن سے شائع کرنے کی اجازت مانگی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت نہ مل سکی اشپینگر کے اس بقیہ سرمائے کا جو انھوں نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا، اب کہیں پتا نہیں چلتا۔

۲- انگریزی ہندوستانی قواعد۔ اس کتاب میں جو خاص طور سے انگریزوں کے لئے لکھی گئی تھی اردو قواعد کو انگریزی قواعد کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

۳- عربی ادب کا انتخاب۔ عربی کے منتخب شہ پاروں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب طلبہ کی نصابی ضروریات کے تحت مرتب کی گئی تھی۔

۴- اصطلاحات صوفیہ۔ یہ تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

۵- محمود غزنوی۔ یہ کتاب محمود غزنوی اور اس کے عہد حکومت کی ایک مختصر تاریخ ہے

۶- تاریخ یمنی۔ خاص طور پر مشرقی شعبے کے طلبہ کے لئے لکھی گئی تھی۔

۷- (محمد حیات و تعلیمات) تین جلدیں *Lehban and Lehered Mohammad*

اپنے وطن مراجعت کے بعد اشپینگر نے پیغمبر اسلام کی حیات اور تعلیمات سے متعلق جرمنی زبان میں یہ کتاب تصنیف کی، جو ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیانی زمانے میں برلن سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں حضور اکرم اور ان کے اخلاق و کردار کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ

ہے کہ اس میں بعض ایسے عقائد و اوہام سے نقاب کشائی کی گئی ہے جو یورپ کے لوگوں میں رائج تھے

اور جنکی بنا پر وہ اسلام اور حضور اکرم سے بدظن تھے۔ مالک رام اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہیں

کہ "ان غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی ہے جو مغرب میں اسلام اور شارع اسلام سے متعلق راسخ تھے"

لہ بحوالہ قدیم دلی کالج ص ۵۱

چنانچہ اس کتاب کی ہندوستانیوں ہی نے نہیں بلکہ بعض یورپی مستشرقین نے بھی تعریف کی ہے۔ اور اشپرنگر کی قابلیت کی داد دی ہے۔ ایک جرمن مصنف اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ”کواریٹری ریویو“ میں لکھتا ہے کہ

”جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے ان میں ڈاکٹر اشپرنگر کی کتاب کو بوجہ مصنفوں میں اول درجہ رکھتا ہے، ہم نے اس لیے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے۔“

واضح رہے کہ اشپرنگر نے ہندوستان کے زمانہ قیام میں سیرت نبوی سے متعلق انگریزی میں ایک اور کتاب لکھی تھی، جو ۱۸۵۱ء میں الرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے پیغمبر اسلام پر انواع و اقسام کے الزام عاید کیے ہیں اور ایسی خود ساختہ باتیں کہی ہیں جو ان جیسے سنجیدہ شخص کے لیے مناسب معلوم نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ہندوستانیوں کے علاوہ بعض انصاف پسند انگریزوں نے بھی ان کی اس کتاب کی تنقیص و تردید کی ہے۔ سر ولیم میور جو خود ایک سیرت نگار ہیں، لکھتے ہیں کہ ”ڈاکٹر اشپرنگر صاحب کی کتاب ایسے موقع پر میرے پاس پہنچی جب کہ میں اس مضمون کی تحصیل و تلاش کر رہا تھا اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے کہ اس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے محمد (۴) کے قبل زمانے کے عرب کا اور خاص محمد (۴) کا اور ان کی خصالت کا جو حال لکھا ہے وہ سب غلط ایوں پر مبنی ہے۔“

ان کتابوں کے علاوہ اشپرنگر نے گلستاں، الاصابہ فی الاحوال الصحابہ اور کنز نامہ ایٹ کر کے گلستاں سے شائع کیا تھا۔

مولانا مملوک العلی نالوتوی :

مولانا مملوک العلی کی ولادت ۱۸۹۶ء میں بہار پور کے ایک گائونالوتوی میں ہوئی تھی، جوان ہا ابانی وطن تھا۔

۱۵	عبد العلی منی، نذہۃ الخواطر و بیحۃ المسامح والنوالم
۱۵	جلد ۳ ص ۷۳

۱۵ والدین نے ان کا نام مملوک علی رکھا تھا جس کے معنی علی کا بندہ ہوا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد انہوں نے اس میں ترمیم کر کے مملوک العلی لکھا شروع کر دیا۔ اس ترمیم سے مملوک سے نسبت حضرت علی کی بجائے خدا کی طرف جاتی ہے جس کا ایک نام ”علی“ بھی ہے۔

ابتدائی تعلیم انھوں نے یہیں حاصل کی۔ اس کے بعد دلی چلے گئے وہاں علامہ رشید الدین دہلوی اور دوسرے علمائے فقہ، اصول فقہ، عربی ادب، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور ان میں مہارت پیدا کی۔ اس کے بعد مدرسہ دارالبقا کے معلم مقرر ہوئے جب دلی کالج کھلا تو عربی کے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں حج کے ارادے سے سفر حجاز کیا اور پورے ایک سال بعد ہندوستان واپس آئے۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو یرقان کے مرض میں وفات پائی۔
حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قبرستان ہندلیوں میں مسجد کے سامنے مدفون ہیں، قبر کا نشان موجود نہیں رہا۔

ملوک العلوی عربی کے گنے چنے عالموں میں سے تھے۔ ان کی شہرت نہ صرف دلی میں تھی بلکہ مضافات دلی کے ارباب علم بھی ان کی علمیت و فضیلت اور زہد و اتقا کی بنا پر انھیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ عربی میں تو انھیں کمال حاصل تھا ہی، فارسی اور اردو میں بھی وہ خاصی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی طالب علم ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا تو اسے اس طرح پڑھاتے گویا وہ سبق انھیں حفظ ہے۔ مولوی کریم الدین کے الفاظ میں انھیں ”کان علم، اور مخزن اسرار“ کہا جائے تو بجا ہے۔ کالج میں ان کی ذات بابرکات سے طلبہ نے اتنا فیض اٹھایا کہ شاید کسی زمانے میں کسی اور استاد سے نہ اٹھایا ہو۔

کالج کے اکثر طلبہ مدرسے کے اوقات کے علاوہ پڑھنے کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ علم پروری چوں کہ ان کی جبلت بن چکی تھی اس لیے کسی سے انکار نہ کرتے اور سب کو پڑھاتے تھے۔ ہمہ وقت درس و تدریس میں مشغولیت کے باعث انھیں تصنیف و تالیف کے کام کے لیے بالکل فرصت نہ ملتی تھی۔ اس کے باوجود کالج کی ملازمت کے دوران انھوں نے بعض کتابیں تالیف و ترجمہ کیا ہیں، جو ان کی

لے لیکن تعجب ہے کہ مولانا موصوف کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے مولانا قاسم نانوتوی کے تذکرے میں اپنے

والد ماجد کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن دلی کالج کی مدرسے کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے بلکہ یوں لکھا ہے: ”... مدرسہ دارالبقا

میں مدرس مقرر ہوئے اور ساری عمر وہیں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔“ (نذہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۷۲)

۷ نذہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۷۳۔ ۸ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۱۰۰

۹ ایف فلن و مولوی کریم الدین۔ طبقات الشعراء ہند، طبقہ چہارم ص ۶۹

محنت و مہارت کی شاہد ہیں۔ وہ جس کام پر مامور کیے جاتے اسے بڑے تندہی اور شوق سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔

ان کے ترجمے دوسرے اساتذہ اور منشیوں کے مترجم کی طرح عربی و فارسی ترکیب سے بوجھل نہیں بلکہ عام فہم اور سلیس زبان میں ہیں۔ انھوں نے اقلیدس کا جو اردو ترجمہ کیا ہے وہ نہایت آسان و عام فہم ہے۔ اس کے متعلق مولوی کریم الدین نے کہا ہے "حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔"

تالیفات :-

- (۱) تخریر اقلیدس کے بارہ مقالے۔ یہ کتاب کالج کے مشرقی شعبے کے نصاب میں شامل تھی۔
- (۲) سنن ترمذی کا اردو ترجمہ۔ سنن ترمذی حدیث کی مشہور کتاب ہے مولانا نے اس کا بھی ترجمہ اردو میں کیا تھا۔

مولانا امام بخش صہبائی :-

مولانا کا وطن تھانسیر تھا۔ لیکن ان کی ولادت دلی میں ہوئی تھی۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کوئی مستند شہادت موجود نہیں۔ البتہ مولوی کریم الدین نے قیاساً لکھا ہے کہ "عمر ان کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ھ میں قریب چالیس برس کے ہو گئی۔ اس حساب سے زمانہ ولادت ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ انھوں نے عبداللہ علوی سے فارسی اور مختلف لوگوں سے عربی پڑھی۔ وہ فارسی کے جدید عالم تھے اور اپنے زمانے کے مشہور علما، شعرا اور لغت، علم بیان، علم بدیع وغیرہ کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ دلی کالج میں آنے سے پہلے وہ فارسی کی متعدد کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان میں سے بعض یہاں شامل نصاب بھی تھیں۔ فارسی کے علاوہ انھوں نے عربی اور اردو شعرا و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق پایا تھا۔ اردو میں معاصرین کے درمیان ان کے مرتبے و مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ رام بابو سکسینہ کے بقول "قلعہ کے اکثر شہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔" وہ نہایت سنجیدہ، متین، خلیق اور روشن خیال شخص تھے۔ مولوی کریم الدین اور سر سید نے ان کی بڑی

۱۔ ایف اف لن اور مولوی کریم الدین طبقات الشعراء ہند۔ طبقات پیرس ص ۶۹

ص ۲۰

۲۔ ایضاً

۳۔ تاریخ ادب اردو حصہ ۱۰ ص ۸۰

تعارف ہی ہے۔ دلی شہر میں ان کے فضل و کمال اور ذہانت و فطانت کا ڈنکا بچ رہا تھا، لیکن دلی کالج کی ملازمت سے پہلے ۱۸۴۰ء تک صہبائی کاکوئی مستقل و معقول سلسلہ معاش نہیں تھا۔ شرفا و امرا کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ہندو امرا کے یہاں بھی ان کی آمدورفت تھی۔ چنانچہ گڑ والوں اور کشمیری پندتوں کے لڑکے ان کے زیر تعلیم تھے۔ اس کے بعد ان کا تقرر دلی کالج میں ہو گیا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے تقرر کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

”۱۸۴۰ء میں جب آئرہیل مسٹر ٹامس لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معاینے کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی لفٹنٹ بہادر نے تینوں کو بلایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ ردگ کیوں پالنے لگتے، انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط رکھی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کاکوئی ذریعہ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔“

یہ پتا نہیں چلتا کہ صہبائی کے تقرر کے وقت دلی کالج میں فارسی کا صدر مدرس کون تھا اور نہ یہی معلوم ہو سکا کہ صہبائی فارسی کے صدر مدرس کب بنائے گئے، لیکن یہ امر مسلم ہے کہ وہ جلد ہی فارسی کے صدر مدرس مقرر ہو گئے تھے۔

مولانا صہبائی کا دلی کالج میں تقرر مشرقی شعبہ کے لیے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئی۔ انھوں نے مشرقی شعبے کو ترقی دینے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور ترجمہ و تالیف کے کام میں غیر معمولی مدد کی۔ اکثر و بیش تر تراجم کے مسودے تصحیح کے لیے انھیں کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ کالج کے طلبہ میں تالیف و تصنیف کا جو جذبہ و حوصلہ پیدا ہوا اس میں صہبائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کام میں وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں آزاد، پیارے لال آشوب اور تذکرہ گلستان سخن کے مولف مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

لے مرحوم دہلی کالج ص ۵۲ - ۱۵۲

تذکرہ گلستان سخن، دراصل صہبائی ہی کی تالیف ہے۔ اسی طرح سرسید احمد خاں کی شہرہ آفاق کتاب ”آثار الصنادید“ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کا متن صہبائی ہی نے لکھا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر رام بابو سکینہ کے اس بیان کے علاوہ کہ صہبائی نے ”آثار الصنادید“ کی تصنیف میں سرسید کی کافی مدد کی تھی، مولانا حامد حسن نے لکھا ہے کہ ”اس (آثار الصنادید) کی عبارت سرسید نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی۔ اس ضمن میں حالی سے معتبر شہادت کس کی ہو سکتی ہے، انھوں نے لکھا ہے ”آثار الصنادید“ کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے ہیں مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم عمارتوں کے کتبہ وغیرہ کی نقل اتارنے میں بھی انھوں نے سرسید کی کافی مدد کی تھی۔

مولانا صہبائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ داروگیر میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ گولی کا نشانہ بن گئے اور ان کا مکان مسمار کر دیا گیا۔ مصور عم علامہ راشد الخیری نے ایک موقع پر ان کی شہادت کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

”مولانا قادر علی مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے، ایک موقع پر بیان کرتے تھے کہ صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آئیے، پہلی رکعت تھی کہ امام کے صاف سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔۔۔ ہم گرفتار ہو کر دریا (جننا) کے کنارے لائے گئے۔ ہم قریب ۲۰-۲۵ آدمی تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ۔۔۔ تم میں سے جو لوگ تیر نہ جانتے ہیں وہ دریا میں کود پریں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں، اب۔۔۔ اور ان

لہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب، منشی ذکا اللہ سری رام چندر اور عبد الغفور صاحب جیسے ذمہ دار لوگ اسے (گلستان سخن) صہبائی ہی کی تالیف سمجھتے تھے۔ (یکڈی ڈی سالنامہ ۱۹۵۹ء ص ۲۷)

۱۰ تاریخ ادب اردو حصہ ۸ ص ۸۰

۱۱ مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۲۲۶

۱۲ حیات جاوید ص ۳۵۷

کے صاحب زادے مولانا سوز تیز نا نہ جلتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر جان بچاؤں، لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دیا میں کو دڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ چاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر گر مر گئے یہ صدر الدین آرزوہ نے اس دردناک واقعے سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا۔

کیوں کر آرزوہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہوئے

اکبر الہ آبادی نے بھی ان کے انتقال پر ملال پر اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور

مادریں گولیاں پایا جسے کچھ زور اور

وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل

ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدرا اور پسر

مولانا صہبائی کے علمی و ادبی کارناموں کی جو تفصیل ہیں دستیاب ہو سکی ہے، حسب ذیل ہے۔

فارسی:

(۱) رسالہ گنجینہ رموز۔ یہ رسالہ ایک معما کی شرح میں ہے بقول سرسید متن و شرح دونوں آپ کے نتائج طبع کی رہن منت ہیں۔۔۔ کوئی رسالہ عہد آدم سے اس دم تک کسی صاحب استعداد کے پردہ فکر سے جلوہ گر ہوا ہے۔ شاید انہی تصنیف کے متعلق کریم الدین نے لکھا ہے کہ "ایک رسالہ ایک معما کے حل میں انھوں نے بہت خوب تصنیف کیا ہے، اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں، لیکن

۱۹۶۲ء جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۹

۱۸۷۷ء اور جامعہ جولائی ۱۹۸۰ء ص ۳۰۱

۱۹۶۳ء جنوری ۱۹۶۳ء ص ۳۰

۱۹۶۲ء آثار الصنادید ص ۴۲۲

۱۹۶۲ء طبقات الشعراء ہند، طبقہ چہارم ص ۳۵-۳۸

سر سید نے لکھا ہے اور غالباً ان کا بیان صحیح ہے کہ "اس کے ایک بیت سے تین سو ساٹھ اسامی مستخرج ہوتے ہیں۔"

(۲) جو اہر منظوم عزیز۔ یہ بھی فن معما پر مشتمل ایک منظوم رسالہ ہے۔ اس کی ہر رباعی سے اللہ تعالیٰ کا نام نکلتا ہے۔

(۳) زمزمہ جو اہر۔ صہبائی کی یہ تصنیف نظم و نثر کا مجموعہ ہے، جو عہد والی سراج الدین بہادر شاہ کی مدح سرائی پر مشتمل ہے۔

(۴) انشائے مکاتیب۔ بقول سر سید اس کی نثر بیدل کے طرز کی ہے۔

(۵) سحر البلاغہ۔ اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

اردو :

۴۔ حدائق البلاغت: یہ شمس الدین فقر کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ بیل نے اسے عربی کا ترجمہ قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ ترجمہ صہبائی نے بقول خود ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے پرنسپل بوترو کی فرمائش پر کیا تھا۔ شہ کریم الدین کے بیان کے مطابق یہ کتاب پہلی بار سید عبدالغفور کے زیر اہتمام ۱۸۴۳ء میں سید الاخبار پریس دہلی میں اور دوبارہ ۱۸۴۴ء میں خود کریم الدین کے مطبع رفاہ عام واقع حوض قاضی دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ حامد حسن قادری کے بقول "یہ ترجمہ صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ (درحقیقت) اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب ہے۔"

۱۔ آثارالصنادید ص ۴۳۲

۲۔ ایضاً ص ۴۳۲

۳۔ ایضاً ص ۴۳۳

۴۔ An Oriental Biographical Dictionary P. 342

۵۔ دیباچہ حدائق البلاغت: بحالہ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۵-۲۱۷

۶۔ طبقات الشعراء ہند، طبقہ چہارم ص ۳۸

۷۔ داستان تاریخ اردو ص ۱۸۷

(۷) انتخاب دواوین۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اردو کے چند شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب صہبائی نے دلی کالج کے پرنسپل بوترو کے حسب فرمائش ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مرتب کیا تھا۔ جو ۱۸۴۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ صہبائی نے اس میں صرف بارہ (۱۲) شاعروں کے کلام کا انتخاب مع ان کے مختصر حالات درج کیا ہے۔ ان میں ولی، خواجہ میر درد، سودا، میر تقی میر، جرات میر حسن، شاہ نصیر، میر نظام الدین ممنون، امام بخش ناسخ، منشی مول چند، شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول اشعار کا انتخاب پاکیزہ ہے مولف کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تذکرہ نگاری کے عام روش کے برخلاف مولف نے اس مجموعے میں غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں اور ہر صنف میں کوئی شاعر امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس کے انتخاب پر خاص توجہ دی ہے۔ حالات کے بیان میں صہبائی نے غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے، حتیٰ کہ مشہور و ممتاز معاصرین کے بارے میں بھی ان کے بیانات معدودے چند سطروں سے تجاوز نہیں کرتے۔

”انتخاب دواوین“ کا دیباچہ جو اردو میں ہے طلبہ کے نقطہ نظر سے بے حد کارآمد اور مفید معلومات کا حامل ہے۔ اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف اور تاریخ، وزن کی اہمیت، قافیہ و ردیف مبادیات عروض اور اصناف سخن کے بارے میں مختصر مگر جامع مواد یکجا کر دیا ہے۔ اصناف سخن کی تعریف اور تعارف میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر صنف کے مخصوص اوزان کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ممتاز شعرا کے کلام سے اس کے نمونے بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

(۸) قواعد اردو۔ یہ کتاب اردو صرف و نحو پر تالیف کی گئی ہے۔ یہ ۱۸۴۹ء میں دلی سے پہلی بار طبع ہوئی تھی۔ بقول مولوی عبدالحق یہ کتاب بھی اچھی ہے۔ اس کے آخر میں ہر ترتیب حروف ابجد اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔

یہ تعجب ہے کہ اس انتخاب میں ایک ایسے شاعر جو غالب کی شہرت کا مالک ہے، کا کلام شامل نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صہبائی اور غالب میں چشمک تھی

۲۰ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۳۱۶ ۳۱۷ قواعد اردو ص ۱۴

ان کتابوں کے علاوہ فارسی میں ظہوری کی شرح، ٹیک چنڈ بہار کی لغت "بہار عجم" کے بعض مشکل الفاظ کی شرح میں ایک رسالہ اور ایک دیوان اور ایک فارسی دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے خواجہ میر درد کے دیوان کی تصحیح بھی کی تھی، جسے دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔

پنڈت رام کشن:

پنڈت رام کشن کشمیر الاصل برہمن تھے۔ لیکن ان کے بزرگوں نے ملازمت کے سلسلے میں دلی کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ چنانچہ یہ بھی ہیں تبدیل ہوئے اور اس نسبت سے دہلوی کہلائے۔ مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ "عمر اوس کی سنہ ۱۸۲۷ء میں قریب ۲۵ برس کے ہوگی۔ اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۸۱۲ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس زمانے کے عاقد وراج کے مطابق طلبہ کو فارسی کی تعلیم لازم آمد لائی جاتی تھی کیوں کہ تہذیب و تمدن کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سرکاری زبان کے منصب پر بھی سرفراز تھی۔ چنانچہ پنڈت رام کشن نے بھی فارسی پڑھی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ فارسی دانوں میں شمار ہونے لگے۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ اس کے بعد دلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔ یہاں آئے تو انگریزی دانوں کی صحبت نے اس زبان سے ان کی واقفیت میں چار چاند لگا دیے اور رفتہ رفتہ وہ انگریزی، فارسی اور اردو میں یکساں صلاحیت کے مالک بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کالج میں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے اردو میں کتابیں تیار کرنے کی تحریک جاری تھی اور بیش تر کتابیں انگریزی کتابوں کی مدد ہی سے معرض وجود میں آرہی تھیں۔ پنڈت جی کا سرگرم اتحاد اس کام کو آگے بڑھانے میں نہایت مفید ثابت ہوا۔

پنڈت رام کشن نے دلی کالج میں آنے سے پہلے اردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اردو میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ یہاں اپنے جوہر دکھانے کا انھیں اچھا موقع ہاتھ آیا، دوسری چیز جس نے انھیں تالیف و ترجمے کی طرف راغب کیا وہ اس کام کی معقول اجرت تھی۔ جہاں جو رام چند اور کریم الدین کے بعد اگر کسی نے مشرقی شعبے کی کتابوں کی تیاری میں نمایاں حصہ لیا ہے تو وہ پنڈت رام کشن ہی ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور پوری ذمہ داری اور حسن خوبی کے ساتھ ان کے تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔ کریم الدین نے ان کے اسلوب نگارش اور تراجم کی

۱۔ طبقات شعرائے ہند، اکادمی ایڈیشن ص ۲۶۵

تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اردو بہت صاف اور شستہ اوس کی ہے اوس کے ترجموں / خوبی اور اچھے ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے۔“

مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

- (۱) مزید الاحوال باصلاح الاحوال :- این فن زراعت میں پہلی کتاب ہے جو بہت مشہور ہوئی۔
- (۲) اصول دھرم شاستر :- یہ مکناٹن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔
- (۳) ترجمہ سعیدالابلام :- اس کا موضوع اسلامیات و اخلاقیات ہے۔
- (۴) قواعد صرف و نحو انگریزی :- یہ کتاب ڈاکٹر ایشپرنگر کی مدرسے لکھی گئی تھی، بظاہر اس مقصد طلبہ کو اردو کے ذریعے انگریزی زبان کی قواعد کے مبادیات اور اصول و ضوابط سے واقفیت پہنچانا معلوم ہوتا ہے۔

(۵) رسالہ علم طب (۶) اصول قوانین دیوانی و فوجداری

- (۷) اصول قوانین کلکٹری :- اس کا دوسرا نام ”اصول سرکاری محفل کے“ بھی ہے۔
- (۸) اصول قوانین گورنمنٹ یا ”اصول قوانین ممالک مختلفہ“ جو زف ہنری ٹیلر :-

مسٹر ٹیلر کالج کے قیام سے ۱۸۵۷ء کی شورش تک ہیڈ ماسٹری اور پرنسپل کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ وہ بیس برس تک کالج کے عارضی پرنسپل اور بارہ برس تک ہیڈ ماسٹر رہے۔ اس طرح انھوں نے ۳۲ برس تک کالج کی خدمت انجام دی۔ ٹیلر نہایت خلیق و شریف النفس انسان تھے۔ طلبہ سے بے حد محبت کرتے اور ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ گزشتہ اوراق میں بالتفصیل ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی موت غدر کے زمانے میں ہوئی۔ ممالک مغرب و شمالی کے ناظم تعلیمات نے اس حادثے کے بعد انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:-

”میں مسٹر ٹیلر کی بیش بہا کارگزاری کی تصدیق کرتا ہوں گورنمنٹ کے کسی محکمے میں

ان سے زیادہ صادق اور قابل قدر کوئی شخص نہ تھا۔ ان کے طویل قیام دہلی اور

طلباء سے گہری واقفیت نیز اس ادب و احترام کی وجہ سے جو دہلی والے ان کا کرتے

لے بحالہ طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۵

تھے اور بوجہ اس اثر کے جو وہ دلی کالج کے ہندوستانی اساتذہ پر رکھتے تھے، انھوں نے بہت سی اصلاحیں بغیر کسی مخالفت کے جاری کیں اور کالج کو بڑی ترقی کے درجے تک پہنچایا۔

جب کالج میں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے اردو میں کتابوں کی تالیف و تصنیف کا کام شروع ہوا تو مسٹر ٹیلر نے بھی اس میں معاونت کی۔ انھوں نے علم الجراحت کے موضوع پر "رسالہ نسیج بیان اعمال جراحی" کے نام سے سمبول کوپر کی انگریزی کتاب "Treatise on Surgery" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

مولوی حسن علی خاں :-

مولوی کریم الدین نے ان کی عمر ۱۸۴۷ء میں چالیس برس کے قریب بتائی ہے۔ یہ دلی کالج میں فارسی کے مدرس تھے۔ فارسی اور اردو میں مہارت تامہ کے علاوہ عربی سے بھی بقدر ضرورت اقصیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی جو کتابیں اردو میں ترجمہ کی تھیں اور جن طباعت و اشاعت اسی زمانے میں عمل میں آچکی تھیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۱۔ ترجمہ قانون مال

۱۲۔ ترجمہ گلستان سعدی

۱۳۔ ترجمہ الف لیلی (انتخاب)

۱۴۔ ترجمہ کمرہ ارضی

میر اشرف علی :-

دلی کالج کے منشیوں میں میر اشرف علی اپنی ذہانت و ذکاوت کے لیے مشہور تھے۔ اس کے ساتھ ہی شرافت اور منکر مزاجی بھی ان کا نمایاں وصف تھی۔ مولوی کریم الدین نے ان کے اخلاق واضح اور ظرافت و خوش مزاجی کی ان کھول کر تعریف کی ہے۔ میر صاحب فارسی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت نامہ رکھتے تھے۔ کالج کی طرف سے انھیں ترجمہ و تالیف کے علاوہ اصلاح

۱۴۹-۵۰۔ بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۵۰-۱۴۹

۱۵۔ طبقات الشعراء ہند طبقہ چہلم ص ۷۲

و تصحیح کا کام بھی تفویض کیا گیا تھا۔

آپ نے محمد اعظم کی "تاریخ کشمیر" کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ مولوی کریم الدین کے الفاظ میں یہ "بہت اچھا ترجمہ ہے" اس کے علاوہ اصول علم حساب سے متعلق رسالے کی تالیف میں منشی ہردیو سنگھ کو مدد دی تھی اور "برلیف سروے آف ہٹری" کے اردو ترجمے کی تصحیح و اصلاح کر کے اسے طباعت و اشاعت کے لیے تیار کیا تھا۔

منشی حسینی :-

منشی حسینی دلی کالج میں "تعلیم اطفال" کی خدمت پر مامور تھے کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۲۷ء میں ان کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ اس اعتبار سے ان کی ولادت ۱۸۱۷ء کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بڑے نیک، پارسا اور متقی شخص تھے۔ اردو و انگریزی اور فارسی زبانوں میں انھیں عبور حاصل تھا۔ علاوہ بریں عربی میں بھی اچھی صلاحیت کے مالک تھے۔ منشی حسینی قانون اور تاریخ کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف و ترتیب کا خاص ملکہ رکھتے تھے حسب ذیل تصانیف انھیں کی رہن منت ہیں:

۱) تاریخ مغلیہ :- کریم الدین نے اسے ترجمہ قرار دیتے ہوئے اس کے چھپ جانے کا ذکر کیلئے ان کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ترجمہ فارسی سے کیا گیا تھا یا انگریزی سے۔ لیکن مالک رام نے کالج کی جو فہرست مرتب کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی کتاب "History of Mughal Empire" کا ترجمہ ہے۔ اس کے ترجمے میں ماسٹر نور محمد اور مولوی سبحان بخش بھی شریک تھے۔

(۲) تاریخ ایران :- یہ کونڈر صاحب کی انگریزی کتاب "Modern Travellers" کا اردو ترجمہ ہے۔

(۳) شرح شریف :- کریم الدین کی تحریر کے مطابق یہ مسٹر مکناٹن کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسے منشی جی نے مولوی سید محمد صاحب کی مدرسے سے تیار کیا تھا۔

(۴) سر اجیہ (اسلامی قوانین وراثت) :- یہ بھی مکناٹن صاحب کی اسی موضوع پر انگریزی

۱۔ طبقات الشعراء ہند، طبقہ چہارم ص ۷۱

۲۔ ایضاً ص ۷۱

- میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔
- (۵) قانون محمدی فوجداری :- یہ بھی مکناٹن کی کتاب کا ترجمہ ہے۔
- (۶) خلاصہ قوانین دیوانی :- مسٹر پرنسپ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے
- (۷) خلاصہ قانون فوجداری :- یہ اسکیپ دتھ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔
- منشی وزیر علی :-

وزیر علی کالج کے نامور استادوں میں سے تھے۔ فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ نے انگریزی کی بعض مفید کتابوں کے اردو ترجمے کیے ہیں جن میں جان اسکاٹ مل کی مشہور تصنیف "Elements of Political Economy" کا اردو ترجمہ "اصول پولیٹیکل اکنومی" بطور خاص قابل ذکر ہے۔ انھوں نے "Abridged History of Greece" کا بھی ایک سو باون^{۱۵۲} صفحے تک کا ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے کو شیو پرشاد نے مکمل کیا۔

مولوی احمد علی :-

کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۲۷ء میں احمد علی کی عمر فریب ۳۵ برس کے تھی اس اعتبار سے ان کی ولادت کا زمانہ ۱۸۱۲ء کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ یہ دلی کے رہنے والے تھے۔ کالج میں مبتدیوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ اور تفتن طبع کے لیے شعر بھی کہا کرتے تھے۔ بقول مرزا قادر بخش صاحب "ہر چند جمیع علوم میں درست گاہ تم تھے، لیکن فن طبابت میں یہ طولاً اور شخص خاص امراض میں حدس صائب ایسی کہ بیماری نرگس کی علت اور سوسن کی گنگنی زبان کا سبب: ریافت کرنا ایک کار سہل ہے۔ سوائے تکمیل مدارج علمی کے اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ اس طرح مجمع کمالات کی ذات میں فراہم ہیں کہ کتب اخلاق اگر تمام عالم سے مچو ہوجاویں، اس کی گفتار و کردار سے ہر کتاب کے بدلے ایک اور کتب خانہ متن و شرح کا ہم ہو سکتا ہے"

انھوں نے قواعد اردو پر صرف ایک ہی کتاب مسمیٰ "چشمہ فیض تصنیف کی جو

بہت ہی مقبول ہوئی۔

۱۔ طبقات الشعراء ہند طبقہ چہارم ص ۱۰

۲۔ گلستان سخن ص ۵۷-۲۵۶

مولوی سبحان بخش:

ان کی ولادت قریب ۱۸۰۷ء میں ہوئی۔ یہ دلی کالج میں عربی کے مدرس سوم تھے۔ مولوی کریم الدین کے بقول ”بہت فہیدہ۔ عقلمند اور عالم آدمی تھے اور فنون مستعمل میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔“
تالیف و تصنیف اور ترجمہ کے فن سے انھیں خاص شغف تھا۔ نرسپوں نے اپنی رپورٹوں میں جا بجا ان کی کارگزاریوں کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ کالج کے زمانہ ملازمت میں انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔

(۱) محاورات اردو۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ کئی بار چھپ چکی ہے۔

(۲) تذکرہ حکما۔ یہ دونوں کتابیں علامہ عبدالرحمن سیوطی کی عربی کتابوں کے ترجمے ہیں۔

(۳) تذکرہ المفسرین۔

(۴) تذکرہ الفقہاء۔ یہ ابن خلدکان کی مشہور کتاب ”وفیات الاعیان“ سے ماخوذ و مترجم ہے۔

یہ تینوں کتابیں (نمبر ۲، ۳ اور ۴) دلی سوسائٹی نے ۱۸۴۸ء میں ایک ہی جلد میں شائع کی تھیں۔

(۵) توذک تیموریہ۔ یہ اسی نام کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔

(۶) تاریخ مغلیہ۔ اس کتاب کے ترجمے میں منشی حسینی اور ماسٹر لور محمدان کے شریک کار تھے۔

ہر دیو سنگھ:

ان کے والد کا نام بستی رام اور دادا کا نام منشی دھرسا ہو تھا۔ وہ دلی کالج میں انگریزی کے

استاد تھے۔ کریم الدین کے بقول ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر ۲۸ برس کے قریب تھی۔ ان کے اوصاف

حمیدہ اور فرائض منصبی کی بجا آوری میں دلچسپی و تندہی کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

”یہ شخص بے کینہ اور بہت صاف دل اور یار باش اور اہل مروت ہے، کار گزار

اپنے کار مفوضہ کا بہت ہے۔ نوکری کو اپنا کار تصور کر کے بجان و دل محنت کرتا ہے

اور بہت ہوشیار، تیز اور چالاک آدمی ہے۔ میں نے ان کو کبھی فرصت سے بیٹھے ہوئے

نہیں پایا۔ جب دیکھا کار سرکاری میں معروف دیکھا۔ خلیق اور متواضع آدمی ہے“۔

۱۔ طبقات الشعراء ہند طبقہ چہارم ص ۷۱

ص ۶۷

۲۔ ایضاً

ص ۶۷

۳۔ ایضاً

تصانیف درج ذیل ہیں :-

(۱) رسالہ پیمائش زمین - یہ رسالہ دو حصوں میں ہے اور قادر علی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہو چکا ہے۔
 (۲) اصول علم حساب - یہ ڈی مارگن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کی اصلاح اردو اور تصحیح میں منشی اشرف علی اور احمود صیاد پرشاد نے بھی مدد کی تھی۔ لیکن کریم الدین اجمود صیاد پرشاد نہیں کرتے۔

ماسٹر نور محمد :-

اگر کریم الدین کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے کہ ۱۸۲۷ء میں نور محمد کی عمر ۲۵ برس ہے۔ تو ان کی ولادت کا زمانہ ۱۸۱۲ء کے قریب قرار پائے گا۔ وہ تختناہ جماعت کے معلم تھے اور کریم الدین کے بیان کے مطابق اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ان سے مندرجہ ذیل تراجم یادگار ہیں۔

(۱) تاریخ بنگال - یہ مارش مین کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جس میں ابتدا سے ۱۸۴۰ء تک پکنی کی علمداری کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) تاریخ مغلیہ - اس کتاب کے ترجمے کا کام انھوں نے منشی حسینی اور مولوی سبحان بخش کی شرکت میں کیا تھا۔

(۳) سیر الاسلام - کریم الدین کی تحریر کے مطابق اس ترجمے کا کچھ حصہ ان کے نتائج قلم سے ہے۔
 رادھا کشن :-

رادھا کشن دلی کالج میں انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر تھے۔ انھیں اردو اور فارسی پر بھی بقدر ضرورت عبور تھا۔ ان کی مندرجہ دو کتابیں ہمارے علم میں آئی ہیں۔

(۱) ہندسہ بالجبر - یہ انگریزی کتاب "Algebraical Geometry" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے میں ماسٹر رام چندر بھی ان کے شریک کار تھے۔
 (۲) رسالہ علم ادوات - یہ بھی انگریزی سے ترجمہ ہے۔

لے مالک دہم، قدیم دلی کالج ص ۶۸

لے طبقات الشعراء ہند طبقہ چہارم ص ۷۲

۷۲ ص ایضاً

اجودھیا پرشاد :-

اجودھیا پرشاد دہلی کے رہنے والے کشمیری نژاد برہمن تھے۔ یہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اور طلبہ کی تعلیم و ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیتے تھے۔ وہ قلندر بخش جرات کے شاگرد تھے۔ فن موسیقی اور تیراندازی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔

تصانیف:

(۱) رسالہ علم ہیئت۔ یہ ہرشل کے انگریزی رسالے "Astronomy" کا اردو ترجمہ ہے اس ترجمے میں رام چندر نے بھی ان کی بھد کی تھی۔

(۲) اصول قواعد مائیات۔ یہ تھامس ویسٹر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۳) اصول علم حساب۔ یہ ترجمہ انھوں نے ہر دیوسنگھ اور اشرف علی کی معیت میں کیا تھا۔

(۴) رسالہ علم طبیعی۔ اس ترجمے میں شیو پرشاد بھی ان کے شریک کار تھے۔

(۵) رسالہ علم مساحت۔ یہ قوانین مستعمل میں ۷۷ صفحے کا ایک اردو رسالہ ہے۔

(ب) دلی کالج کے ممتاز طلبہ اور ان کے کارنامے

ماسٹر رام چندر:

رام چندر ۱۸۲۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد رائے سندر لال ماسٹر محکمہ مالیات میں اولاً نائب تحصیل دار اور بعد میں تحصیل دار کی حیثیت سے متعین رہے۔ رام چندر ابھی اپنی عمر کے نو برس ہی پورے کر پائے تھے کہ سندر لال ماسٹر داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی وفات نے گھر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ رام چندر چھ بھائی تھے۔ ان کی پرورش و پرورش میں ان کی بیوہ ماں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ معاشی پریشانیوں کے طوفان میں گھرنے کے بعد انھیں زیورات کے ساتھ گھر کے دوسرے سامان بھی بیچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہونے دیا۔ چونکہ رائے سندر لال ماسٹر دلی کے رہنے والے تھے اس لیے ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ بچوں کو لے کر دلی چلی آئی تھیں جس سے ان کی تعلیم میں کوئی خاص دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جب ان کے بچے (جن میں رام چندر بھی شامل تھے) دلی کے انگلش اسکول میں داخل ہوئے، تو اس وقت ہر طالب علم کو کچھ نہ کچھ وظیفہ ضرور دیا

جاتا تھا، درجہ اول اور دوم کے بچوں کو پانچ پانچ روپیہ ملتا تھا۔

۱۸۳۳ء میں جب رام چندر اس اسکول میں داخل ہوئے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے موٹے اخراجات و عطیے ہی سے پورے ہوتے رہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، اس لیے ان کے یہ دن اچھے نہیں گزرے اور شاید اسی تنگ دستی کے باعث ایک کایستھ کی گونگی بہری لڑکی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ صدیق الرحمن قدوائی نے اس سلسلے کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔

”ابھی رام چندر گیارہ برس کے تھے کہ ان کی شادی کی بت چلی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے تو پوت کے پاؤں پالنے ہی میں دیکھ لیے تھے، اس لیے ان پر بہتوں کی نظر پڑی، اتفاق سے شہر کے ایک رئیس خوش حال رائے نے جب شادی کے لیے اپنی لڑکی کا زائچہ بنوایا تو وہ رام چندر کے موافق نکلا۔ خوش حال رائے کی دولت اور سوخ کی بنا پر پنڈتوں پرنتوں کی ہمدردیاں ان ہی کے ساتھ تھیں، اس لیے ان کی رائے بھی خوش حال رائے کی مرضی کے مطابق رہی۔ دولت اور حسب و نسب کے باعث رام چندر کے خاندان والوں کو یہ رشتہ بہت پسند آیا۔ مزید امور کی زیادہ تحقیق کرنا اس وقت کا دستور نہ تھا۔ برادری میں جو لوگ باعزت، ذمہ دار اور قابل اعتبار سمجھے جاتے تھے ان کا اصرار ہی کافی تھا۔ چنانچہ لڑکی گونگی بہری نکلی۔ مگر کیا کیا جانا زائچے دوٹوں کے ملتے تھے۔ لڑکی کا نام سیتا اور لڑکے کا رام چندر ہونا بھی نیک شکون تھا۔“

خوش حال رائے رام چندر کے گھر کی مالی حالت سے خوب واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے شادی کے پہلے دن سونے کی سات مہریں، چاندی سونے کے درقوں میں پان اور بہت سا نقد روپیہ بھیجا۔ لیکن سسرال کا یہ اثاثہ بھی رام چندر اپنی تعلیم کے دوران محفوظ رکھ سکے۔ انگریزی اسکول میں چھ سال تک خوب دل لگا کر پڑھلے۔ دوران تعلیم انہیں ریاضی سے خاص شغف پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ معمولی اسکول ان کے شوق کی تکمیل کے لیے ناکافی تھا۔

جب معاشی پریشانیاں اور بڑھیں تو انھوں نے پڑھائی چھوڑ کر محرمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن تعلیم کی تکمیل کا شوق اب بھی انھیں بے قرار رکھے ہوئے تھا۔ اسی شوق کی خاطر وہ ۱۸۴۱ء میں ملازمت چھوڑ کر دلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انھیں بہ گمان غالب مسٹر بوٹرو کی ہمدردی حاصل تھی۔ چنانچہ کالج کے سینئر اسکالر شپ کے مقابلے میں بیٹھے تو اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے، اور تیس روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ رام چندر جب دلی کالج میں داخل ہوئے تو سال دو سال بعد ہی پرنسپل بوٹرو کی سرگردگی میں اردو کتابوں کے تراجم کا کام شروع ہوا۔ رام چندر نے بھی بڑی محنت اور دل چسپی سے اپنے استاد مسٹر بوٹرو کی اس تحریک میں حصہ لیا اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ جو بہت زیادہ پسند کیے گئے۔ ہونہار بر وا کے چکنے چکنے پات، بالآخر فروری ۱۸۴۲ء میں کالج کے مشرقی شعبے میں مدرس مقرر ہو گئے۔ وہ ریاضی اور سائنس اردو میڈیم میں پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے ریاضی کی ایک کتاب ترتیب دی۔ اور اپنے خرچ سے چھپوائی۔ اس کتاب کا نام "A Treatise on the Problems of Maxima and Minima" تھا۔ اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان کے علمی حلقے میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ بہت سے اہل علم نے تو اسے دیکھ کر حیرت اور استعجاب کا اظہار اور رام چندر کی بڑی تعریف و توصیف کی۔ ہندوستان کے باہر بھی اس کتاب نے ماسٹر رام چندر کا نام کافی روشن کیا۔ جب وہ اس کتاب کے سلسلے میں کلکتہ گئے تو ان کی ملاقات دلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر سے ہوئی، جو اس وقت بنگال ایسٹ انڈیا سوسائٹی کے معتمد تھے۔ انھوں نے رام چندر کی ملاقات ڈاکٹر بیٹھوں (Bathune) سے کرائی، جو اس وقت سپریم کونسل پریزی ڈنٹ لاکونسل اور کونسل آف ایجوکیشن کے ممبر تھے۔ انھوں نے رام چندر کی کتاب کا ایک نسخہ دو سو روپے میں خریدا۔

ڈاکٹر بیٹھوں نے ان کی کتاب کے نسخے یورپ کے متعدد عالموں کے پاس بھیجے، جن میں لندن یونیورسٹی کے ریاضیات کے پروفیسر ڈیکارگن بھی تھے۔ انھوں نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی۔ انھوں نے یہ سفارش بھی کی کہ یہ کتاب انگلینڈ میں ریاضی کے ابتدائی درجے کے نصاب میں داخل کی جائے۔

پروفیسر ڈیماگن کی رائے سے متاثر ہو کر کورٹ آف ڈائریکٹرز نے پانچ پارچے کا خلعت اور دو ہزار روپیے نقد رام چندر کے لیے بطور انعام منظور کیے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں دلی میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں شہر کے شرفا و امر اشریک تھے۔ اس جلسے میں یہ بیش بہا انعام انھیں تفویض کیا گیا، جس سے ہند اور بیرون ہند کے علمی اوق پران کا نام ستارے کی طرح جگمگانے لگا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں رام چندر کے دن انتہائی پریشانی میں گزرے۔ ایسی سپاہیوں کو ان کی اور چمن لال کی تلاش تھی۔ کیونکہ رام چندر اور چمن لال نے (جو دلی کالج کے قدیم طالب علم اور اس وقت فرسٹ سب اسٹنٹ سرجن دلی تھے) ۱۸۵۲ء میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ چمن لال تو بکڑے گئے اور مارے گئے۔ لیکن رام چندر کسی طرح بچ نکلے اور ان کے ہندو بھائیوں نے انھیں ان کے پرانے گھر میں کچھ دنوں تک چھپائے رکھا۔ جب لوگوں کو یہاں ان کی موجودگی کا پتا چل گیا تو ان کا جاٹ نوکر انھیں دلی سے دس میل دور کسی گاؤں میں ایک زمیندار کے یہاں لے گیا۔ لیکن کسی طرح یہ بات بھی سپاہیوں کے علم میں آگئی اور انھوں نے وہاں دھاوا بول دیا۔ حسن اتفاق سے زمیندار کو اس حملے کی قبل از وقت اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے رام چندر کو اس سے باخبر بھی کر دیا۔ چنانچہ وہ اور ان کا جاٹ نوکر دونوں گاؤں چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے ابھی یہ لوگ کوس ادھ کوس ہی گئے تھے کہ سپاہیوں کی آمد اور فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ گئے اور سپاہی اس زمین دار کو لوٹ مار کر واپس چلے گئے۔ رام چندر اپنے جاٹ نوکر کی مساعدت سے بچتے بچتے انگریزی نیمے میں جا پہنچے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس قسم کی پریشانی کا سامنا کر چکے تھے، جب کہ انھوں نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو پتسما (Patsma) لیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے گرودار میں کالج بند ہو گیا، تو ماٹر رام چندر ۱۸۵۸ء میں رڈ کی کے ٹاس ہول انجینئر کالج کے ہیڈ ماٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے خرابی صحت کی وجہ سے علمی پنشن کی درخواست کی اور باہم مراسلت اور تحقیق کے بعد سو سو روپیے کی پنشن منظور ہو گئی۔

۱۸ مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۲۸

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۸۶۶ء میں رام چندر پٹیاہ کے دلی عہدہ ہند سنگھ کے اتالیق مقرر ہوئے ۱۸۶۸ء میں مہاراجا موصوف کی تخت نشینی کے موقع پر انھیں خلعت اور ایک ہزار روپے کی جاگیر عطا ہوئی اور ۱۳ جون ۱۸۷۰ء کو جب پٹیاہ میں سررشتہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا، تو وہ اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ پٹیاہ کی ملازمت کے دوران وہاں انھوں نے جو گراں قدر علمی و تعلیمی خدمات انجام دیں اور ان کی کوششوں سے تعلیم اور محکمہ تعلیم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کے صلے میں حکومت پٹیاہ اور حکومت ہندوؤں کی طرف سے ان کی قدر افزائی اور تعریف ہوئی، جب وہ اس ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو حکومت پٹیاہ کی طرف سے بھی پنشن منظور کی گئی۔

رام چندر کی پہلی بیوی سیتا کا ۲۷ فروری ۱۸۷۰ء کو انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مئی ۱۸۷۱ء میں انھوں نے ایک بنگالی برہمن لڑکی سے دوسری شادی کر لی۔ اس بیوی نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا اور عیسائی عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

رام چندر کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ علمی مشاغل کی کثرت نے اس پر مزید خراب اثر ڈالا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۲ء سے وہ مستقلاً بیمار رہنے لگے اور ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء کو جب کہ ان کی عمر صرف ۵۹ سال تھی، ان کا انتقال ہو گیا۔

مارٹر رام چندر طبعاً نہایت خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ جب وہ طالب علم تھے تو ان کے اساتذہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب وہ خود استاد ہوئے تو وہ اپنے شاگردوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے اور بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے۔ وہ نہایت وسیع النظر اور فراخ دل تھے اور کسی قسم کا تعصب نہ رکھتے تھے لیکن عیسائیت میں اضطباع لینے کے بعد کے گانا تنگ نظری اور تعصب سے پاک نہیں ہیں۔ کیونکہ تبدیلی مذہب کے بعد وہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کی تذلیل اور ان کے عقائد کی تنقیص و تحقیر پر اتر آئے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ان کا کافی وقت مذہبی مباحث جیسے ناپسندیدہ مشاغل میں صرف ہونے لگا۔ سید رفیق مارہروی لکھتے ہیں

”پروفیسر رام چندر جب تک ہندو رہے بجز خدمت علم و زبان دوسری طرف

راعب نہیں ہوئے۔ عیسائیت نے جہاں ان کی زندگی کے روشن رخ کو بے وقعت کر دیا، وہیں تبدیلی مذہب نے ان کے کیرکڑ میں رکاکت پیدا کر دی۔ ہندو قوم کا ایک فرد جو ہندو اور مسلمانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا، تعصب و فرقہ بندی کا شکار ہو گیا۔

رام چندر کے اعترافات ہندو مذہب پر بہت کم ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر اسلام اور اسلامی عقائد کو ہدف اعتراض بنایا اور ان کی مخالفت میں ہزاروں صفحات سیاہ کیے۔ ان کے اس عمل پر مسلمانوں نے بھی ان کے نظریات و افکار کا پوسٹ ماٹم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اسلام پر ان کی تنقید کے رد میں ایک کتاب کا جواب متعدد کتابوں سے دیا جانے لگا۔ یہ جوابات دلائل و براہین کے اعتبار سے اتنے مستحکم اور ٹھوس ہوتے کہ رام چندر کو منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ حقیقتاً اس قسم کے مباحثے رام چندر کی شخصیت کے شایان شان نہ تھے۔ ان تنازعات نے ان کی شہرت و عظمت کو کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ اردو صحافت کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔

ڈاکٹر سید جعفر کے بقول ”رام چندر اردو کے پہلے مصنف ہیں، جنہوں نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر ان کی جانبدار روایات اور تو ان ادبی قدروں کو اپنانے اور انہیں زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ گارسن ڈی ٹسی کی تحریر کے مطابق وہ اپنے رسالے ”فوائد الناظرین“ انگریزی اخبارات اور رسائل سے حرف خبریں ہی نقل نہیں کرتے تھے بلکہ مفید اور دل چسپ مضامین بھی ترجمہ کر کے شائع کرتے رہتے تھے۔ یہ ان کی ان کوششوں کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے دائرہ معلومات کو وسیع کرنا اور انہیں ان افکار و نظریات سے روشناس کرنا تھا جن تک ان میں سے اکثر کی رسائی کے ذرائع تقریباً مفقود تھے۔ اس طرح انھوں نے جو عہد آفرینی کا نامہ انجام دیا وہ مہتی دنیا تک ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔

۱۔ ہندوؤں میں اردو ص ۲۰۱

۲۔ اردو مضمون کا ارتقا ص ۲۹

۳۔ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸۵

تالیقات و تصنیفات :

(۱) عجائباتِ روزگار۔ یہ کتاب سماجی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر مصنف کے مضامین کا مجموعہ ہے یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ بعض مصنفین نے اس کا نام ”عجائبِ روزگار“ بھی لکھا ہے۔

(۲) تذکرہ الکاملین۔ یونان، روم، انگلستان اور مشرقی مالک کے علما و فضلا کا تذکرہ ہے۔
(۳) بھوت نہنگ۔ بقول گارسن ڈی ٹی اسی اس کتاب کا مقصد ہندوستانیوں کو بھوت پریت پر عقیدہ رکھنے سے باز رکھنا ہے۔

(۴) اصولِ گورنمنٹ کے۔ یہ کتاب جی۔ نورٹن (G. Norton) کے انگریزی لکچروں کا ترجمہ ہے۔ اس کے ترجمے میں پتہ کرنے بھی مدد کی تھی۔ مولوی سید محمد کی اصلاح کے بعد اس کی طباعت و اشاعت عمل میں آئی۔ یہ کتاب مشرقی شعبے کے نصاب میں داخل تھی۔

(۵) علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر۔ یہ کتاب متعدد کتابوں کی مدد سے ترتیب دی گئی تھی بعض لوگوں نے اس کا نام ”اصول علم مثلث بالجبر و تراش ہائے مخروطی“ بھی لکھا ہے۔

(۶) علم ہندسہ بالجبر۔ یہ سائنس کی کتاب ہے، جس میں جاہجی شکلیں اور خلع کے ہیں

(۷) اصول علم حساب جزئیات و کلیات۔ یہ کتاب علم حساب اور علم نجوم پر مشتمل ہے۔ حرکات اجرام اور حساب فلکی اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

(۸) سریح الفہم۔ ریاضی کے مبتدیوں کے لیے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

(۹) علم طبیعی۔ یہ طبیعیات (Physics) سے متعلق بڑی مفید کتاب ہے۔

(۱۰) رسالہ اصول کلوں کے باب میں۔ یہ ٹی۔ ٹیس (Tate) کی کتاب ”Elements

of Mechanism“ کا اردو ترجمہ ہے۔

A Treatise on the Problems of Maxima And minima (۱۱)

(رسالہ مسائل کلیات و جزئیات) اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں بحث آچکی ہے۔

لہ خطبات گارسن دتاسی ص ۱۸۷

A specimen of a New Method of The Differential calculus, (۱۲)
 (تفرقی احصاء کا ایک نیا طریقہ) called the Method of constant Ratio.

۱۸۴۲ء میں یہ مختصر رسالہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ کلیات و جزئیات سے مختلف نوعیت کا ہے۔

(۱۳) اعجاز قرآن یا اعتراض قرآن۔ رام چندر کے مذہبی تعصب کی یہ پہلی کڑھی ہے۔ کتاب کے مشتملات کا اندازہ اس کی فصلوں کی اس تفصیل سے لگایا جاسکتا ہے۔

فصل اول۔ معجزہ وحی کی تفتیش میں، (دوہم) خاص تذکرہ ان لوگوں کا جن سے محمد صاحب نے تعلیم پائی اور اجزائے قرآن مرتب ہوئے (سوم) جبرئیل قرآن کے بیان میں (چہارم) اس دین کے بارے میں جو جبرئیل نے محمد صاحب کو سکھایا یعنی دین ابراہیم (پنجم) اس بیان میں کہ کس معنی میں قرآن ایک معجزہ ہے (ششم) اس بیان میں کہ موافق قرآن و حدیث کے یہ عقیدہ محمدیوں کا کہ فصاحت قرآن ایک معجزہ ہے، باطل ہے۔

(۱۴) مسیح الدجال۔ اس کتاب میں مصنف کا روئے سخن پیغمبر اسلام کی جانب ہے۔

(۱۵) رسالہ تحریف قرآن۔ یہ کتاب مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی کی کتاب "استفصار الانعام" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

(۱۶) بدعات عیسائی مذہب۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے مذہبی بدعات و اختراعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ رام چندر نے دو رسالے بھی جاری کیے تھے، ایک "نوائد الناطقین" جو پہلی بار ۲۳ مارچ ۱۸۴۵ء کو شائع ہوا۔ دوسرا "خیر خواہ ہند" جو بعد میں "حب وطن" ہو گیا۔ ان دونوں رسالوں میں رام چندر نے علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل پر بھی مضامین لکھتے رہے۔ اور اسی مذہبی تعصب کی بنا پر ان کے یہ دونوں رسالے بند بھی ہو گئے۔
مولوی ذکار اللہ:

مولوی ذکار اللہ اردو کے نثر نگاروں میں ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ادبیات، اخلاقیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ریاضی، ہیئت اور طبیعیات جیسے متنوع اور مختلف فیہ موضوعات پر متعدد قابل قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

اسی لیے مولانا حالی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ”مولوی ذکار اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔“ اور مولوی محمد یحییٰ تنہا کے بقول امام غزالی کا روزانہ اوسط تصانیف چار صفحے ہوتا ہے، قریب قریب یہی اوسط مولوی ذکار اللہ صاحب کی دماغی کاوشوں کا ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو ان کی علمی سرگرمیوں نے اردو کے نشری سرمائے میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔

ذکار اللہ خاں یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا، جو نہ صرف یہ کہ صوم و صلوات کے پابند تھے، بلکہ دینی امور اور اسلامی شعائر پر نہایت سختی کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق مولوی ذکار اللہ کی تعلیم گھر سے شروع ہوئی اور جب بارہ برس کے ہوئے تو دلی کالج میں داخلہ لیا، جہاں مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ذکار اللہ کو ریاضیات سے خاص شغف تھا۔ ماٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے۔ اپنے لائق و فائق شاگرد مولوی ذکار اللہ کی طرف ان کی خاص توجہ نے سونے پر سہاگے کا کام لیا۔ چنانچہ دوران تعلیم ریاضی میں اکثر اول آتے رہے۔ اور قابلیت کے وظیفے بھی حاصل کرتے رہے۔ انھیں کالج کی طرف سے اعلیٰ قابلیت کے دو تمغے بھی عطا کیے گئے تھے۔

ذکار اللہ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسی کالج میں یانسی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک انھوں نے آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔ ۱۸۵۵ء میں وہ بلند شہر میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ بلند شہر اور مراد آباد میں گیارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۱۸۶۶ء میں دلی نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ چونکہ ان کا تعلق سرسید کی تحریک سے بڑا گہرا تھا اس لیے جب سائنٹفک سوسائٹی وجود میں آئی تو وہ اس کے ممبر بنے۔ اور جب دہلی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں چند ولال

لے بحوالہ تاریخ ادب اردو حصہ نثر از رام بابو سکسینہ ص ۶۲، اور مختصر تاریخ ادب اردو از اعجاز حسین ص ۲۶۳

۱۔ سیر المصنفین جلد دوم ص ۲۰۶
۲۔ ایضاً ص ۲۰۶

کے عہدہ معتمد سے مستعفی ہونے کے بعد ذکار اللہ کو دہلی سوسائٹی کا سکریٹری منتخب منتخب کیا گیا۔
 ۱۸۶۹ء میں اورینٹل کالج لاہور اور میونسپل کالج الہ آباد کی پروفیسری کا پروانہ ساتھ ساتھ
 آیا، لیکن انھوں نے الہ آباد کو ترجیح دی۔ الہ آباد میں پندرہ برس تک عربی و فارسی کے پروفیسر رہے
 ۱۸۸۵ء میں پنشن لی۔ عمر کے باقی ۲۲ برس دلی میں رہ کر تالیفی و تصنیفی مشاغل میں بسر کیے۔
 ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

ذکار اللہ کو شروع سے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ اتفاق سے
 ملازمت بھی ایسی ملی کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے۔
 علم ریاضیات سے انھیں خاص دل چسپی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے ریاضی کے استاد ماسٹر رام چندر
 کے منظور نظر بھی تھے۔ بعض لوگ اسی تعلق کی بنا پر رام چندر کے عیسائی مذہب اختیار کر
 لینے کے بعد انھیں شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ عیسائیت سے
 کبھی مرعوب ہوئے اور نہ ماسٹر رام چندر کی معیت ان کے عقائد و نظریات میں کسی قسم کی زلزل
 پیدا کر سکی۔ وہ تاحیات سچے مسلمان اور یکے موحد رہے۔

ذکار اللہ نے انگریزی زبان کسی استاد کی مدد کے بغیر خود ہی سیکھی تھی اور اس میں انھیں
 اتنا درک حاصل ہو گیا تھا کہ انگریزی کی کتابیں بہ آسانی پڑھنے اور سمجھنے لگے تھے۔ اس کا اندازہ
 اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے بہت سے مضامین انگریزی کتابوں یا رسالوں کے ترجمے ہیں۔
 لیکن اس کے باوجود انگریزیت ان پر کبھی غالب نہیں ہوئی۔ ان کی ظاہری وضع قطع اور بود و باش
 سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھیں انگریزیت سے کوئی تعلق رہا ہے۔ سرسید سے ان کا خاص
 تعلق رہا۔ لیکن انھوں نے کبھی ان کی وضع قطع کی تقلید نہیں کی۔ وہ آزادانہ غور و فکر کے عادی تھے۔
 دوسروں کی خوش نودی کے خیال سے یا کسی کی صحبت و معیت کے زیر اثر اپنی روش بدل دینے
 کے قائل نہیں تھے۔ ذکار اللہ کی طبیعت میں اختراع و ابداع کا مادہ کم تھا، ان کی تحریروں میں
 صفائی، روانی اور سلاست تو ضرور ہے لیکن طرز بیان میں کوئی خاص کیف و لطف نہیں۔ تحقیق و تلاش
 ان کا مزاج تھی، جو کچھ اس سے معلوم ہوتا اسے سیدھے سادے اسلوب میں قلم بند کر دیتے تھے۔

لکھنؤ لال، نوائے ادب، سبھی اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۸۲

ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کی تصانیف ان کے زمانے میں کافی مشہور و مقبول ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں درسی ضروریات کے تحت لکھی گئی تھیں اور مختلف امتحانات کے لصاب میں داخل تھیں، اس لیے ان کی طباعت و اشاعت کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ اب چونکہ اردو ذریعہ تعلیم نہیں رہی ہے، اس لیے ان کتابوں کی اہمیت و اشاعت بھی کم ہو گئی ہے۔ تاہم ان کے متعدد مضامین اب بھی درسی کتابوں میں شامل ہیں۔

مضمون نگاری میں ذکاوت کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کے زمانے کے اڈیٹر ان کے مضامین و مقالات اپنے جرائد میں اشاعت کی غرض سے حاصل کرنے کے متمنی رہتے تھے اور ان کا بھی یہ معمول تھا کہ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مختلف النوع موضوعات پر ان کے بہ کثرت مضامین معاصر رسالوں میں شائع ہوئے۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن۔ لاہور، زمانہ۔ کانپور، رسالہ حسن، حیدرآباد، شمس۔ کلکتہ، صبح بہار۔ میسور اور ”خاتون“ و ”ادیب“ فیروز آباد تو خاص طور سے ان کے رشحات قلم سے فیض یاب ہوتے رہے۔ کچھ مضمون انہوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھے۔ لیکن اکثر و بیشتر مضامین طبع زاد ہوتے تھے، جو زمانے کے ماحول و عروج سے مطابقت رکھتے تھے۔ کثرت مطالعہ اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت کردے پر جہاں تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے، وہاں دیوار میں گرٹھا ہو گیا تھا۔ ابھی تک ان کے جتنے مضامین دریافت ہوئے ہیں ان کی مجموعی تعداد متر سو بتائی جاتی ہے یہ

ان کی بعض تخلیقات کے ضلع میں گورنمنٹ نے انہیں پندرہ سو روپیے کا نقد انعام عطا کیا، اور خان بہادر اور شمس العلماء جیسے معزز خطابات سے ان کی عزت افزائی کی۔ جب وہ ڈپٹی انسپکٹر تھے اس زمانے میں تعلیم نسواں کی توسیع و ترقی کے صلے میں حکومت نے انہیں خلعت بھی عطا کیا تھا۔

تصانیف :

ذکاوت کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ ان کی موضوعات و تفصیل کسی

لہ آج کل (اردو نمبر) اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۶

انبار میں شائع ہوئی تھی جسے محمد یحییٰ تنہا کی تصنیف "سیر المصنفین" کے جلد دوم کے حوالے سے مسطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مضمون	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۴	۸۷
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم ادب	۱۴	X	۱۴
علم اخلاق	۶	X	۶
طبیعیات	۷	۲	۹
سیاست دن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۲	۱۴۱

اس مقالے کی محدود گنجائش کے پیش نظر یہاں ان تمام تصنیفات سے متعلق ضروری تفصیلات کی فراہمی دشوار ہے، اس لیے اختصار کے ساتھ چند اہم اور مشہور کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔
 (۱) تاریخ ہند۔ اس کے اٹھارہ حصے ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۶۹ ہے اور یہ دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں خاص طور پر عہد سلطنت اور دور مغلیہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جو تحقیق سے معر نہیں۔

(۲) آئین قیصری۔ اس کتاب میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ہندوستان کے انتظامی امور میں ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔

(۳) اگڈن نامہ۔ یہ گورنر جنرل لارڈ کرزن کی سوانح عمری ہے۔

(۴) فرہنگ فرنگ۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جن میں ملکہ وکٹوریہ اور ان کے شوہر کے حالات زندگی اور یورپی تہذیب اور معاشرے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکار اللہ ملکہ وکٹوریہ کے بڑے مداح تھے اور ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

(۵) تاریخ عہد انگلشیہ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے اپنے عہد تک کی ہندوستانی تاریخ ہے۔

(۶) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی۔ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

(۷) مضامین ذکار اللہ۔ یہ ان کے مختلف النوع مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین طبع زاد ہیں، لیکن بعض مضامین انگریزی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ہر مضمون اس قدر مدلل اور مفصل ہے کہ موضوع کا حق ادا ہو گیا ہے۔

مولوی کریم الدین :

دلی کالج کے طلبہ کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی مرتب کی جائے تو اس میں مولوی کریم الدین کا نام نہ صرف یہ کہ شامل کیا جائے گا بلکہ نمایاں طور پر لکھا جائے گا۔ انھوں نے منطق، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، پیمائش، مناظرہ، جبر و مقالہ اور تاریخ کے علاوہ طب، فقہ، اصول فقہ اور حدیث کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ زبانوں میں عربی و فارسی پر کامل دستگاہ کے پہلو بہ پہلو وہ انگریزی زبان سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بڑے نیک، ذہین و فطین اور منکر المزاج شخص تھے۔ کالج کی تعلیم و تربیت اور علمی ماحول نے ان میں علمی ذوق اور تالیف و تصنیف کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

کریم الدین بقول خود عین عید کے دن بوقت نماز فجر ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء کو پانی پت میں افغانیوں کے محلے میں مسجد لشکر خاں کے متصل پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ سراج الدین تھا۔ ان کی ولادت بھی پانی پت ہی میں ہوئی تھی۔ دادا پبلی بھیت کے متوطن تھے اور بادشاہی جاگیر کی وجہ سے بڑے متمول تھے، اسی بنا پر اکثر ملکوں کی انھوں نے سیاحت بھی کی تھی۔ لیکن جب نادر شاہ کے حملے میں دلی کا سہاگ لٹا تو ان کی جائداد اور املاک بھی اسی تباہی و بربادی کی نذر ہو گئی اور بجز خدا کے کوئی سہارا باقی نہیں رہا، حتیٰ کہ بدرجہ مجبوری مسجد نشینی اور امامت اور مدرسہ پر قناعت کرنا پڑی۔ کچھ دن بعد جب لیک صاحب پانی پت کے جاگیر داروں کو ان کی جاگیریں واپس کرنے کے لیے آئے تو کریم الدین کے دادا کو بھی بلا یا گیا۔

لہ کریم الدین طبقات الشعراء ہند طبقہ چہارم ص ۷۹

لیکن کچھ تو جنونی کیفیت کی وجہ سے اور کچھ ورع و اتقا میں غلو کی بنا پر وہ لیک صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے تیار نہیں ہوئے، جس کی وجہ سے ان کی جاگیر ہمیشہ کے لیے ضبط ہو گئی کریم الدین کے خاندان کے لیے یہ ایام بڑے پریشانی کن تھے۔ چونکہ زہد و تقویٰ ان کے خاندان کا نشان امتیاز بن چکا تھا، اس لیے کریم الدین کے دادا کے انتقال کے بعد ان کے 'سراج الدین' کو بھی مسجد کا امام مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے والد کی طرح طلبہ کی تعلیم و تربیت سے گزر اوقات کرتے رہے۔ شیخ صاحب کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور سراج تخلص کرتے تھے۔ مولوی کریم الدین نے "طبقات شعرائے ہند" میں ان کی چار تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ایک قصہ حاتم طائی کا منظوم اردو ترجمہ بھی ہے۔

کریم الدین کی تعلیم کی ابتدا ان کے والد اور دادا کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ شروع میں فارسی کی دو چار کتابیں پڑھیں، پھر عربی کی تعلیم شروع کی۔ ذہنی پراگندی، طبعی ناآسودگی اور معاشی بد حالی نے انہیں پانی پت کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ایک مرکز کی حیثیت سے چار دانگ عالم میں مشہور تھی۔ ہر طرف علوم و فنون کے چشمے جاری تھے۔ کریم الدین نے دلی آنے کے بعد مختلف عالموں سے صرف و نحو، طب فلسفہ، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ گذرا اوقات کے لیے انہوں نے کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دلی کالج میں داخل ہو گئے۔ گارسن ڈی ٹیسی کا خیال ہے کہ کریم الدین تقریباً ۱۸۱۲ء میں دلی کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ڈی ٹیسی کو یہ غلط فہمی دراصل کریم الدین ہی کی ایک تحریر کی بنا پر ہوئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ...

درمیان ۱۸۱۲ء کے جناب مستطاب ٹامین صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر نے بند و بست میں دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تلاش (کذا - تلاش) کر کے اس میں واسطے تحصیل کے رکھے گئے، چنانچہ میں بھی اٹھارہ برس کی عمر (میں) اس میں داخل ہوا۔ یہ کریم الدین کا مذکورہ بالا بیان

۱۔ کریم الدین، طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۵۴

۲۔ خطبات گارسن دتاسی ص ۲۱

۳۔ طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۷۵-۷۶

مبہم اور پیچیدہ ضرور ہے، لیکن ڈی ٹی ٹی کا اس سے یہ مطلب نکالنا کہ کریم الدین قریب ۱۸۱۲ء میں دلی کالج میں شامل ہوئے درست نہیں۔ بقول کریم الدین کے اگر اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے تو ان کے داخلے کا زمانہ ۴۰ - ۱۸۲۹ء کے قریب قرار پائے گا۔ داخلے کے ساتھ ہی سولہ روپیہ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔ وہ کم و بیش چار سال یعنی ۱۸۲۲ء تک دلی کالج کے طالب علم رہے۔ انہوں نے اس دوران میں مشرقی و مغربی علوم و فنون میں خاصی دسترس بہم پہنچائی۔ تصنیف و تالیف کا کام طالب علمی ہی کے زمانے سے شروع کر دیا تھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد کریم الدین نے دلی ہی میں شادی کر لی۔ اس کے بعد بعض دوستوں کے تعاون سے ”رفاہ عام“ کے نام سے ایک مطبع قائم کیا جس کے لیے محلہ قاضی حوض میں مبارک النساء بیگم کی حویلی کرائے پر لی۔ اسی اثنا میں انہوں نے اپنے مکان پر مشاعرے کی محفلیں منعقد کیں۔ ان مشاعروں کے انعقاد کا اصل مقصد معاصر شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کرنا تھا۔ یہ مشاعرہ مہینے میں دو بار بڑے اہتمام سے ہوتا تھا اور جو اشعار اس میں پڑھے جاتے تھے انہیں بعد میں ”پرچہ مشاعرہ“ کے نام سے ایک گلدستہ کی صورت میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ ان کے مکان پر ۱۲ رجب ۱۲۴۱ھ بروز اتوار مطابق ۲۰ جولائی ۱۸۲۵ء سے شروع ہوا، اور اسی سال میں درمیان ماہ ذی قعدہ (۱۲۶۱ھ) نومبر ۱۸۲۵ء میں اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اس مشاعرے کا دوسرا مقصد کریم الدین کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ ان کے مطبع کو قبول عام حاصل ہو، اس لیے وہ اس کی روداد ”پرچہ مشاعرہ“ میں شائع کرتے تھے۔ چونکہ مشاعرہ مہینے میں دو بار ہوتا تھا اسی لیے ”پرچہ مشاعرہ“ بھی مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ لیکن مطبع حسب دل خواہ زچل سکا۔ کیوں کہ جن دوستوں کے تعاون سے انہوں نے مطبع قائم کیا تھا وہ مارا آستین نکلے۔ بعد میں ان ہی دوستوں نے کریم الدین کے بعض مخالفین کے

۱۔ ڈاکٹر احمد لاری، مقدمہ گل دستہ نازنیناں ص ۷

۲۔ ڈاکٹر محمد الہی، بازیافت ص ۳۷ اور مقدمہ طبقات شعرائے ہند ص ۳

ساتھ مل کر مطبع بھی ان کے قبضے سے چھین لیا۔ لیکن اسی معاملے میں کریم الدین نے کوئی ناش یا چارہ جوئی نہیں کی۔ بہر حال مطبع ”رفاہ عام“ اور کریم الدین کے قائم کردہ متذکرہ بالا مشاعرے نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ یہ مشاعرے تاریخ ادب اردو میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے دلی میں شعر و شاعری کے فروغ میں بڑی تقویت ملی۔ دلی کے تقریباً سبھی معاصر شعرا اس مشاعرے میں شرکت کرتے تھے۔

اکبر حیدری کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ ۱۷ اپریل ۱۸۴۸ء کو کریم الدین دلی سے کوہ لندن (مسوری) کے لیے روانہ ہوئے۔ کیوں کہ خود اپنے بیان کے مطابق وہ ۱۸۴۷ء میں مسوری میں اقامت گزریں تھے۔ لہٰذا مسوری ہی کے قیام کے دوران انھوں نے طب کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے کوہ لندن پر محفل مشاعرہ بھی منعقد کی تھی۔ جن شعرا نے اس میں شرکت کی، اپنا کلام سنایا اور کریم الدین سے ملاقات کی ان میں محمد پیر باز خاں شاد، شیخ محمد بخش اللہ ہاشمی مسرور، شیخ محی الدین شور اور محمد علی عاشق کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے جس کا کلام کریم الدین نے پسند کیا اس کا انتخاب ”طبقات شعرائے ہند“ میں درج کیا ہے۔

۱۸۵۰ء کے قریب کریم الدین آگرہ کالج سے وابستہ ہو گئے، جہاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک مدرس اول اردو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کی تین کتابیں ”کہر بانی بالمس“، ”موضح اللسان“ اور قواعد ہندی، اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ جون ۱۸۶۱ء سے قبل وہ پنجاب چلے گئے، جہاں محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ۶۱-۱۸۶۱ء کے درمیان ترقی کر کے وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس، بعد میں انسپکٹر مدارس کے معزز عہدے پر پہنچ گئے۔ اور غالباً اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش بھی ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۔ تحقیقی جائزے حصہ اول ص ۱۰۱

۲۔ طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۷۹

۳۔ ڈاکٹر غلام حسین نذوفقار، سہ ماہی صیغہ لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۴

تذکرہ نگاری کی تاریخ میں مولوی کریم الدین کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ انھوں نے مذہب سے لے کر جغرافیہ تک، علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں اپنی کارگزاری کا مظاہر کیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ مورخ تھے۔ اور ہر واقعے کو اس کی اصلی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔

قاضی عبدالودود نے گارنڈی ٹی کے حوالے سے کریم الدین کی تصانیف کی تعداد ۳۵ بتائی ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر محمود الہی نے "خط تقدیر" کے مقدمے میں انھیں ۴۷ کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے۔ راقم السطور کو ان میں سے صرف ۳۰ کتابوں ہی کا پتہ چل سکا ہے، جن کی تفصیلات بالاختصار سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) طبقات شعرائے ہند۔ بعض تاریخ نویسوں نے اس کا نام "طبقات الشعرائے ہند" اور "تذکرہ شعرائے ہند" بھی لکھا ہے۔ لیکن اس کا اصل نام بقول کریم الدین "طبقات شعرائے ہند" ہے۔ اس کا ماخذ گارنڈی ٹی کی تاریخ ہے۔ حامد حسن قادری کا یہ خیال کہ کتاب کے بعض حصے کریم الدین کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض ڈاکٹر فیلیں کے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ گارنڈی ٹی کی کتاب فرانسیسی زبان میں ہے اور کریم الدین فرانسیسی نہیں جانتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی تالیف میں فیلیں سے ترجمہ کی حد تک مدد لی تھی۔ ڈاکٹر فیلیں ترجمے کا کام انجام دیتے تھے، جسے کریم الدین اپنی زبان میں لکھتے جاتے تھے۔ یہ غلط فہمی لوگوں میں اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ جب یہ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کے خاص سرورق پر انگریزی اور اردو میں حسب ذیل

لے بحوالہ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۲۰

لکھ عطا کوروی نے اسے چار حصوں میں (طبقات الشعرائے ہند طبقہ اول تا طبقہ چہارم) علاحدہ علاحدہ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ہے۔ شروع میں اسی سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ حاشیے میں میں نے بھی طبقات الشعرائے ہند ہی لکھا ہے۔ جہاں "طبقات شعرائے ہند" لکھا گیا ہے وہاں اکادمی ایدیشن سے رجوع کیا گیا ہے۔

۳ لے دیا چہ طبقات شعرائے ہند، اکادمی ایدیشن ص ۲ لیکن جہاں انھوں نے اپنی کتابوں کی تفصیلات درج کی ہیں وہاں اس کا نام "تذکرہ شعرا ہند" ہی لکھا ہے۔ (طبقات شعرائے ہند ص ۲۷۱)

۴ لے داستان تاریخ اردو ص ۷

عبارت لکھی ہوئی تھی۔

A HISTORY OF URDU POETS
CHIEFLY TRANSLATED FROM GARCANDE TASSY'S HISTORIES
DE LA LITERATURE HINDOUSTANIE
By
F. FALLON ESQ. AND MOULVI KAREEM MOODDEEN
WITH ADDITION

» شعرائے اردو کا (کذا) مسٹر ایف۔ فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے کارنڈی (کذا) کی تاریخ سے ۱۸۴۷ء میں ترجمہ کیا اور نو سو چونسٹھ شاعروں اردو گو کے اشعار اور حال بھی دو ادین مختلف میں سے منتخب کر کے اس میں مندرجہ کر دیا گیا ہے۔
مندرجہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شامل شعرا کی تعداد ۶۶۴ ہے۔ لیکن عطا کاوردی ان شعرا کی تعداد ایک ہزار چھ بتاتے ہیں۔
طبقات شعرائے ہند گارسن ڈی ٹی کی تاریخ کا صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ کریم الدین نے اس میں بہت اضافے کیے ہیں۔ انہوں نے تذکرہ حکیم قدرت اللہ اور گلشن بے خار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دلی کالج کے اساتذہ کے حالات بھی، طبقہ چہلم میں قلم بند کیے ہیں۔ چنانچہ خود گارسن ڈی ٹی نے اسے ایک علاحدہ تصنیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

» طبقات الشعرا مصنف کریم الدین ۱۸۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اسے میری تاریخ کی پہلی جلد کہا جاتا ہے لیکن یہ ایک بالکل جداگانہ تصنیف ہے۔
مولوی کریم الدین نے اسے اشپنگر کی فرمائش پر تالیف کیا تھا۔ تاریخ ادب اردو میں یہ بڑی

۱۔ دیباچہ طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہلم ص ۳

۲۔ دیباچہ طبقات شعرائے ہند ص ۵

۳۔ ایضاً ص ۵

اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں جاہ جاتا دینی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ بہ قول اکبر حیدری ”طبقات الشعراء“ سے بڑھ کر اور کوئی غیر مستند تذکرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن اسکی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں اس کے حوالے متداول ہیں۔

(۲) تعلیم النساء۔ یہ آٹھ تعلیمات پر مشتمل ہے اور خاص طور سے لڑکیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

(۳) گلستان ہند۔ یہ بھی آٹھ باب پر مشتمل ہے، جس میں بالترتیب لطائف و ظرافت، حکایات اور قصے، نقلیات، ضرب الامثال، افسانے، عورتوں کا چلن، پند و اخلاق اور منتخب اشعار درج ہیں۔

(۴) گلستانہ نازنیناں۔ کریم الدین کی مراحت کے مطابق ”گلستانہ نازنیناں“ تذکرے کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جسے ”انتخاب دواوین“ کہا جاتا ہے۔ اسے کریم الدین نے اپنے ایک دوست کی فرمائش پر ۱۸۲۲ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو کے ۲۷ شعرا اور دس شاعرات کا ذکر ہے۔ حالات زندگی نہایت مختصر اور کلام کے انتخابات خاصے طویل ہیں۔

(۵) عجالتہ العلالہ :- یہ علم عروض پر ایک مفید رسالہ ہے، جسے شعرا نے بہت پسند کیا۔ یہ ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا۔

(۶) رسالہ ذرائع۔ یہ علم میراث سے متعلق مختصر رسالہ ہے، جو ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا۔

(۷) فرائد الدہر۔ یہ عربی زبان میں عربی شعرا کا تذکرہ ہے، یہ ۱۸۲۷ء میں شائع ہوا۔

(۸) روض الاجرام۔ فن حساب، فن پیمائش، الجبرا، اہمیت اور جغرافیہ پر مشتمل ہے۔

(۹) تذکرۃ النساء۔ یہ دنیا کی ہر فن میں ماہر و مشہور خواتین کا تذکرہ ہے۔

(۱۰) تاریخ شعرائے عرب۔ ڈاکٹر اشپینگر کے حکم سے کریم الدین نے ”فرائد الدہر“ کا اردو میں

ترجمہ کیا اور اس کا نام ”تاریخ شعرائے عرب“ رکھا۔ اس میں ۳۷۳ شعرائے عرب کا ذکر ہے۔ یہ

لے تحقیقی جائزے حصہ اول ص ۱۱۳

لے بحوالہ مقدمہ گلستانہ نازنیناں ص ۱۲

بھی ۱۸۴۷ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔

(۱۱) ترجمہ ابوالفدا۔ یہ عربی کتاب "ابوالفدا" کا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے، کا اردو ترجمہ ہے۔ تیسری جلد کا ترجمہ مولوی محمد امیر نے باقی پانچ جلدوں کا کریم الدین نے کیا۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ابتدائے آفرینش عالم سے ۷۲۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔

(۱۲) محط الحمی۔ اس میں عربی زبان میں بہت ہی دلچسپ قصے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۳) ترجمہ کتاب ڈاکٹری۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ محمد علی شاہ والی مہرنے اس کا ترجمہ عربی میں کرا کے ۱۲۵۰ھ میں شائع کیا۔ ۱۸۴۷ء میں کریم الدین نے اس کے عربی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱۴) تسہیل القواعد۔ اردو میں صرف و نحو کی ایک مفید کتاب ہے، جو پنجاب کے مدرسوں میں رائج تھی۔

(۱۵) کریم اللغات۔ عربی و فارسی کے معنی اردو میں دیے گئے ہیں۔

(۱۶) انشائے اردو۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں خطوط نولیس، دوسرے میں عریض نولیس، تیسرے میں دفتری مراسلات اور عدالتی دستاویزات اور آخری حصے میں درباری مراسلت کے نمونے درج ہیں۔ اور ان کے لکھنے کے قاعدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۷) ہندو مند۔ اس کتاب میں ڈیڑھ سو قدیم و جدید مقولے نقل کیے گئے ہیں۔

(۱۸) خط تقدیر۔ یہ کتاب ناول کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمود الہی نے "خط تقدیر اردو کا پہلا ناول" کے مقدمے میں اسے اردو کا پہلا ناول ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱۹) واقعات ہند۔ یہ ہندوستانی تاریخ ہے جسے کریم الدین نے اے۔ آر۔ فلر کے حکم سے لکھا تھا۔ اس کی تصویر میں انگریزی اور ہندوستانی دستاویزات سے مدد لی گئی ہے۔

(۲۰) مفتاح الارض۔ یہ جغرافیہ کی کتاب ہے جسے کریم الدین نے مدرسے کے لیے لکھا تھا۔

(۲۱) موضع اللسان۔ (۱۸۵۱ء) ۲۲۔ کہربانی بلس (۱۸۵۲ء) ۲۲۔ قواعد المبتدی (۱۸۵۷ء)

لے کریم الدین، طبقات الشعراء ہند طبقہ چہام ص ۷۹

(۲۲) تشہیرِ ظہوری (۱۸۶۱) ۲۵۔ قصہ پنجاب سنگھ (۲۶) تکریمِ ظہوری، (۲۷) اشاراتِ تعلیم
۲۸۔ سنن اسلام ۲۹۔ جامع القواعد فارسی ۳۰۔ کریم اللغات (فلسفی)

مولانا محمد حسین آزاد:

محمد حسین آزاد دلی کالج کے ان طلبہ میں سے تھے جن پر کالج کے اساتذہ کو فخر تھا۔ کالج میں مضمون نویسی کے مقابلے میں وہ اکثر اول آتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اساتذہ ان کے مضامین پڑھ کر، مواد کی فراہمی اور طرزِ تحریرِ انگشت بہ دنیاں رہ جاتے تھے۔ ان کی تحریریاں زبان و بیان کے اعتبار سے دوسرے طلبہ کی تحریروں سے یکسر مختلف اور ممتاز ہوتی تھیں۔ یہ تو نو مشقی کا حال تھا اور اب ان کی نثر سے نظم کا سا خط ملتا ہے اور کبھی کبھی وہ شعر سے بھی کہیں زیادہ موثر اور دل آویز معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی زبان میں وہ تاثیر اور بیان میں وہ گھلاؤ ہے کہ قادری عبارت کی دل کشی سے مسحور ہو جاتا ہے۔ آزاد کی نثر نگاری کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہیں بقول مہدی افادی "آزاد اردو کے معنی کا ہیرو ہے۔۔۔ جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلیؒ نے چمکایا اردو کو انشا پر دازی کے درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں۔۔۔ سرسید سے محقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب وہ کوئے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ آقلے اردو پر دنیسیر آزاد صرف ایسے انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے تو کوئی آزاد کو "آقائے اردو" کا درجہ دیتا ہے تو کسی کی رائے کے مطابق یہ اردو کے عناصرِ اربعہ میں اولیت کے حقدار ہیں۔

مولانا آزاد کی ولادت۔ ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی تھی۔ ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ والدہ (امانی بیگم) کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد ان کی پھوپھی نے ان کی پرورش و پرورش کی۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں دلی کالج میں داخل کیا گیا۔ ان کے والد مولوی باقر اور ذوق میں بڑی گارٹھی چھنتی تھی محمد باقر نے آزاد کو ذوق کے سپرد کر دیا۔ وہ چھٹیوں میں

لہ افادات مہدی ص ۲۲-۲۲۲ ۲۲۲ ڈاکٹر اسلم فرخی، محمد حسین آزاد حصہ اول ص ۸۱

ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور دن دن بھر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان ہی صحبتوں میں انھوں نے فن و عروضا کی تحصیل کی اور ان کے مذاق شعر گوئی کو جلا حاصل ہوئی استاد کی معیت میں انھیں بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کے مواقع ملے، جن کی بدولت اپنے عہد کے مشاہیر شعرا سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی نکتہ رس طبیعت پر زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے امرار و رموز منکشف ہونا شروع ہوئے۔

آزاد نے ابھی اپنی عمر کے ستائیس برس بھی پورے نہیں کیے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہلاکت خیز ہنگاموں نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے والد مولوی محمد باقر سیاسی سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کا نام ”دم ہلی اردو اخبار“ سے بدل کر ”اخبار الظفر“ کر دیا تھا، جس کی وساطت سے وہ ہم وطنوں کو انگریزوں کے خلاف مستعد کرتے رہتے تھے۔ اتفاقاً اس ہنگامے میں ان کے دوست مسٹر ٹیلر نے ان کے مکان میں آکر پناہ لی۔ دوسرے دن جب یہ بات محلے والوں کے علم میں آگئی تو مولوی صاحب نے انھیں ہندوستانی کپڑے پہن کر نکل جانے کا مشورہ دیا تاکہ کسی طرح وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ لیکن لوگوں نے انھیں پہچان لیا اور وہیں ان کا کام تمام کر دیا۔ اس جرم کی یاد اس میں ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو محمد باقر سرراہ پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ اور آزاد کے نام بھی وارنٹ جاری ہو گیا۔ یہ بے چارے ڈر کے مارے راتوں رات سر پر پاؤں رکھ کر گھر سے نکل بھاگے۔ اور چل بس تک ادھر ادھر کی خاک چھلتے پھرے۔ جب حکومت کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا تو وہلی واپس آئے۔ یہاں آنے کے بعد کسب معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ کچھ دنوں تک ایک فوجی مدرسے میں مدرسے کے عہد پر کام کیا، بعد میں اس سے دست کش ہو کر پھرتے پھرتے ۱۸۶۱ء میں لاہور پہنچے۔ اور یکم فروری ۱۸۶۲ء کو محکمہ تعلیم میں ۲۵ روپے ماہوار پر اہل مد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ لیکن اس معمولی عہدے کی وجہ سے ان کی اتنی ہمت دہوتی تھی کہ کسی بڑے افسر سے مل کر اور اپنی قابلیت و بیانت کا ثبوت فراہم کر کے کسی بڑے عہدے پر پہنچ سکیں۔

حسن اتفاق سے ایک بار سررشتہ تعلیم کے ڈاکٹر سید فخر لفظ ”ایجاد“ کو مونث لکھنے کے بعد اس

لے ڈاکٹر جعفر رضا، مقدمہ نیرنگ خیال ص ۸

کی تذکیر و تائید کے متعلق شیعہ میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے پیارے لال آشوب کو بلا کر ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ آشوب نے کہا کہ آپ کہہ یہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو زبان اردو میں عالم عمر کی حیثیت رکھتا ہے، اسے بلا کر پوچھ لینا چاہیے۔ چنانچہ آزاد بلائے گئے اور ان سے معلوم کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ لفظ ”ایجاد“ مذکور ہے اور جب ان سے اس کی سند مانگی گئی تو انھوں نے سودا کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ہائے کیس بھڑوے کا ایجاد ہے
نسخہ میں معجون زرنبا د ہے

اس طرح اپنے محکمے کے اعلیٰ ترین افسر تک ان کی رسائی ہو گئی اور ایک معمولی ما واقف قرار واقعی ترقیوں کا پیش خیمہ بن گیا۔

میجر فلر کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد آزاد کو مدارس کے نصاب کے لیے اردو اور فارسی کی درسی کتابیں مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی گئی۔ بعد ازاں اگست ۱۸۶۹ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ لیکن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر (Dr. Lightner) سے جو ان کے پرانے رفیق تھے، زیادہ عرصے تک ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ کالج کی ملازمت سے ترک تعلق کر کے پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۰ء تک ماہور رہے۔

سررشتہ تعلیم پنجاب کی ملازمت آزاد کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں سے ان کے عہد ساز ادبی کارناموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈاکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں آزاد نے کرنل صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جائے جو اردو شاعری کو بالذات آمیزی اور تصنع سے پاک کر کے اس میں حقیقت اور فطری سادگی کا رنگ پیدا کر دے۔ کرنل ہالرائڈ کو آزاد کی یہ رائے پسند آئی چنانچہ انجمن کی طرف سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے میں آزاد نے ”نظم اور کلام موزوں“ کے عنوان پر ایک تقریر کی۔ ان کی اس تقریر کی نقلیں مختلف ریاستوں کے تعلیمی محکموں کو ارسال کی گئیں۔ اور درخواست کی گئی کہ وہ اس

لے وحید قریشی، یونیورسٹی اور نیشنل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ سے

آواز کو مختلف مدارس تک پہنچائیں، تاکہ ایک نئی طرح کی شاعری کی بنیاد پڑ سکے۔ یہ مشاعرہ مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ بقول حالیؒ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دردِ بے‌بست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے! لکھئے

۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جلی کے موقع پر آزاد کو ان کی گران قدر علمی و ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، یہ پہلا اعزاز تھا جو انگریزی حکومت کی طرف سے کسی ہندوستانی شاعر و ادیب کو عطا کیا گیا تھا۔ عمر کے آخری مراحل میں آزاد پر کچھ جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد وہ کسی کام کے لائق نہیں رہے تھے، لیکن آغا محمد باقر کے بقول ”ان ایام وارفنگی میں بھی وہ پورے لہنگا کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے سیکڑوں ہی رسائل تصنیف کیے اور ان کے مسودات بڑی جزم و احتیاط سے لکھے! لکھئے اسی حالت جنون میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

تاریخ ادب اردو میں محمد حسین آزاد ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان سے قبل اردو ادب خیال آرائی، مبالغہ آمیزی، تکلفات و تصنعیات اور دماغی و دزشتوں کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا، اسے نہ حقیقت و واقعیت سے کوئی سروکار تھا اور انسانی زندگی کے مسائل سے آزاد نے اسے افادیت و مقصدیت سے ہم آہنگ کیا اور انسانی زندگی کے متنوع و گوناگون مسائل سے روشناس کرایا۔

انجمن پنجاب کے زیر سرپرستی جدید شاعری کی اس تحریک نے جس میں آزاد اڑھالی کو روح رواں اور سالار کارواں کی حیثیت حاصل تھی، اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی۔ ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کی طرف پیش رفت کے سلسلے کا یہ پہلا اقدام تھا، جو تاریخ ساز ثابت ہوا۔ اور جسکی بدولت آزاد کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

لکھئے جہاں بانو بیگم نقوی، محمد حسین آزاد ص ۱۹ لکھئے بحوالہ سیر للخصفین جلد دوم ص ۱۶۷

لکھئے مقالات مولانا محمد حسین آزاد جلد اول ص ۷

تصنیفات۔ آزاد کے تصنیفی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں جو کتابیں علمی و ادبی حیثیت سے اہم ہیں وہ اس قدر مشہور ہو چکی ہیں کہ ان کا تفصیلی تعارف توضیح اوقات کے مترادف ہوگا، اس لیے صرف نام شماری پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) آب حیات	(۱۰) قصص ہند	(۱۹) شہزادہ ابراہیم کی کہانی
(۲) سخن دان فارس	(۱۱) قندپارس	(۲۰) حکایات آزاد
(۳) نگارستان فارس	(۱۲) آموزگارپارس	(۲۱) سپاک و ناک
(۴) دربار اکبری	(۱۳) اردو ریڈیں (قدیم) تین حصے	(۲۲) فلسفہ الہیات
(۵) نیرنگ خیال	(۱۴) اردو ریڈیں (جدید) دو حصے	(۲۳) جانورستان
(۶) ڈرامہ اکبر	(۱۵) فارسی ریڈیں، دو حصے	(۲۴) سیر ایران
(۷) خم کدہ آزاد	(۱۶) جامع القواعد	(۲۵) مکاشفات آزاد
(۸) مجموعہ نظم آزاد	(۱۷) قواعد فارسی	(۲۶) مکتوبات آزاد
(۹) نصیحت کا کرن پھول	(۱۸) تذکرہ علمائے کائنات عرب	(۲۷) بیاض آزاد

غیر مطبوعہ۔ (۲۸) تاریخی مقامات (۲۹) ترکی قواعد (۳۰) عربی قواعد۔ اس کے علاوہ عالم جنوں کی بہت ساری یادگاریں بھی ان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہیں۔ انھوں نے ذوق کے دیوان کی ترتیب و تدوین بھی کی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد:

نذیر احمد دلی کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے اور علی گڑھ تحریک سے بھی ان کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ ان دونوں اداروں کا ان کی شخصیت کی تعمیر و تہذیب میں بڑا حصہ ہے۔ دلی کالج سے ان کی وابستگی زندگی کے ابتدائی حصے میں رہی جس نے انھیں حب الوطنی اور آداب زندگی سکھائے۔ کالج کے اس احسان کا انھوں نے بہ بانگ دہلی اعتراف کیا ہے۔ اور جہاں تک علی گڑھ تحریک کا سوال ہے تو نہ صرف یہ کہ اس تحریک سے کچھ سیکھا بلکہ ان کی کوششوں نے اس تحریک کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں مسیحا نفسی کا کام کیا۔

نزیر احمد کے سبھی سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی ولادت ۱۸۳۶ء میں ہوئی لیکن اشفاق احمد اعظمی نے اپنے تحقیقی مقالے "نزیر احمد شخصیت اور کارنامے" میں "فاز" مبتلا کے حوالے سے لکھا ہے کہ "نزیر احمد ۱۸۳۱ء میں اپنے ننہال موضع ریہڑ (پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے" چار سال تک وہ اپنے والد کے ساتھ ننہال ہی میں رہے۔ اس کے بعد ان کے والد مولوی سعادت علی آپ کو اپنے ہم راہ بجنور لے آئے۔ چونکہ مولوی سعادت علی عربی و فارسی کے جید عالم تھے اس لیے آپ کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے زیر نگرانی شروع ہوئی۔ اس کے بعد نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر سے عربی، منطق اور فلسفہ کی تحصیل کی۔ پھر دلی آئے اور مولوی عبد الخالق اورنگ آبادی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۵ء میں وہ دلی کالج میں داخل ہوئے۔ دلی کالج میں ان کے داخلے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز جبکہ کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ ہو رہا تھا یہ بھی اتفاقاً ادھر جانکے اور تماشائیوں میں شامل ہو گئے، چوں کہ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی اس لیے بھڑ بھڑ میں خود کو سنبھال نہ سکے اور گر کر زخمی ہو گئے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر نے انھیں گرا ہوا دیکھ کر اٹھالیا اور پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ابو الفضل اور شرح ملاحیے کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے حسب ایام مفتی صدر الدین آزر دہ نے ان کا امتحان لیا، وہ ان کے جوابات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس طرح یہ دلی کالج میں داخلے کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ نزیر احمد ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے شفقت پوری سے محروم ہو گئے۔

کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نزیر احمد گجرات کے ایک اسکول میں چالیس روپے ماہانہ مشاہرہ پر مدرس مقرر ہو گئے۔ دو سال کے بعد مدھی چھوڑ کر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں وہاں سے ان کا تبادلہ الہ آباد ہوا۔ الہ آباد کے قیام کے زمانے ہی میں انھوں نے انگریزی سیکھی۔ اور اس میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ حکومت نے تعزیرات ہند کے اردو ترجمے کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ نزیر احمد نے اس کام کو اس قدر

ملہزہ انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچایا کہ اس کے صلے میں لفٹننٹ گورنر نے آپ کو کلن پور تحصیل دار بنایا۔ اسی ملازمت کے دوران آپ نے "انکم ٹیکس" اور "ضابطہ فوجداری" کے اردو ترجمے کیے۔ ۱۸۶۴ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر ترقی پائی۔ اس وقت تک آپ کی شہرت آسمان کی بلندیاں چھونے لگی تھی۔

جب نذیر احمد نے سرکاری ملازمت سے نیشن لی تو سالار جنگ اول نے انھیں حیدرآباد بلایا وہاں مولانا اپنی قابلیت اور محنت و جانفشانی کی بدولت برابر ترقی کے مدارج طے کرتے گئے، حتیٰ کہ سترہ سو روپیے ماہانہ تنخواہ پانے لگے اور بورڈ آف ریونیو کے رکن نام زد ہو گئے۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد آپ نیشن لے کر دلی چلے آئے اور خود کو ہمہ وقت علمی و ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔

نذیر احمد کی علمی خدمات کی حکومت کی طرف سے کافی قدر افزائی ہوئی۔ ان کی متعدد کتابیں درسی نقطہ نظر سے قابل تعریف قرار دے کر داخل نصاب کی گئیں اور انھیں نقد العامت سے نوازا گیا۔ ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو وہ شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۳ اپریل ۱۹۰۲ء کو ان کے دوست سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی تحریک پر ایڈنبرا یونیورسٹی نے انھیں۔ ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل۔ کی۔ اعزازی ڈگری عطا کی۔ عمر کے آخری ایام میں مولانا کی عمر بیش تر خراب رہنے لگی تھی۔ چلتے چلاتے بھارت نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اسی عالم میں ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔

اردو ادب کی تاریخ میں نذیر احمد ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ناول نگاری کی ابتدا اور اس کے فروغ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اردو میں ناول اپنی موجودہ شکل میں انگریزی ادب کے زیر اثر رائج ہوا، اور اس صنف کو سب سے پہلے اہل اردو سے روشناس کرانے کا فخر نذیر احمد کو حاصل ہے۔ برسرِ اوردان کے رفقا نے جب اردو ادب اور مسلم معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو نذیر احمد نے بھی اس مقصد کے حصول میں ان

۱۔ اشفاق احمد، نذیر احمد شخصیت اور کارنامے ص ۲۳

۲۳ ص

۲۳ ایضاً

کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے جادو ٹوٹنے، دیوپری اور عشق و محبت کے خارق العادات اور غیر العقول افسانوں کو مخرب اخلاق اور مذہب سے لاتعلق سمجھ کر ایسے اخلاقی اور اصلاحی قصے لکھنا شروع کیے، جو انسانی زندگی سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ اسے سنوارنے اور ایک صلح معاشرہ تشکیل دینے میں مدد ثابت ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کوشش ۱۸۶۹ء میں "مرآة العروس" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ ناول خاص طور سے لڑکیوں کے لیے لکھا گیا تھا۔ مذہب چوں کہ نذیر احمد کی سرشت میں داخل تھا اس لیے ان کے قصوں میں مذہبی عنصر کافی نمایاں ہے۔ انھوں نے معاشرے کی اصلاح اور مذہبی خیالات و افکار کی تبلیغ کو بہر حال دوسرے تمام مقاصد پر مقدم رکھا ہے۔ لیکن اس خشک میدان میں بھی زور بیان کے ذریعے قاری کی توجہ اپنے مطمح نظر کی طرف مبذول کر لینے میں انھیں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں نے ان میں متعدد عیوب گننے ہیں، مثلاً "نذیر احمد کے کرداروں میں ارتقا نہیں ہوتا وہ سب کے سب بنے بنائے ہیں، کسی کا اثر قبول نہیں کرتے بلکہ اسی قسم کے کچھ اور نکالیں بھی ہیں جن کی طرف ڈاکٹر موصوف نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ مولانا کی تصانیف ہی پر موقوف نہیں، ادب کی ہر صنف کی ابتدائی تخلیقات میں بعض خامیوں کی موجودگی ایک فطری امر ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں نذیر احمد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ایک اچھے ناولسٹ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس صنف کے مردج اور بانی کی حیثیت سے ہے۔ ان کا یہ شرف کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی اور متعدد ناول لکھ کر نہ صرف یہ کہ ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا، بلکہ اردو کے ادیبوں کو ایک شعور عطا کیا، اور ایک ایسی شاہراہ تیار کر دی جس پر چل کر بعد کے ادیبوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیے، اور ناول کا رواج عام ہوا۔ یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ اردو کے داستان نویس اور افسانہ نگار حواکاش اند پاتال میں بسنے والے دیوؤں اور پرپیوں کے بعید از عقل اور لاجینی قصے سننے کے عادی تھے اسی کرہ ارض پر رواں دواں بنی نوع انسان خصوصاً محنت

کثوں اور مزدوروں کے مسائل کے متعلق باتیں کرنے لگے ہیں۔ اور غیبی طاقتوں کے ذریعے مشکلات کے حل اور کامیابی کے حصول کی روایات اپنی قوت بازو پر اعتماد اور حسن عمل کی ترغیب جیسے صالح رجحانات کے لیے جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔

نذیر احمد نے چھوٹی بڑی متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں ان کے اہم کارناموں میں شمار کی جاتی ہیں:-

مذہب:-

(۱) ترجمہ قرآن (۲) الحقوق والفرائن (تین حصے مصنف ۱۹۰۶ء) (۳) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن کی تمام دعائیں یکجا ہیں۔ (۴) لمہات الامم۔ حضور اکرم کی ازواج مطہرات کے حالات (۵) الایمان (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

ناول:-

(۴) مرآة العروس۔ اس کا ذکر پچھلے صفحے میں آچکا ہے۔

(۵) بنات النعش۔ (مرآة العروس کا دوسرا حصہ) اس میں بڑگیوں کو دست کاری اور عملی زندگی کی ترغیب دی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

(۸) توبیۃ النصوص۔ یہ اسلامی تعلیم پر مشتمل ہے، جس پر مولانا کو ایک ہزار روپیے انعام ملے تھے۔ یہ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔

(۹) محسنات یا فسانہ مبتلا۔ مطبوعہ ۱۸۸۵ء۔ اس میں مولانا نے اپنے حالات بھی درج کیے ہیں۔

(۱۰) ابن الوقت۔ غدر کے زمانے کے حالات کے پہلو پہلو انگریزی، ہندوستانی اور اسلامی معاشرے کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔

(۱۱) رویائے صادقہ۔ دلی کے ایک قدیم اور شریف خاندان کی زندگی کے حالات افسانوی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۲) ایامی۔ اس کتاب میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت اور اس کے فوائد سے بحث کی گئی ہے۔

متفرق:-

(۱۳) منتخب الحکایات (۱۴) چند نپدا (۱۵) موغظ حنہ۔ یہ تینوں کتابیں اخلاق سے متعلق ہیں۔

(۱۶) مبادی الحکمت - یہ کتاب علم منطق سے متعلق ہے۔ جس میں علم منطق کی تعلیم کا جدید اور دلچسپ طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

(۱۷) سموات - یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس پر حکومت نے ایک ہزار روپیے کا انعام دیا تھا۔ علم ہیئت سے متعلق یہ کتاب پہلی بار ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۱۸) مانیفیک فی حرف (۱۹) حرف صغیر - یہ دونوں قواعد سے متعلق ہیں۔

(۲۰) رسم الخط (۲۱) نصاب خسرو (۲۲) فسانہ قدس (۲۳) نظمیں نظر انکساروں کا مجموعہ۔

ان کتابوں کے علاوہ ان کی تقریروں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

رائے بہادر پیارے لال آشوب

پیارے لال آشوب ۱۸۳۸ء میں بمقام دلی پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے مشہور گھرانے سے ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم کی۔ ان کے والدین نے ان کو لکھنؤ کے گورنمنٹ کالج میں داخل کیا۔ وہاں سے فراغت کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۸۵۶ء میں بریلی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے ایک سال بعد گڑ گاؤں میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوا۔ پھر دلی نائٹل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔ ۱۸۶۸ء کے اواخر میں وہ لاہور بک ڈپوٹ کے ہیڈ ماسٹر (مسٹریٹ) کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں جب پنجاب بک ڈپوٹم ہوا اور ہندوستانیوں کو انکوائری انسپکٹری کا عہدہ دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو آشوب پنجاب میں عہدے پر فائز ہوئے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہ کچھ روز مسلمانانہ تعلیم پر توجہ دیا۔ میجر فارڈاؤر کٹر سررشتہ تعلیم ان سے بہت توجہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس آکر ان سے تعلیم لے کر آکر تھے اور اس کے جواب کے لیے وہ آشوب سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان کے

۱۔ تنہا سیر المصنفین جلد دوم ص ۱۶۱

۲۔ ایضاً ص ۱۶۱

۱۸۹۵ء میں سرکاری ملازمت سے پینشن لی۔

ناریل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے دہلی میں آشوب کا قیام ان کے سفر زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں ۲۸ جولائی ۱۸۹۵ء کو کٹر دہلی کرنل ہیلٹن نے "دہلی سوسائٹی" کی داغ بیل ڈالی۔ یہ ایک فعال علمی و ادبی انجمن تھی جس کا مقصد لوگوں میں ادبیات، تاریخ، آثار قدیمہ، سکھ شناسی اور ادب لطیف کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ آشوب نے چونکہ اس سوسائٹی کی تشکیل میں غیر معمولی دل چسپی لی تھی، اس لیے وہ اس کے پہلے سکرٹری مقرر ہوئے اور جب تک دہلی میں رہے برابر اس عہدے پر فائز رہے۔ اور سوسائٹی کا پرچہ بھی ان ہی کی ادارت میں چھپتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں وہ لاہور تک ڈپو کے کیوریئر مقرر ہوئے، تو انھوں نے سکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔

دہلی کے شعرا و ادبا اور ارباب علم و فضل سے آشوب کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور غالب کے تو وہ منظور نظر ہی تھے۔ مرزا غالب کو ان سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے لگایا جاسکتا ہے، جسے مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں نقل کیا جا رہا ہے۔

"۱۸۹۶ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ڈونلڈ میکلوڈ نے دہلی میں دربار منعقد کیا تو اس میں غالب بھی شریک ہوئے لیکن ضعیفی کے باعث سہارے کے بغیر چل پھر نہ سکتے تھے۔ رائے بہادر پیارے لال بھی دربار میں شریک تھے۔ غالب لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کے لیے اٹھے تو رائے بہادر سہارا دینے کے لیے ان کے ہمراہ ہو گئے۔ صاحب نے پوچھا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے؟ غالب نے جواب دیا، نہیں، مگر بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔"

آشوب کو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر بڑی اچھی دست رس تھی۔ انھوں نے بالواسطہ اور براہ راست اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ حالی، آزاد

۱۔ سخن لال، نوائے ادب، مئی اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۰

۲۔ "دہلی سوسائٹی" اور آشوب کی سرگرمیوں کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جو تھا باب بہ عنوان "دہلی سوسائٹی"

۳۔ خطوط غالب ص ۵۶۶

اموجان ولی، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، منشی درگا پشادا، مولوی سید احمد صاحب مصنف
 ”فرنگ اصفیہ“ اور مرزا ارشد گوڑ گاؤی وغیرہ کو انھوں نے ہی لاہور بلا کر لاہور بک ڈپو میں
 ملازمت دلوائی، جس کے نتیجے میں اردو زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ ان لوگوں کی انتھک
 کوششوں سے پنجاب میں اردو کی ترویج و ترقی میں بڑی مدد ملی۔ آشوب ان لوگوں میں سے
 تھے، جن پر مولانا حالی اور آزاد کو فخر تھا۔ ان کا دوسرا بڑا کامہ اردو ادب میں انگریزی افکار و
 خیالات کی اشاعت ہے۔ اردو میں جدید شاعری کی بنیاد انھیں کی ترغیب و تشویق سے پڑی۔ رام
 بابو سکینہ کے الفاظ میں ”آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ
 کی شاعری اختیار کی اور انھوں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کے دیں تاکہ وہ ان
 کو اردو کا جامہ پہنائیں۔“

آشوب کی علمی و ادبی خدمات کی گورنمنٹ کی طرف سے شایان شان قدر افزائی ہوئی۔ ۱۸۹۲ء
 میں انھیں رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا، غالباً اسی سال وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔
 ۱۹۱۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو وہ ایک کامیاب استاد، لایق مترجم و ادیب، دیدہ و ورخ
 قوم اور دردمند خادمِ خلق کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت کی تمام منزلیں سر کر چکے تھے۔ آشوب
 کی تصانیف میں ”تالیق پنجاب“ میں شائع شدہ متعدد مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں
 قابل ذکر ہیں:-

(۱) قصص ہند۔ (دو حصوں میں) اس سلسلے کی دو کتابیں مولانا محمد حسین آزاد نے بھی مرتب
 کی تھیں۔

(۲) رسوم ہند۔ اس کتاب کے ابتدائی تین ابواب آشوب کے لکھے ہوئے ہیں۔ تکمیل شمس العلام
 مولوی ضیاء الدین نے کی۔

(۳) تاریخ انگلستان۔ یہ دونوں کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔
 (۴) دربار قیصری۔

خان بہادر میر ناصر علی:

لہ تاریخ ادب اردو حصہ ۲ نمبر ص ۷۸

میرزا علی دلی کالج کے ایسے طالب علم ہیں، جن کی شہرت و مقبولیت محض مضمون نگاری اور صحافت کی رہن منت ہے۔ ان کی کوئی مستقل تصانیف نہیں، پھر بھی اردو کے خادموں میں انھیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

میر صاحب ۱۸۲۷ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سید نام الدین محمد البوا ^{منصور} بلند پایہ عالم اور مبلغ تھے۔ بڑے بھائی میر نصرت علی "نصرت الاخبار" کے مدیر اور مالک تھے۔ ان کے دادا اور تانا ریاست بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

نام علی نے دستور زمانہ کے مطابق متداول علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد بزرگوں کی مخالفت کے باوجود انگریزی پڑھنا شروع کی اور ۱۸۴۷ء میں دلی کالج سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا، جس میں وہ اول آئے۔ امتحان میں کامیابی کے فوراً بعد وہ نان پارہ ضلع بہرائچ کے سرکاری اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔ بعد میں ان کی خدمات نمک کے محکمے میں منتقل کر دی گئیں۔ اس ملازمت کے دوران مسلسل سولہ سال تک وہ فرخ نگر (ضلع گڑگانو) کی میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بھی رہے۔ اور انسداد قحط سالی اور دوسری مختلف النوع خدمات کے صلے میں وہ ۱۸۹۷ء میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں محکمہ نمک سے نشانی لی۔ اس کے بعد تین سال تک دلی میں انری میجسٹریٹ کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۱۳ء میں ریاست پانڈی کے دیوان (چیف منسٹر) مقرر ہوئے اور ۱۹۲۲ء تک اس معزز عہدے پر فائز رہے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد عمر کے باقی ایام دلی میں گزارے۔ چھبیس برس کی عمر میں ۱۲ جنوری ۱۹۳۳ء کو دلی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

میرزا علی کا میدان صرف صحافت رہا ہے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے ہوا۔ ابتدا میں ان کے مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ اس کے بعد ۱۸۷۴ء میں انھوں نے آگرہ سے "تیرہویں صدی" کے نام سے اپنا ایک رسالہ نکالا۔ اس زمانے میں سر سید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے افہام و تفہیم اور تاویلات و توجیہات کی ایک نئی روایت قائم

۱۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ص ۷۱،

۲۔ انصار نامری، نقوش لاہور شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء ص ۹۰

کرنے میں مصروف تھے۔ میر صاحب نے اس رسالے میں ان کے مضامین پر انتقاد کا سلسلہ شروع کیا، جو بہت مقبول ہوا۔ ان کے پوتے انصار نامری کے بقول ”سر سید احمد خاں کے شن سے میر صاحب کو کوئی تعرض نہ تھا، وہ محض ان کے علمی و ادبی کارناموں پر سخن گسترانہ تنقید کرتے تھے اور اس طرح داد سخن دیتے تھے کہ سر سید علیا جرمہ ہمیشہ انھیں ناصح شفیق کہتے رہے“ لے

”تیرھویں صدی“ چار پانچ سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد میر صاحب نے اگرہی سے ”زمانہ“ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ لیکن یہ بھی چار پانچ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ ”افسانہ ایام“ میر صاحب کے اہتمام اور ادارت میں شائع ہونے والا تیسرا رسالہ تھا جو انھوں نے اپنے بھائی میر نصرت علی کے ”نصرت المطالع“ دہلی سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بند ہونے کے کچھ عرصے بعد اسی مطبع سے رسالہ ”نامری“ کا اجراء عمل میں آیا۔ اس رسالے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ”صلائے عام“ کے ساتھ میر صاحب کی صحافت نگاری کا آخری اور تابناک ترین دور شروع ہونا ہے۔ یہ رسالہ وہ اپنے ذاتی پریس ”مطبع نامری“ سے نکالتے تھے۔ ”صلائے عام“ کو ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، حتیٰ کہ میر نامری علی اور ”صلائے عام“ اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے کہ آج بھی ایک کا نام آتے ہی دوسرے کا نام ذہن میں قیام کرنے لگتا ہے۔ یہ رسالہ آج بھی شائع ہوتا رہا۔

میر نامری علی کی تحریریں عموماً نہایت شگفتہ، رنگین اور مدلل ہوتی تھیں۔ ان میں شاعرانہ اور جس ہدایت کو مولانا عبدالحکیم شرر نے اپنایا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک نفاذ دیا۔ ان کی حیثیت عطا کی، اس کی ایجاد کا بہادر اصل میر نامری علی کے سر ہے۔ مہدی افادہ نامری میں ”یونانیوں کی سی لطافت خیال“ کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے اصل آپ کے اس وقت انشا پر دازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لے سکتے، آپ کا ادنی مذاق اور خاص طرح کا مادہ اختراعی دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ لے

لے انصار نامری، نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء ص ۹۱

لے افادات مہدی ص ۱۵۵

مختصر یہ کہ سید وقار عظیم کے الفاظ میں "ان (میر صاحب) کی عبارتیں جہاں ایک طرف آزاد کی طرح رنگین و مسرت افزا ہیں وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلل بھی، لیکن ان باتوں کے باوجود بھی بات کو آسان سے آسان زبان میں پیش کرتے ہیں اس طرح کہ حسن بھی برقرار رہے اور علمیت میں بھی کمی نہ آئے۔" ۱۹۵۵ء میں نامر علی کے منتخب مضامین و مقالات کا ایک مجموعہ "مقالات نامری" کے نام سے زیر تربیت تھا۔ یہ مجموعہ ان کے پوتے انصار نامری اشاعت کے لیے مرتب کر رہے تھے۔ فی الحال ہم اس کام کی تکمیل یا عدم تکمیل کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

مولوی شیخ ضیاء الدین:

ضیاء الدین کے والد کا نام محمد بخش تھا، جو بسنی پور سے ترک سکونت کر کے دلی میں بس گئے تھے۔ ضیاء الدین کی پیدائش دلی میں ہوئی اور انھوں نے دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک الحلی اور مفتی صدر الدین آزر دہ سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ دلی نارمل اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں دلی کالج میں عربی کے اسٹنٹ پروفیسر اور بعد ازاں پروفیسر بنائے گئے۔ دلی کالج ٹوٹنے کے بعد ۱۸۶۷ء میں اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر (دہلی) مقرر ہوئے۔ اس دوران انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا گیا۔ عربی کے علاوہ وہ فارسی اور اردو میں بھی کمال رکھتے تھے۔ علم طبیعیات سے انھیں خاص شغف تھا۔ منشی، فاضل اور مولوی فاضل امتحانات کے ممتحن مقرر ہوتے رہے۔ پنشن لے کر جامع مسجد کے نزدیک چاہ رہٹ میں سکونت اختیار کی۔ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے اور سرزمین مکہ ہی میں ۱۳۲۶ھ (۱۹۱۱ء) میں انھوں نے وفات پائی۔ دلی جیسے علمی و ادبی شہر میں اپنے علم و اتقا کی بدولت انھوں نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ جولائی ۱۸۶۵ء میں جب دہلی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پہلے ہی جلسے میں

۱۔ نوالہ "نفوش" لاہور شخصیت نمبر ص ۱۰۱

۲۔ ایضاً ص ۱۰۲

۳۔ پرواز اصلاحی، مفتی صدر الدین آزر دہ ص ۱۲۳

۴۔ ایضاً ص ۱۲۷۔ ۵۔ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات ص ۲۱۲

انھیں نہ صرف اس کارکن بلکہ مجلس منتظمہ کا ممبر بھی منتخب کیا گیا، اس وقت یہ دلی کالج میں اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ موصوف کے علمی مرتبے اور معاشرتی حیثیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ غالب کے مقدمہ "ازالہ حیثیت عرفی" میں بہ حیثیت گواہ پیش ہوئے، تو حاکم عدالت نے کسی شخص کی اس تحریک پر کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیے" انھیں غالب کے مقابلے میں کرسی پر بیٹھایا۔ اڈمبر ایونیورسٹی نے انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی، جو ان کی فضیلت علمی کے اعتراف کا ایک اور ثبوت ہے۔ حسب ذیل تصانیف انھی کے رسومات قلم کی رہیں منت ہیں۔

(۱) النشائے اردو۔ (حصہ اول دوم) یہ کتاب انگریزی فوج کے افسروں کو اردو سکھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔

(۲) معرفۃ العلمہ اور مدارس۔ یہ کچھری کے اہل کاروں کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔
(۳) محزن الطبیعات۔ (دو حصوں میں) ضیاء الدین نے میجر فلر کی فرمائش پر ترتیب دی جسے ۱۸۶۵ء میں شائع کیا گیا۔

(۴) رسوم ہند۔ یہ کئی حصوں میں تھی لیکن اب اس کا ایک ہی حصہ دستیاب ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب آشوب کے لکھے ہوئے ہیں۔
(۵) منتخبات اردو۔ یہ انگریز طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی۔
(۶) مفتاح الارض۔ اس کے موضوع کا پتا نہیں چل سکا۔

موتی لال دہلوی :-

کریم الدین کے اس بیان سے کہ "مراوس کی سنہ ۱۸۲۷ء میں قریب ۱۹ برس کی تھی۔"

ابو غالب نے دسمبر ۱۸۶۷ء میں "مقاطع قاطع" کے مصنف مولوی امین الدین کے خلاف مقدمہ لڑا اور اس میں

نے اس مقدمے میں غالب کے خلاف اور مولوی امین الدین کے حق میں شہادت دی تھی۔

۱۔ بحوالہ احوال غالب از مختار الدین ص ۱۲۱

۲۔ بحوالہ خطوط غالب مرتبہ فلام رسول مہر ص ۶۱۰

۳۔ طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۷

موتی لال کی ولادت کا زمانہ ۱۸۳۸ء کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ ان کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک خاندان سے تھا۔ زمانہ طالب علمی میں یہ کالج کے ممتاز طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے اور سنیر اسکالرشپ پانے والوں میں شامل تھے۔ وظیفے کی توسیع کے لیے ان کی درخواست پر متعلقہ محکمے کی طرف سے یہ نوٹ لکھ کر ان کی استعداد علمی اور کارگزاری کی تصدیق اور منظوری کی سفارش کی گئی تھی۔

"وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے۔ کیوں کہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنی فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور سالوں کے اڈٹ (مرتب) کرنے میں صرف کرتا ہے۔"

جیسا کہ مندرجہ بالا نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے، موتی لال نے طالب علمی کے دوران ہی انگریزی زبان اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کے کام میں غیر معمولی مہارت پیدا کر لی تھی، چنانچہ تعلیم سے فراغت کے بعد بہ تدریج ترقی کے منازل طے کرتے گئے۔ سب سے پہلے ۱۸۵۰ء میں انھیں لاہور میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کا فارسی مترجم مقرر کیا گیا۔ بعد میں وہ اکسٹرا جوڈیشل مجسٹریٹ اور پھر ڈسٹرکٹ جج ہو گئے۔ اسی عہدے سے پینشن لینے کے بعد انھوں نے گجرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

موتی لال تا عمر ایسے عہدوں پر فائز رہے، جن کی مصروفیات بالعموم تالیف و تصنیف کے مشاغل جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود انھوں نے اس دوران اپنے اس ذوق کو جو زمانہ طالب علمی ہی میں پروان چڑھ چکا تھا، بڑی حد تک برقرار رکھا اور کئی رسالے تصنیف اور ترجمہ کیے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے "تذکرہ ہندو شعرا" مرتب کیا تھا، جو بہت مشہور ہوا۔ بعد میں مسعریزم کے موضوع پر دو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔ ان میں سے ایک "علم منالہ" تھی، جو فیلپ کی کتاب کا ترجمہ تھی۔ دوسری کتاب کا نام "مرایا و مناظر" تھا۔ برٹل کی کتاب سے ترجمہ کی گئی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب اور بھی لکھی تھی جس کا نام "تذکرہ مسعود" ہے۔ یہ بھی کتابیں دلی ٹرانس لیٹن سوسائٹی نے شائع کی ہیں۔

لے بحوالہ ترجمہ دہلی کالج ص ۱۶۵

”ریشم کا کپڑا“ کے نام سے صنعت و حرفت کے موضوع سے متعلق ان کی ایک اور کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ نثر نگاری کے علاوہ موتی لال کو شعر گوئی سے بھی شغف تھا۔ شاعر کی حیثیت سے وہ بسمل تخلص کرتے تھے۔

پنڈت دھرم ناراین :

پنڈت دھرم ناراین پنڈت لشن ناراین کے بیٹے تھے۔ یہ کالج کے ذہین اور ہونہار طلبہ میں سے تھے۔ یہ فارسی کے بلند پایہ عالم تھے ساتھ ہی ساتھ اردو اور انگریزی میں بھی کافی دست گاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کی کئی مفید کتابوں کے اردو تراجم کیے ہیں۔ کچھ دن اندور میں میرنشی کے عہدے پر فائز رہے۔ جب دہلی ٹرانس لیشن سوسائٹی قائم ہوئی تو انھوں نے اس کے لیے مل کر انگریزی کتاب پبلیشنگ کوآپریٹو ”کارڈو میں ترجمہ کیا، جس کا نام ”سیاست انتظام مدن“ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن اردو اخبار پریس دہلی سے ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا، اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن سائنٹفک سوسائٹی نے قریب ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔ دھرم ناراین جب دہلی کالج کے طالب علم تھے تو انھوں نے انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کے کام میں کئی مترجموں کی مدد کی تھی اور خود بھی ”تاریخ انگلستان“ کا ترجمہ کیا تھا۔

حکم چند :

حکم چند کے والد کا نام رام دیال تھا۔ وہ ذات کے اہیر تھے اور کھاری میں رہتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ حکم چند دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ اس لیے وہ دہلوی کہلائے۔ ان کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۲ء کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ حکم چند کالج کے ذہین اور قابل طلبہ میں سے تھے۔ کالج کے امتحانات میں ہمیشہ اول درجے میں کامیاب ہوئے اور جب کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات دیئے تو وہاں بھی دہلی کالج کی اپنی شاندار روایات قائم رکھیں۔ غالب کے خاص ارادت مندوں میں سے تھے، چنانچہ ”ازالہ حیثیت عرفی“ کے مقدمے میں ان کے گواہ کی حیثیت سے پیش

لے غالب کے ”ازالہ حیثیت عرفی“ کے مقدمے میں ۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے اپنی عمر ۲۶ برس

بتائی تھی۔ (احوال غالب ص ۱۶۰)

ہوئے تھے۔ جب دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو وہ اس کے باقاعدہ رکن بنے۔ سوسائٹی کے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کے جلسے میں انہوں نے اپنی کتاب "قصہ بہمن" کے دو نسخے سوسائٹی کے کتب خانے کے لیے نذر کیے تھے۔

کالج سے فراغت کے بعد کچھ دنوں وہیں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں امرتسر میں تحصیل دار مقرر ہوئے اور ترقی کر کے اسٹرا اسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر پہنچ گئے۔ ۱۸۸۱ء کے بعد حیدرآباد چلے گئے، جہاں کئی اعلا عہدوں پر سرفراز رہے، آخر میں مجلس وضع قانون کے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ حیدرآباد ہی میں تقریباً ۶۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

حکم چند قانون میں خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ دوران قیام حیدرآباد اس سلسلے کی کئی کتابیں لکھیں، جنہوں نے ان کی شخصیت میں چارچاند لگا دیے۔ ان کتابوں میں "Remarks on the Administration of Law in the Province of the Punjab" نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔

منشی شیوناراین اور پنڈت سروپ ناراین :

یہ دونوں کالج کے ممتاز طلبہ میں سے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دونوں ایک ساتھ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ دونوں فارسی اور انگریزی میں اچھی صلاحیت کے حامل تھے۔ ہم نے ان کا ذکر ایک ساتھ اس لیے کیا ہے کہ ایک ایک کتاب کے علاوہ دونوں کے نام تصنیفی و تالیفی کارنامے باہمی معاونت ہی سے معرض وجود میں آئے ہیں۔ انفرادی طور پر منشی شیوناراین نے "تذکرہ ڈیمپوسٹھنیز" ایک انگریزی کتاب کی بنا پر مرتب کیا اور پنڈت سروپ ناراین نے "تذکرہ سکندر اعظم" لکھا۔ یہ دونوں کتابیں "دلی ٹرانس لیٹن سوسائٹی" نے علی الترتیب ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۷ء میں شائع کی تھیں۔ جو کتابیں ان دونوں نے باہمی اشتراک اور تعاون سے مرتب کیں، ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) خلاصۃ التواریخ حصہ اول (ابتداء آفریش سے حضرت علی کے زمانہ ولادت تک)

"حصہ دوم (حضرت علی کی ولادت سے شاہ شارمین کے عہد تک) یہ دونوں

لے غالب کی کتاب "قاطع برہان" کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے کسی کتاب کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

مارش میں کی کتاب "Brief Survey of History" کا ترجمہ ہیں۔
 (۲) تشریح اور تنظیم علم طبیعی کی۔ یہ ارنوٹ کی "Physics" کا ترجمہ ہے۔
 (۳) جغرافیہ ہند۔ یہ مرے (Murray) کی کتاب "Encyclopaedia of Geography" کا ترجمہ ہے۔

کا ترجمہ ہے
 پتمبر:

پتمبر کا شمار کالج کے ذہین طلبہ میں ہوتا ہے۔ وہ ماسٹر رام چندر کے ہم جماعت اور سنیر اسکالر
 شپ پانے والوں میں شامل تھے۔ ۱۸۴۵ء میں یہ کالج کی طرف سے انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے بھیجے
 گئے اور شاید ہندوستان کے سب سے پہلے سول انجینئر بننے کی تعلیم سے فراغت کے بعد ان کا
 پہلا تقرر دلی ہی میں ہوا تھا۔

پتمبر طالب علمی ہی کے زمانے سے ترجمہ و تالیف کے کام میں دوسرے مصنفین کی مدد کرتے
 رہے۔ انھوں نے نارٹن کی کتاب "Principles of Government" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا،
 جس میں ماسٹر رام چندر بھی ان کے شریک کار تھے۔

مدن گوپال:

مدن گوپال پیارے لال آشوب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ابھی ان کی تعلیم مکمل نہ ہونے پائی
 تھی کہ دلی کالج توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔
 اے۔ پاس کیا۔ پھر الہ آباد ہائی کورٹ سے وکالت کی سند حاصل کی اور دلی میں پریکٹس کرتے لگے۔ شوق
 علم اس کے بعد بھی دل میں موج زن رہا، چنانچہ وکالت چھوڑ کر ولایت چلے گئے اور وہاں سے
 بیرسٹری کی اعلا ڈگری لے کر واپس آئے۔ بعد ازاں لاہور میں وکالت شروع کی اور یہ معمولی
 محنت و تندہی کی وجہ سے جلد ہی شہرت و کامیابی کے اعلا مدارج تک پہنچ گئے۔ علمی کاموں
 کے سلسلے میں مدن گوپال نے پروفیسر جنواں کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا اور قانون کی چند کتابیں
 تصنیف کیں، جن میں "Panjab Tenancy Act" اور "Revenue Act" بہت مشہور ہوئیں۔ لاہور کے زمانہ قیام میں ڈاکٹر لائٹنر سے ان کے بے حد خلصانہ مراسم
 رہے۔

پیرزادہ محمد حسین:

یہی دلی کالج کے ممتاز طالب علموں میں سے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور ترقی کر کے شش زحج کے عہدے تک پہنچے۔ اپنے زمانے میں انھوں نے بڑا نام کمایا۔ ادیب کی حیثیت سے آپ کا سب سے بڑا کلام نامہ ”سفر نامہ ابن بطوطہ“ کا اردو ترجمہ ہے، جو علمی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس ترجمے پر انھوں نے جاہ جا حاشیہ آرائی بھی کی ہے، جس سے ان کی وسعت نظر اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دلی کالج کے دوسرے لائق اور صاحب علم طلبہ میں بھیروں پرشاد، ماہد پٹت من پھول، اکرار ناٹھ، ماسٹر جانکی پرشاد اور چند کشور کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولوی محمد باقر دلی کالج کے معلم تھے نہ حالی متعلم

پروفیسر خواجہ احمد نادر دہلی نے اپنے ایک مضمون میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو بھی دلی کالج کے اساتذہ میں شمار کیا ہے لہٰذا لیکن موصوف کا یہ خیال برسر خلاف واقعہ ہے۔ کیوں کہ دلی کالج سے بحیثیت استاد ان کے تعلق کی کوئی ضعیف شہادت بھی موجود نہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ”مروج دہلی کالج“ میں دلی کالج کے اساتذہ کی جو طویل فہرست دی ہے مولوی محمد باقر کا نام اس میں شامل نہیں اور نہ تو ”قدیم دلی کالج“ میں مالک رام ہی نے ان کا ذکر کیا ہے۔

ہو سکتا ہے مولوی صاحب موصوف اپنے دوست مسٹر ٹیلر سے ملاقات کے لیے یا اپنے بیٹے محمد حسین آزاد سے ملنے کی غرض سے کبھی کبھار دلی کالج جاتے رہے ہوں اور مسٹر ٹیلر انہیں راہ قدر دانی انھیں کسی درجے میں پڑھانے کے لیے بھیج دیتے ہوں کیوں کہ مولوی صاحب اور مسٹر ٹیلر کے درمیان دوستانہ تعلقات کے علاوہ استاد و شاگردی کا رشتہ بھی موجود تھا۔ مسٹر ٹیلر نے ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس سے زیادہ دلی کالج سے ان کے تعلق کی کسی معتبر ذریعے سے ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح سے بعض حضرات کو مولانا حالی کے سلسلے میں بھی یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ دلی کالج کے طالب علم رہے تھے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ دلی کالج کے حالات کے تحت

۱۷ چراغ گزہ ص ۴۱

۱۷-۲۲ لہٰذا ایضاً

رقم طراز ہیں کہ

”دلی کالج سے پڑھ کر مشہور مشہور لوگ نکلے جنہوں نے زبان اردو کی آئندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد، ماٹر پیارے لال آشوب، مولانا آزاد مولانا حالی اور مولوی ذکار اللہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں“ لے

ایک جگہ اور لکھتے ہیں

”دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ (نذیر احمد) دلی کالج میں داخل ہوئے۔۔۔ اس زمانے میں ان کے ہم سبق حالی، آزاد، منشی کریم الدین، مولوی ذکار اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔“

دلی کالج کے نامور طلبہ کی اس فہرست میں حالی کے نام کی شمولیت کہاں تک درست ہے اس کا اندازہ خود حالی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے:-

”دلی پنچ کر جس مدرسے میں مجھے شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔۔۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج (دلی کالج) کو جا کر آنکھ سے نہ دیکھا اور نہ ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے۔“

حالی کا یہ بیان اس دور سے متعلق ہے جب کہ وہ طالب علم کی حیثیت سے دلی میں مقیم تھے اور اس سے بڑھ کر کوئی معتبر شہادت اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ اس زمانے میں انھیں دلی کالج سے کوئی تعلق نہیں رہا حتیٰ کہ اس عرصے میں انھوں نے کبھی کالج کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

لے تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۷۸

لے تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۵۶-۵۵

لے مقالات حالی حصہ اول ص ۲۶۸

مفتی صدرالدین آزرده اور دلی کالج

علم و ادب کی دنیا میں مفتی صدرالدین آزرده کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ وحید
عصر، یکتائے زمانہ اور نادرہ روزگار ہی نہیں بلکہ گم گشتگانِ صراطِ مستقیم کے لیے بحرِ ظلمات میں
روشنی کا مینار بھی تھے۔ وہ اپنے گونا گوں و متنوع ذوق و جستجو کی بدولت نہ صرف دلی کے
ارباب و کمال کے حلقے میں مشہور تھے بلکہ ہندوستان کے اہل علم عام طور پر انھیں سر آنکھوں
پر جگہ دیتے تھے۔ فقہ، حدیث اور دیگر مذہبی علوم و فنون میں فاضلانہ مہارت کے علاوہ
معاصر شعرا میں بھی انھیں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ منزل دور حکومت میں مسند افتا اور انگریزوں
کے عہد میں صدر الصدور کے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ یوں تو آزرده عربی و فارسی میں بھی شعر
کہتے تھے۔ لیکن اردو شعر و سخن میں ان کی استادی مسلم البشوت ہے۔ اردو شعر و ادب کا کوئی مورخ
مفتی صدرالدین سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔

آزرده کے جد اعلیٰ خواجہ بہار الدین خوارزمی فاروقی ابر کے دور حکومت میں دلی آئے۔
اور اس کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے خاندان کا پیشہ تجارت تھا لیکن ان کے خاندان
کے ایک بزرگ مولوی خیر الدین نے آبائی پیشہ چھوڑ کر علمی دنیا میں قدم رکھا۔ آزرده کے والد کا نام لطف اللہ
تھا۔ آزرده ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے، جب کہ دلی کی باگ ڈور ابر شاہ ثانی
کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی تعلیم کی ابتدا ان کے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ اس کے بعد
شاہ عبدالغزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحاق اور مولانا فضل امام خیر آبادی جیسے
مسلم اساتذہ سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ان کے دوستوں میں غالب، شیفتہ اور حسرتی اور
شاگردوں میں سرسید احمد خاں اور مولوی کریم الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ مفتی صاحب کا انتقال
۱۴ جولائی ۱۸۶۸ء پنج شنبہ کو چار بجے دن میں ہوا۔

۱۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء جلد ۶ ص ۵۹

۲۔ عبدالرحمن پروانہ، مفتی صدرالدین آزرده ص ۱۳

۳۔ اکل الاخبار ۲۲ جولائی ۱۸۶۸ء بحوالہ مفتی صدرالدین آزرده ص ۹۶

۱۸۲۷ء کے قریب انگریزوں نے اکرشاہ ثانی کے مشورے کے بعد آزرده کو دلی کا صدرین اعلیٰ مقرر کیا، بعد میں ترقی کر کے صدر الصدور ہو گئے۔ ان کے اہم کارناموں میں سے مدرسہ دارالبتقا کا قیام بھی ہے۔ یہ مدرسہ شاہ جہاں کے عہد میں قائم ہوا تھا۔ اس کی عمارت بعد میں شکستہ ہو گئی تھی اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا، آزرده نے اسے از سر نو تعمیر کرایا اور درس و تدریس کا نظم دوبارہ قائم کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مفتی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس جنگ میں مسالوں کے شامل ہونے کے لیے جامع مسجد دہلی سے جہاد کا ہفتویٰ شائع ہوا تھا اس تاریخی فتوے پر مفتی صاحب کے بھی دستخط تھے یہ

دلی کالج ای سے ہماری زبان و ادب میں مغربی علوم و فنون کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کالج نے ہماری زبان و ثقافت کی ترقی میں بڑا اہم ردل ادا کیا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ملک کے مایہ ناز علما و فضلا کو اس کالج میں ملازم رکھا۔ کالج کے قیام کے وقت کالج کمیٹی صرف چار ارکان پر مشتمل تھی۔ ۱۸۲۲ء میں جب اس کے ارکان میں اضافہ کیا گیا تو مفتی صدرالدین کو، جو اس وقت دلی کے صدرین تھے اس کارکن منتخب کیا گیا۔ آزرده کالج کی فلاح و بہبود میں پیش پیش رہے۔ کالج کے طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے دلی کے شرفاؤ امرانجی طور پر تمغے دیتے تھے۔ مفتی صاحب کا تمغہ اردو میں بہترین مضمون لکھنے والے کو دیا جاتا تھا۔ دہلی اردو اخبار "آزرده کی دریا دلی اور قابلیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”ہم نہایت درست اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارے صدر الصدور صاحب کی ذات مجمع الصفات یعنی نہایت ارفع ہے، یکتائے روزگار ہے۔ اس حکومت و ریاست و عظمت فضل اللہ ولی پر حسن اخلاق اور پاس منعت و قدر علمیت جو کہ نتیجہ کمال علم ہے اس زمانے میں بہت کم ہے۔ ہمارے ہندوستانی صاحبوں میں ایسا جامع کمالات مفقود پایا جاتا ہے۔“

۱۔ انگریزوں کے عہد میں یہ عہدہ خواہ اور منصب کے لحاظ سے نچ کے برابر ہوتا تھا۔

۲۔ عبدالرحمن پرواز، مفتی صدرالدین آزرده ص ۷۷

۳۔ دہلی اردو اخبار، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۳ء، جوالہ مفتی صدرالدین آزرده ص ۲۶

دلی کالج کے انتظامی و تعلیمی امور میں مفتی صاحب کا بڑا دخل تھا۔ مشرقی شعبے میں اساتذہ کی تقرری اور ان کی تنخواہ کے اضافے وغیرہ میں نہ صرف ان کی رائے لی جاتی تھی بلکہ ان کے عندیہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ "نواب حامد علی خاں (متولی) نے مولوی جعفر علی کو سو روپیے ماہوار پر کالج میں ملازم رکھ لیا اور کوشش یہ کی کہ ان کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ مولانا مملوک العلی پندرہ سولہ برس سے کالج میں ملازم تھے، ان کی حق تلفی ہوتی تھی۔ کالج کے ارباب حل و عقد نے مفتی صدر الدین سے اس مسئلے میں رائے طلب کی۔ انھوں نے مولانا مملوک العلی کے علم فضل کو سراہا اور ان کی سفارش کی ہے۔ چنانچہ مولوی جعفر علی صدر مدرس نہیں بنائے گئے۔

آزادہ کالج میں عربی و فارسی کے امتحانات بھی لیتے تھے۔ جب ۱۸۴۴ء میں امتحانات ہوئے تو "مسعودی، تاریخ، یمنی، قدوری، قطبی، حماسہ اور حسنی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور شیخہ طلبہ کی اعلا جماعت کو دیے گئے، ان کے تحریری جواب مفتی صدر الدین نے معائنہ کیے۔۔۔ فارسی جماعت کا امتحان بھی انھوں نے ہی لیا۔" لے

بہر حال آزادہ کی شخصیت اور ان کی کوششوں و کاوشوں سے دلی کالج نے بڑا عروج پایا۔ ان کی ذات بابرکات کی سرپرستی نے کالج میں مشرقی زبان و ادب کی تعلیم و ترقی میں چاند لگایا۔ دلی کالج کے سلسلے میں ان کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

۱۔ مفتی صدر الدین آزادہ ص ۲۷

۲۔ مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۲۵-۲۴

تیسرا باب

سائنس و سوسائٹی

سائٹک سوسائٹی

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا سلسلہ یوں تو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے آتے آتے اس کی حالت چراغِ سحر کی جیسی ہو چکی تھی جس کی فیما پل پل اور لمحہ بہ لمحہ سمٹتی جاتی ہے۔ اربابِ اقتدار خود غرضی اور مفاد پرستی کے شکار اور سازشوں اور خانہ جنگیوں میں مصروف تھے ان کی اس باہمی کشمکش کے نتیجے میں سیاسی و اقتصادی نظام کا شیرازہ روز بروز منتشر تر ہوتا جا رہا تھا۔ عوام کی زندگی سے نہ صرف امن و سکون ختم ہو چکا تھا بلکہ تنگ دستی اور پس ماندگی کے سبب ان کے دل و دماغ ماؤف ہو چکے تھے اور فلاح و بہبود کی تمام راہیں ان کی نظر سے اوجھل ہو کر تاریکیوں میں گم ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا دائرہ برابر وسیع اور اس کی گرفت مسلسل مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ یہ حالات تھے جن میں ملک کے چند بہی خواہوں نے ۱۸۵۷ء میں پرچمِ حریت ہاتھ میں لے کر نعرہٴ انقلاب بلند کیا۔ ملک کی آبرو اور آزادی کے یہ رکھوالے اپنی جان جو کھم میں ڈال کر سر بہ کفن نکلے تھے، لیکن افسوس کہ دیس کے باسیلوں نے ان جاں نثار وطن پرستوں کی کما حقہ معاونت نہ کی۔ چنانچہ انگریز اپنی منظم اور مستحکم فوجی طاقت اور سیاسی حکمتِ عملی کے بل بوتے پر انہیں سپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی یہ جنگ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس جنگ کے بعد مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا ہے۔ اس کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون میں مقید کیا گیا جہاں بعد میں جیل ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ عوام میں سے ہزاروں

افراد بغاوت کے جرم میں تختہ دار پر چڑھا دیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستانیوں کو اشارے اور کنایوں میں بات کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ چونکہ انگریزوں نے غدر کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی تھی اس لیے وہ خاص طور پر ان کی چہرہ دستیوں کے شکار ہوئے۔ ان پر عرصہ حیات اس تک تنگ ہو گیا تھا کہ بہت سے لوگ خود مسلمان کہتے ہوئے ہچکچانے لگے، گویا بقول مولانا محمد قاسم نانوتوی "مسلمان ہونا ہی جرم ہو گیا تھا"۔

غدر ختم ہو گیا تھا لیکن انگریزوں کے انتقامی جذبات کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی مسلمان نہ صرف ایک ایک کر کے سرکاری ملازمتوں سے نکلے جا رہے تھے بلکہ ان پر تعلیم کے دروازے بھی مسدود کیے جانے لگے تھے، حتیٰ کہ مسلمان امرا و نوابین کے اوفات کی آمدنیاں جو صرف مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مخصوص تھیں، دوسرے کاموں میں صرف کی جانے لگی تھیں۔ فوجی اور سول محکموں میں جہاں مسلمانوں کا عمل و دخل بہت زیادہ تھا اب رفتہ رفتہ ان کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔ پنجاب کا سررشتہ تعلیم غدر سے پہلے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، غدر کے بعد وہاں سرکاری مدرسوں میں مسلمان مدرس نام کو نہ رہے اور ۱۸۶۶ء میں بنگال کے کمشنر نے ایک ایسا حکم جاری کیا جس کی رو سے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ "۱۸۶۹ء میں اسٹنٹ انجلیزیوں کے تین درجوں میں ۱۴ ہندو اور مسلمان صفر۔ امیدواروں میں چار ہندو و دو انگریز اور مسلمان صفر... وکالت کے لیے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو لائسنس دیا گیا ان میں ۲۲۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان"۔

حکومت کی اس بے اعتنائی اور نظر اندازی کے باعث مسلمان ہر شعبہ زندگی میں ناقدری اور بے اطمینانی کے ماحول سے دوچار تھے۔ جمیس اوکنیلی نے کلکتہ ریویو میں لکھا تھا کہ

۱۔ بحوالہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات از ڈاکٹر خورشید نعمانی ص ۱۹

۲۔ بحوالہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز از نسیم قریشی ص ۲۱۷

۳۔ بحوالہ اسباب بغاوت ہند، مقدمہ از فوق کریمی ص ۶۹-۶۸

”ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اوقات کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لیے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے۔“

یہ تھے غدر کے طوفان کے تھپیڑے جو مسلمانوں ہی کی کشتی سے ٹکراتے تھے اور اسے زیر و زبر کر رہے تھے۔ یہ شکستہ کشتی اس پر آشوب طوفان میں سچکولے کھا رہی تھی اور اسے کوئی ایسا ناخدا میسر نہیں تھا جو اسے نئی سمتوں اور نئے ساحلوں سے آشنا کرتا اور منزل مقصود تک پہنچاتا۔ اس ابتری کے احساس میں مبتلا حال اور مستقبل سے بے نیاز مسلمانوں کے لیے اپنے شاندار ماضی کے ماتم کے سوا کوئی اور کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مسلمانوں کے برخلاف ہندوؤں میں متعدد ایسی جماعتیں معرض وجود میں آچکی تھیں جو ان کی علمی و معاشرتی اصلاح کے لیے سرگرم تھیں۔ اس ضمن میں راجا رام موہن رائے کی ”برہم سماج“ اور دیانند سرسوتی کی ”آریہ سماج“ کی کوششیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حالات متقاضی تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا راہنما پیدا ہو جو ان میں علمی و معاشرتی میدان میں لغتاً کاشوق اور ولولہ پیدا کرے، تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات سے کماحقہ نہرِ آزما اور عہدہ برآ ہو سکیں۔

ان دنوں سرسید کی شخصیت دوج کے چاند کی طرح نہیں رہ گئی تھی کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا، بلکہ اب وہ ہندوستانی افق پر چودھویں کے چاند کی شکل اختیار کر چکے تھے جس میں یہ اثر ہوتا ہے کہ بھی کے دلوں کو رام کر لیتا ہے۔ سرسید کی مقناطیسی شخصیت سے ہندوستانی مسلمان آشنا ہونے لگے تھے اور ان کی آواز پر ان کے کان بھی کھڑے ہونے لگے تھے۔

سرسید بڑے دور اندیش اور زمانہ شناس تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم خصوصاً جدید تعلیم عام نہ ہوگی، وہ نہ تو زندگی کے اعلا مقاصد سے واقف ہو سکیں گے اور نہ ان کے اندر ملک اور معاشرے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے مطابق تمام اہم مسائل کو بحسن و خوبی حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے گی۔ اس لیے انہوں نے مغربی علوم و فنون کی اشاعت کو انگریزی تعلیم سے بھی زیادہ فروری اور مقدم قرار دیا۔ اس زمانے میں مسلمان انگریزی پڑھنا گناہ

۱۷ بحوالہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امر دوز از نسیم قریشی ص ۲۴-۲۵

کیرہ سمجھتے ہیں اور دوسری قوموں کے لئے بھی اس میں کوئی خاص کشش نہ تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی طرف راغب ہوتیں کیوں کہ تمام عدالتوں میں اردو زبان کا رواج تھا اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ جو اس وقت کسی ہندوستانی کو مل سکتا تھا اس کے لئے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ سرسید مغربی علوم و فنون کی تعلیم کی اشاعت اس لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے حاکم و محکوم یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے نظریات و خیالات میں اتفاق و اتحاد اور یگانگت و قربت پیدا ہوگی جس سے نہ صرف انگریزوں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ہمارے وطن کے بھائی بھی مستفیض ہوں گے ان کا خیال تھا کہ انگریز جیسی طاقت ور قوم سے براہ راست ٹکر لینا ہوا میں ہاتھ پیر مارنے کے مترادف ہوگا۔ انہیں انہی کے ہتھیاروں سے شکست دی جاسکتی ہے، جن سے میں ہو کہ ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۴۳ء میں جب کہ وہ غازی پور میں صدر امین تھے، انہوں نے اپنی ایک تحریر میں جو التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند کے عنوان سے شائع ہوئی تھی لکھا تھا کہ

”دنیا کے اس دور میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔ ایسی بدذخت حالت کے علاج کی راہ نکالنی اور ہمارے ہموطنوں ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا جو نہ ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا، اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا دوسرے انگریزی زبان سے اور اردو زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لئے مفید ہوں۔“

اس کے بعد عملی طور پر انہوں نے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور سوسائٹی

۱۔ بحوالہ سرسید کی صحافت، انڈیا ڈاکٹر اصغر عباس، ص ۵۲

کے قیام کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرانے اور لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے سرسید نے کلکتہ کا سفر بھی کیا اور وہاں ۴ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو "مجلس مذاکرہ علمیہ" میں تقریر کی۔ کلکتہ کی واپسی کے دوران جن مقامات پر ان کا قیام ہوا انہوں نے وہاں کے لوگوں سے سوسائٹی کا ذکر کیا اور اس کے قیام کے لئے ان کی مدد طلب کی۔

کلکتہ سے واپسی کے تین چار مہینے بعد ۹ جنوری ۱۸۶۳ء کو جب کہ سرسید غازی پور ہی میں تھے انہوں نے اپنے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں نے شرکت کی۔ اس کا مقصد سوسائٹی کے قیام کا رویہ عمل لانا اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنا تھا۔ اس جلسے میں سرسید اور ان کے رفقاء کے علاوہ غازی پور کے پولس سپرنٹنڈنٹ لفٹنٹ کرنل گرہم نے بھی جو سرسید کے دوستوں میں تھے سوسائٹی کے قیام کی تائید میں تقریر کی تھی۔ سرسید نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جدید علوم کی اشاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔

اس جلسے میں سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور حاضرین جلسہ کے مشورے سے اسے "سین ٹینفک سوسٹی" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ سوسائٹی کا دستور بھی اسی دن مرتب ہوا جس کے مطابق اس کے دو اہم مقاصد قرار پائے۔

۱) ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے، ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں آوے۔
۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کتاب اور نفیس کتابیں تلاش کر کے بہم پہنچانا اور شائع کرنا۔

۱۲۱ لہ حالی، حیات جاوید حصہ اول ص ۱۲۱

۱۲۲ مولوی عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۴۰

۱۲۳ دستور سین ٹینفک سوسٹی غازی پور ۱۸۶۳ء۔ کوالہ سرسید کی صحافت ص ۵۳، ۲۵۱

زمانہ قیام کی تاریخ

سائٹنگ سوسائٹی کی داغ بیل ۹ جنوری ۱۸۶۲ء کو پڑی۔ دو دراز صوبوں کے معزز ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کی رکنیت قبول کی۔ اس کے پہلے ہی جلسے میں ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

- (۱) پٹرین (نگراں)۔ ڈیوک اوف ارگل
- (۲) وائس پٹرین۔ ڈیمنڈ لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لفٹنٹ گورنر پنجاب
- (۳) سکریٹری۔ سر سید احمد خاں آنریری سکریٹری اور سکریٹری گمراہیم۔ لہ

سوسائٹی کی علی گڑھ منتقلی

۱۸۶۲ء ہی میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ چنانچہ سوسائٹی کے دستور کے مطابق سرسید سوسائٹی کا سارا سامان اور عملہ بھی اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے تھے۔ یہ جب سوسائٹی علی گڑھ منتقل ہوئی تو مسٹر ولیم جنکسن جو اس وقت علی گڑھ میں جج تھے اس کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے ان کے دورِ صدارت میں سوسائٹی نے کافی ترقی کی اور اس کے ارکان میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں سوسائٹی کا دستور از سر نو مرتب کیا گیا، جس کی ایک دفعہ کے مطابق یہ طے پایا کہ سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار نکالا جائے گا اور ایک عجائب خانہ کی بنیاد ڈالی جائے گی جس میں جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کے

لہ بعد میں سرسید سکریٹری منتخب ہوئے۔

لہ سوسائٹی کی دفعہ ۳ میں مرقوم تھا مستقل مقام سوسیٹی کا انجام تو الہ آباد ہوگا۔ مگر جب تک کہ سوسیٹی کوئی نہ چل سکے اس وقت تک ان مقاموں میں ہوگا جہاں جہاں سید احمد خاں صدر الصدور کا قیام ہوتا ہے گا۔ (۱) (یہ کی صحافت ص ۲۵۲)

عجیب عجیب چیزیں جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشہر کیے جائیں گے اس ترمیم شدہ دستور میں ارکان کے لئے دو روپیہ فیس بھی مقرر کی گئی تھی یہ

کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے منصوبے:

سوسائٹی کے قیام کا اصل مقصد جدید علوم و فنون کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ یکم فروری ۱۸۴۳ء کے جلسے میں سرسید رولٹن کی کتاب تاریخ مصر اور مل کی کتاب پولیٹکل اکنامی کے ترجمے کی تجویز منظور کر چکے تھے یہ ۱۲ مارچ ۱۸۴۷ء تک تاریخ مصر کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ ۴ جون ۱۸۴۷ء کے جلسے میں سوسائٹی کی "کونسل مشیر" کے ارکان کی کثرت دوائے سے بالترتیب مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ شروع کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔

(۱) ایک مختصر رسالہ بیان میں یورپ کے علوم و فنون کے جو ماٹھ صاحب کے ترجمانہ علم میں سے ہے، تالیف کیا جائے گا۔

(۲) پہلا دوسرا تیسرا اور چوتھا باب آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی و دن کے بیان میں ہے

(۳) تاریخ ہندوستان مولفہ انفسٹن صاحب

(۴) رسالہ بھاپ کی کلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلیو۔ جے۔ ایم کو رہی کاہین صاحب

(۵) تاریخ جدید ہندوستانی مولفہ مارشمن صاحب

(۶) ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ کا جو کئی انگریزی جغرافیوں سے تالیف کیا جائے گا۔

(۷) رسالہ یورپ کے آلات کیشکاری کے بیان میں

۱۴۰ - ۷۱ -

۵۷ - ۵۸ -

۵۹ - ۶۰ -

- (۸) تاریخ چین زبان فارسی ترجمہ محمد زماں عرف فرنگی خاں، اصل انگریزی مصنفہ ایک پادری کے، جس میں بیان ہے چین کی صورت اور پیداوار یوں اور علوم و فنون اور مذہب اور رسومات سلطنت مورخہ تھیٹی صدی
- (۹) ایک کتاب بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے نام بتاریخ تصنیف اور نام زبان جس میں وہ کتاب ہو درج ہوں گے
- (۱۰) رسالہ اثر کہربانی مصنفہ بیکول
- (۱۱) تاریخ ایران مصنفہ سر جان مالکم
- (۱۲) رسالہ جیالوجی مصنفہ جان فلیس صاحب
- (۱۳) تاریخ بھوپال مصنفہ جان مالکم
- (۱۴) مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین کانڈ، شیخ ابی العباس المقری اور کالی کٹ کی کتابوں تاریخ عربوں کا اسپین، اسپین کے عربوں کی تاریخ اور تاریخ اسپین سے، تالیف کی جائے گی
- (۱۵) رسالہ علم فلاحت یعنی کشتکاری مصنفہ لائبی صاحب
- (۱۶) تاریخ اسکندراعظم مصنفہ ایرین صاحب
- (۱۷) مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر صاحب
- (۱۸) رسالہ علم طبیعیات جو پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنفہ جے۔ جے۔ گریفن صاحب
- (۱۹) کلک صاحب کے آخری نسخہ چوتھی اور پانچویں فصل
- (۲۰) واپلی صاحب کی کتاب منطق
- (۲۱) متعدد رسالہ حکمت قدرت، ویل صاحب کے سلسلے میں سے
- (۲۲) بزرگ کنگم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انھوں نے صوبہ بہار اور گورکھ پور میں کی
- (۲۳) رسالہ علم ہیئت یا کئی دنیاؤں کا ثبوت، مصنفہ ویول صاحب
- (۲۴) رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنفہ ملر صاحب
- (۲۵) بکل صاحب کی دوسری جلد کا چھٹا باب، جس میں نتیجے نکالنے کی حکمت کی عظمت کا بیان ہے۔

(۲۶) میکس مولر صاحب کی کتاب دربارہ علم سنسکرت

(۲۷) مواعظ سکندر مصنفہ ارسطو

(۲۸) پوٹیکل اکاڈمی یعنی انتظام مدن مصنفہ سپنیر صاحب لہ

علاوہ بریس مولوی عبدالغفور نساخ نے جو محمدن ٹریڈری سوسائٹی کلکتہ کے سکریٹری اور سائنٹفک سوسائٹی کے رکن تھے ۸ جنوری ۱۸۹۵ء کو سوسائٹی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں اٹھارہ کتابوں کے تراجم شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

سوسائٹی کیلئے عمارت کی تجویز اور تعمیر:

چونکہ سوسائٹی کا کوئی نجی مکان نہیں تھا اس لئے گریہم ہی کے زمانے میں سوسائٹی کے ایک جلسے میں اس کے لئے ایک مستقل عمارت تعمیر کرنے کی حسب ذیل تجویز منظور کی گئی

(۱) "اول یہ کہ مکان وسیع واسطے اجلاس سوسائٹی بنایا جائے کہ جس میں سوسائٹی کا اجلاس ہو کرے اور تمام کتابیں اور اسباب متعلق سوسائٹی کا بہ حفاظت اور آراستگی کے ساتھ اس میں رکھا جائے۔"

(۲) دوسرے یہ کہ سوسائٹی کے متعلق ایک عام ذخیرہ ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں انگریزی اور فارسی اور عربی اور اردو اور سنسکرت کا کیا قلمی کیا چھاپا (ہوا) جمع کرنا چاہئے اور یہ کتب خانہ بطور عام کتب خانہ کے رہے گا۔ اور ہر شخص کو بموجب ان قواعد کے جو کونسل کارپرداز مقرر کرے گی، ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہے گا۔

لہ اصغر عباس، سرسید کی صحافت ص ۵۶ - ۵۵
لہ ان کتابوں کی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ج

(۳) تیسرے یہ کہ جمع قسم کے علوم و فنون کے آلات جو یورپ میں مروج ہیں اور جن کے ذریعہ سے طالب علموں کو ہر قسم کے علوم و فنون کے تجربے دکھائے جاتے ہیں، سوسائٹی کو جمع کرنا چاہئیں۔ کیونکہ ابتدا سے سوسائٹی کی خواہش ہے کہ ہر مہینہ میں دو تین دفعہ بندہ ریعہ لکچروں کے اور دکھانے تجزیوں کے ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم و فنون کی نئی تحقیقات بخوبی سمجھائی جاویں۔" ۱۷

پنپانچہ ۳، نومبر ۱۸۶۴ء کو صوبہ شمال مغرب کے لفٹنٹ گورنر ڈرہمنڈ کے ہاتھوں مجوزہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی اور سرسید کی نگرانی میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں نے فراخ دلی کے ساتھ چندے دیے اور سال ڈیڑھ سال کے اندر یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ عمارت کی تعمیر آرایش و زیبائش، کتب خانہ اور جدید قسم کے آلات پر تقریباً بتیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔

عمارت کا جشن افتتاح:

عمارت تیار ہونے کے بعد ۱۲ فروری ۱۸۶۶ء کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس کا جشن افتتاح منایا گیا۔ مسٹر ویس کمشنر قسمت نے اس کا افتتاح کیا۔ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں سرسید کے کاموں کی بڑی تعریف کی۔ حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ۔

"سرسید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے تم صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انہی کا کام ہے اور وہی اس جلسے کے بڑی ترقی دینے والے ہیں۔ اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی

۱۷ رولڈاد سین ٹیفک سوسیٹی ممبر ۳، بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۵۸
۱۸ اصغر عباس، سرسید کی صحافت ص ۵۸

ہیں۔۔۔۔۔ اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی۔ بے سب کے دلوں پر اس کا اثر ضرور ہوا خدا کرے یہ انسٹی ٹیوٹ اس بات کا سبب ہوئے ہم سب ہندوستانی اور انگریزوں کی بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب ان کی مدد کریں اور ان کا شکریہ ادا کریں۔ اے خدا! اس انسٹی ٹیوٹ کو سرسبز کر۔ آمین

کتب خانے کی تنظیم:

۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کے کتب خانے کا قیام عمل میں آیا جس کے لئے سب سے پہلے سرسید نے چھ سو روپے کی کتابیں پیش کیں۔ بعد ازاں اشیا ملک سوسائٹی آف بنگال، میر اشرف علی، کیمسن صاحب، عبداللہ عبیدی، منشی نول کشور، ولیم ناسوس، عبدالرحمن، اکتان فلم اور مسٹر گمہم نے اپنے عطیات سے اس علمی ذخیرے میں اضافہ کیا۔ ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ انگریزی کے اٹھارہ اخبارات اور میگزین اولارد ڈ فارسی عربی اور سنسکرت کے ۲۶ اخبار ہند اور بیرون ہند سے سوسائٹی کے کتب خانے میں آتے تھے۔

کتابوں کی تصنیف کیلئے گورنمنٹ سے امداد کی اپیل:

۳۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کو سرسید نے گورنمنٹ صوبہ شمال مغربی کو ایک درخواست دی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ سوسائٹی اس صوبے کے کاشتکاروں کیلئے کشتکاری سے متعلق مفید کتابیں تصنیف کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر گورنمنٹ کچھ امداد کرنے

۱۲۵ ص حیات جاوید حصہ اول

۱۲۵ ص ایضاً ۱۲۶ ص ایضاً

کا وعدہ کرے تو اس کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۶ء میں گورنمنٹ نے سوسائٹی سے پانچ سو روپے سالانہ کی کتابیں خریدنا منظور کیا۔ لیکن کام کی دست اور وقت طلبی کی وجہ سے اس موضوع پر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہو سکی۔ حالانکہ اس نوعیت کی کتابیں لکھنے کی ذمہ داری خود سرسید نے ہی تھی۔

سوسائٹی کے جلسوں میں لکچروں کا سلسلہ:

سوسائٹی کا ماہانہ جلسہ اس کی عمارت میں ہوا کرتا تھا۔ ان جلسوں میں مختلف علمی موضوعات پر مباحثوں کے علاوہ تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ سب سے پہلے سرسید نے لکچری کے مختاروں کے لئے قانون پر لکچر دینا شروع کیا تھا جس کے لئے برائے نام فلیس بھی نی جاتی تھی اس رقم کو سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کر دیا جاتا تھا ڈاکٹر گلکی ہر مہینے نیچرل سائنس پر لکچر دیتے تھے اور سوسائٹی کے جمع کردہ آلات کی مدد سے *practical* بھی کر کے دکھاتے تھے۔ ۲۸ جون ۱۸۶۷ء سے علی گڑھ انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے علم طبیعیات پر تقریر شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً تاریخ جغرافیہ اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن، تعلیم نسواں اور دیگر اخلاقی و علمی موضوعات پر بھی لکچر ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں سوسائٹی پانچ سو روپے ماہوار خرچ کرتی تھی۔ اس رقم میں سے دو سو پتالیس روپے مطبع کے عملے پر اور ۲۱ روپے درسی ضروریات اور مکان کے انتظام پر صرف ہوتے تھے۔

سوسائٹی کی امداد

سرسید کا عطیہ:

سوسائٹی کا اصل مقصد جدید علوم و فنون کی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کرنا تھا۔ سوسائٹی کے دستور میں بھی مرقوم تھا کہ سوسائٹی اپنا ایک ”آرگن“ اخبار یا جریدے

نے سوسائٹی اخبار ۱۳، دسمبر ۱۸۶۷ء، کو الہیات جاوید ص ۱۲۵

کی شکل میں شائع کرے گی۔ ان سب کاموں کے لئے ایک پریس کی موجودگی اشد ضروری تھی، لیکن سوسائٹی کا بجٹ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ پریس خرید جائے چنانچہ سرسید احمد خاں نے اپنا ذاتی پریس جسے انھوں نے "بتین الکلام" کی طباعت کے لئے آٹھ ہزار روپے میں خریدا تھا اور جس میں اب تک سوسائٹی کی روداد اور کاغذات پھینتے رہے تھے، بطور عطیہ سوسائٹی کے ہوالے کر دیا۔ سوسائٹی کے جس ماہانہ جلسے میں انھوں نے اپنا پریس دینے کا وعدہ کیا تھا، اس کے پیرمیں جارج ہنری لارنس تھے۔ سرسید کی اس دہیادی اور فیاضی پر انہوں نے کہا تھا کہ "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے سے ہی مقروض ہے مگر اب اس احسان کو اس عالی شان عطیہ نے اور زیادہ کر دیا۔" نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ فرماں روا لئے بھوپال نے جب یہ سنا کہ احمد خاں نے اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود اور خیر سگانی کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے تو انھوں نے جون ۱۸۶۶ء میں انہیں ہیرے کی ایک انگوٹھی اور ایک ہزار روپے بطور اظہارِ خوشنودی مرحمت فرمائے۔ سرسید نے ایک جلسہ عام میں یہ پیش بہار انگوٹھی سوسائٹی کو وقف کر دی

گورنمنٹ کی امداد:

گورنمنٹ نے سوسائٹی کی امداد کے لئے پانچ سو روپے سالانہ کی کتابیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ تین ایکڑ زمین روڈ اور تیس پول زمین تعمیر مکان کے لئے اور ایک باغ علم فلاح کی ترقی، تجربے اور امتحان کے لئے سوسائٹی کو تفویض کیا تھا۔

نوابین اور بہاراجوں کے عطیات:

ہندوستان کے فیاض اور بزرگوں اور بہاراجوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق گراں قدر عطیات سے سوسائٹی کی اعانت کی اس ضمن میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام

لیٹور خاص قابل ذکر ہیں

سور روپے سالانہ	(۱) مہاراجہ جودھ پور
پچاس روپے سالانہ	(۲) مہاراجہ کپور تھلہ
» » »	(۳) مہاراجہ جے پور
سور روپے »	(۴) نواب رام پور

فرماں بردار نے رام پور نواب کلب علی خاں نے سالانہ عطیہ کے علاوہ بارہ سو روپے کی ایک تقری کر سی بھی عطا کی بسٹریڈ ریمینڈ ٹرسٹ گورنر پنجاب مسٹر میکلوڈ نے چندے دیے مہاراجہ اور اور مہاراجہ اندور بھی مدد کی اور نواب عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے خاص طور سے تعمیر چاہ کے لئے دو سو روپے عنایت فرمائے۔ اس طرح سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت سے سوسائٹی کی سالانہ آمدنی دس ہزار آٹھ سو پچاس روپے تک پہنچ گئی تھی۔

سوسائٹی کی طرف سے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام

۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے ماہانہ جلسے میں سرسید نے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے ایک اور تجویز پیش کی۔ اس جلسے میں علی گڑھ کے متعدد مغز ہندوستانی اور چند یورپین موجود تھے۔ سرسید نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف گورنمنٹ اور ڈائرکٹریٹنگ کمیٹی تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم ہی تعلق پاتے تھے، مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ منظم نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اور اب ہندوستان کے

۱۷ مولوی عبدالحق مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۵

امور کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لئے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے خیالات اور معلومات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں، ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہئے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعہ اپنے تمام مطالبات اور مقاصد کو رنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔

سر سید کی اس تجویز کو سبھی لوگوں نے پسند کیا اور اسی جلسے میں ”علی گڑھ بڑش انڈین ایسوسی ایشن“ کی داغ بیل پڑی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس رکنیت قبول کی۔ راجہ جے کشن داس اس نے سکرٹری اور سر سید آرمبری سکرٹریں قرار پائے۔ اس ایسوسی ایشن نے ہندوستانیوں کے حق میں بڑے مفید کام انجام دیے، لیکن سر سید کے بنارس کو تبادلا کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

سوسائٹی کی طرف سے اخبار کا اجرا :

۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے جلسے میں ایک اخبار نکالنے کی تجویز منظور ہوئی۔ ۳ مارچ ۱۸۶۶ء کو اس اخبار کا پہلا شمارہ سید احمد خاں پرائیویٹ پریس میں چھپ کر باہتمام محمد یار خاں شائع ہوا۔ شروع میں اس کا نام اخبار سین ٹیفک سو سیٹی علی گڑھ رکھا گیا تھا اور اس کے سرورق پرائیمری اور اردو کی سبب ذیل عبارت لکھی رہتی تھی۔

۱۲۶ - ۲۷

۱۲۷ - ۲۸

۱۲۸ - ۲۹

“LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVERNMENT AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS.”

”آزادی چھاپہ خانہ کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصل اور جلی حق رعیت کا“۔ لیکن جولائی ۱۸۶۷ء میں اس کا نام بدل کر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ مع پریس گزٹ کر دیا گیا۔ جنوری ۱۸۹۰ء میں ”پریس گزٹ“ کے الفاظ خارج کر دیے گئے اور یہ اخبار صرف ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ کے نام سے موسوم ہوا۔ شروع میں یہ اخبار ہفتے میں ایک بار چھاپہ شنبہ کو نکلتا تھا، بعد میں اسے سہ روزہ کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ اخبار صرف سرسید کی زندگی تک نکلتا رہا۔ جنوری ۱۸۹۷ء میں اسے ”تہذیب الاخلاق“ کو ملا کر شائع کیا جانے لگا تھا اور اس مناسبت سے اس کا نام ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق“ رکھ دیا گیا تھا جو جنوری ۱۹۰۱ء کے بعد تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ لیکن جب وقار الملک نے ایم۔ اے۔ اور کالج محلے آنریری سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تو وہ گزٹ کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ اخبار ان کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔ اس طرح سے بعض لوگوں کا یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہیں کہ جب تک یہ اخبار جاری رہا سرسید ہی اس کے ایڈیٹر رہے۔ بالکل ابتدائی زمانے میں اس کی ادارت کے فریضے منشی محمد یار خاں کے سپرد تھے اور منشی چھکن لال انگریزی اخبار سے ترجمہ کرتے تھے۔ پندرہ مہینے بعد ادارت کی ذمہ داری سرسید نے اپنے ہاتھ میں لے لی، بعد ازاں اکتوبر ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۷ء تک مولوی اسماعیل خاں اس کے مدیر رہے۔ ان کے بعد ادارت کی

۱۷ ایضاً

۱۸ ڈاکٹر منظر عباس و حید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۱۸۵

۱۹ مولوی عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۴

۲۰ مشتاق حسین، مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۵۴

ذمہ داریاں دوبارہ سرسید کے سپرد ہوئیں جنہیں وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک انجام دیتے رہے۔ اس اخبار میں ادارے کے علاوہ بیشتر مضامین بھی سرسید ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

اس اخبار کے ذریعہ ہندوستانیوں کو نئی نئی اطلاعات فراہم کی جاتی تھیں اور جدید ایجادات سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ سیاسی امور میں اسی اخبار نے گورنمنٹ کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دوسری خصوصیت جو اسے دوسرے اخباروں سے ممتاز کرتی ہے یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین انگریزی اور اردو میں الگ الگ بھی چھاپے جاتے تھے۔ چنانچہ انگریزی داں اور اردو داں طبقے یکساں طور پر اس سے مستفیض ہوتے تھے۔ مولانا حالی نے اس اخبار کے مقاصد اور اس کی خصوصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ان کے الفاظ میں

”اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات و معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا تھا۔“

مولانا آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

”..... اس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلائل کی روایتیں

اور اعلیٰ درجات کی نصابی ضروریات پوری کرنے کیلئے مندرجہ ذیل موضوعات پر کتابوں کی تیاری کا ایک خاکہ مرتب کیا۔

(۱) فقہ جہات اردو۔ یہ آسان اور چھوٹے محاوروں کا مجموعہ ہوگا
دس صرف اردو

(۳) شرح صرف اردو (مع مثالوں کے)

(۴) قواعد اردو

(۵) شرح قواعد اردو

(۶) صرف فارسی (اردو میں)

(۷) شرح صرف فارسی

(۸) فقہ جہات فارسی۔ مجموعہ ایسے فقروں کا جو اردو میں مستعمل ہیں

(۹) شرح فقہ جہات فارسی

(۱۰) قواعد فارسی و اردو

(۱۱) نظم اردو۔ قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب

(۱۲) شرح نظم اردو

(۱۳) نظم فارسی و اردو۔ آسان فارسی و اردو اشعار کا انتخاب

(۱۴) عروض (اردو میں)

(۱۵) خالص علم زبان اردو۔ اس کے چار حصے ہوں گے، ۱) اخلاق، ۲) طبیعات

(۱۱۱) علم انتظام مدن اور (۱۱۲) مضامین کا انتخاب

(۱۱۶) فن تصنیف۔ تصنیف کے قواعد اور مثالیں درج ہوں گی۔

(۱۱۷) عربی منطق کے قواعد (اردو میں)

(۱۱۸) سنسکرت منطق کے قواعد

(۱۱۹) انگریزی منطق کے قواعد

(۱۲۰) تاریخ یمنی

(۲۱) تاریخ خواجہ ابو الفضل بہیقی

(۲۲) تاریخ المآثر

(۲۳) طبقات نامری

(۲۴) تاریخ فیروز شاہی

(۲۵) تاریخ تیمور اور تاریخ ابن خلدون کا انتخاب

کتابوں کی تالیف و اشاعت کے اس منصوبے میں راجہ صاحب کی غیر معمولی دل چسپی کے باوجود ان میں سے کوئی کتاب مرتب اور شائع نہیں ہو سکی اور اس سے قبل تیار شدہ فہرستوں میں بھی پندرہ کتابوں کے علاوہ جن کے نام آخر میں دیے گئے ہیں، باقی کتابوں کی تالیف اور ترجمے کا کام مکمل نہیں ہوا۔

سوسائٹی کی آمدنی کی ایک اور تدبیر:

اکتوبر ۱۸۶۷ء میں سرسید دسہرے کی تعطیل میں بنا اس سے علی گڑھ آئے اور مقامی زمینداروں اور رئیسوں کو یکجا کر کے ان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سوسائٹی کی مستقل آمدنی کے لئے کوئی تدبیر کرنا چاہیئے چند زمینداروں نے مشورہ دیا کہ ضلع کے ہر گاونے سے ایک روپیہ سالانہ سوسائٹی کے لئے مقرر کیا جائے اور یہ شرط بند و بست کے وقت واجب العرض میں درج کر دی جائے تاکہ ہمارے اخلاف و ورثا بعد میں کوئی عذر پیش نہ کر سکیں۔

چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سرسید نے یہ تجویز سوسائٹی کے ماہانہ جلسے میں پیش کی اور زمینداران درخواست دہندہ کی ایک فہرست مع ان کے عرصیوں اور ۱۳۳ دیہات کی تفصیل کے اپنے سفارشی خط کے ساتھ ضلع کلکٹر جارج ہنری لارنس کی خدمت میں روانہ کر دی۔ لارنس نے تمام کاغذات اپنی رپورٹ

کے ساتھ گورنمنٹ کو بھیج دیے۔ گورنمنٹ سکرٹری کا پونٹ سرسید احمد خاں کو ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو موصول ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے اس کے لئے رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن اس پر کس حد تک عمل ہوا اس کا سراغ ہمیں نہیں مل سکا۔

سرسید کو سوسائٹی سے بے حد محبت تھی وہ جب تک زندہ رہے اور جہاں بھی رہے سوسائٹی کی تعمیر و ترقی میں سرگرم عمل رہے۔ یکم اپریل ۱۸۶۶ء کو وہ ولایت کے لئے روانہ ہوئے۔ عدنان سے انگلینڈ روانہ ہوتے وقت انھوں نے محسن الملک کے نام جو خط تحریر کیا تھا اس کے مطالعہ سے سوسائٹی سے ان کی واپس آنے کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے اس خط میں لکھا تھا کہ

مجھے علاوہ مفارقتِ اجاب یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ اہل

کے دشمن سائنفلک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کرتے رہے۔ پس میں

چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے

سنجھانے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔

انگلینڈ سے مراجعت کے وقت جدید علوم و فنون کی بہت سی انگریزی کتابیں وہ

اپنے ساتھ لائے، جن میں بعض کے اردو تراجم سوسائٹی نے شائع کیے۔

کتابوں کی تصنیف کیلئے گورنمنٹ سے امداد کی مکرر اپیل:

۹ مئی ۱۸۶۸ء کو سوسائٹی نے سر ولیم میور لٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب سے

یہ درخواست کی کتابوں کی اشاعت میں گورنمنٹ کو اس کی مدد کرنا چاہئے۔ چنانچہ ۱۹ اکتوبر

۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں یہ وعدہ لیا گیا تھا

کہ جو کتابیں ویسی زبان میں تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی گورنمنٹ ان کی مدد کرے گی اگرچہ لوگوں

نے اس ترجمہ سے بہت زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ اس وعدے کی میعاد صرف

۲۷۔۲۸ جولائی ۱۸۶۸ء سے ۲۷۔۲۸ اگست ۱۸۶۸ء تک رہی۔

چند برسوں کی تھی، تاہم مذکورہ اعلان نے ویسی مصنفوں کے دلوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کر دیا۔ نتیجے کے طور پر ویسی زبانوں میں بیش بہا کتابیں معرض وجود میں آئیں۔

راجہ جے کشن داس کا استعفا

راجہ جے کشن داس نے آٹھ سال تک سوسائٹی کی نظامت کے فرایض انجام دینے کے بعد علی گڑھ سے الہ آباد تبادلاً ہو جانے کے باعث ۲۱ فروری ۱۸۷۲ء کو اپنے منصب سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد انھیں ان کی خدمت اور محنت کے پیش نظر آنریری لائف کو پریسڈنٹ بنایا گیا۔

سوسائٹی کا زوال اور خاتمہ:

راجہ صاحب کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کو سوسائٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور جون ۱۸۷۴ء کو وہ عارضی طور پر نظامت کے فرایض سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۷ اور مولوی زین العابدین اور پنڈت رادھا کشن سوسائٹی کے کمرتا دھرتا مقرر ہوئے۔ ۲۵ اگست ۱۸۷۴ء کو سمیع اللہ خاں نے دوبارہ اس عہدے کا چارج لیا۔ ۲ مئی ۱۸۷۴ء تک مولوی سمیع اللہ اور پنڈت رادھا کشن سوسائٹی کی نظامت کے فرایض انجام دیتے رہے اس زمانے میں سرسید ملازمت سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ آ گئے تھے، چنانچہ سکریٹری کی ذمہ داریاں مکران کے کندھوں پر آ پڑیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڑھ میں انگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ اور سرسید اور ان کے رفقاء پوری طرح کالج کی تعمیر و ترقی کیلئے سرگرم عمل تھے اسلئے سوسائٹی کی طرف سے ان کی توجہات روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ سوسائٹی قرض کے بارے دیتی جا رہی تھی اور اس کے اراکین کی تعداد بھی برابر گھٹتی جاتی تھی۔ کتابوں کے ترجمے کا کام راجہ صاحب ہی کے زمانے میں بند ہو گیا تھا۔ اس صورت حال سے نپٹنے کیلئے سرسید احمد خاں

۱۷ افریقہ اس سرسید کی صحافت ص ۶۳

۱۷ تاریخ ایران حصہ اول سوسائٹی کا آخری ترجمہ ہے، پورا راجہ صاحب کی نظامت کے زمانے میں ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔

سنے ستمبر ۱۸۷۸ء میں سوسائٹی کے قواعد و ضوابط میں کچھ نرمی پیدا کرنے کیلئے اس کا دستور مرتب کیا۔ اس کے باوجود سوسائٹی کی حالت میں کوئی فزقا واقع نہیں ہوا اور زوال کا عمل بدستور جاری رہا۔

اسی زمانے میں سرسید و اُسرا بے کی کونسل کی ممبر نام زد ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء کے اواخر میں محمد یوسف کو سوسائٹی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نئی نظامت میں بھی اس کی حالت میں کوئی بہتری رونما نہیں ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں اس کے صرف دس باقاعدہ ممبر اور چار آنریری ممبر رہ گئے تھے جب کہ اس کے ابتدائی زمانے میں اس کے ارکان کی تعداد دھائی سو تھی۔ ۱۸۸۴ء میں ارکان کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف تین رہ گئی اور ۱۸۸۶ء میں کوئی رکن باقی نہ رہا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ تحریک کا نقطہ آغاز تھی، جس کی تاسیس کا مقصد ہندوستان میں جدید علوم و فنون کا فروغ تھا اور انکلو اور بینٹل کالج کا قیام اس تحریک کا نقطہ عروج تھا جو اسی مقصد کے پیش نظر عمل میں آیا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا اس کالج کو یونیورسٹی کا روپ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں کالج کی تعمیر و ترقی پر مبذول کر دی تھیں۔ اس کے مقاصد کی تکمیل میں سوسائٹی کے مقاصد کا حصول بھی مضمون تھا۔ چنانچہ جب سوسائٹی کا کوئی رکن باقی نہیں رہا تو ۱۰ جولائی ۱۸۸۶ء کو اسے مدرسۃ العلوم میں ضم کر دیا گیا۔ اور ۷ نومبر ۱۸۸۶ء کو اس کی عمارت میں ایک کلب قائم ہو گیا۔

سائنٹفک سوسائٹی: تنقیدی جائزہ

سائنٹفک سوسائٹی ہندوستان کا تیسرا واقع اور قابل تقلید تصنیفی و تالیفی اور اشاعتی ادارہ تھا جو سرسید احمد خاں کی فکر رسا کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج انگریزوں نے قائم کئے تھے جن کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ دلی کالج کی ٹرانس لینشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد دیسی زبانوں میں مغربی و مشرقی علوم و فنون کی کتابوں کی طباعت و اشاعت تھا اور اس میدان میں دلی کالج نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کی خدمات یقیناً قابل فخر و مباحثات ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے انتقاماً اسے بند کر دیا۔ چنانچہ جو مفید کام اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے سرانجام پا رہا تھا آناً فاناً بند ہو گیا۔ دلی کالج کے اس مبارک کام سے متاثر ہو کر حیدرآباد کے شمس الامیر امیر کبیر ثانی نے اپنے حلقہ اثر میں یورپ کے علمی خزانے کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن ان کی کوششوں کے اثرات محدود رہے۔ عوام ان کتابوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔

انیسویں صدی میں سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کے درجے کو جذب کرنے کا باقاعدہ عمل دلی کالج نے شروع کیا تھا جسے ہم اس روایت کا نقطہ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ انہی خطوط پر سائنٹفک سوسائٹی نے اس مفید کام کو آگے بڑھایا۔ سوسائٹی کا مقصد بھی دیسی زبانوں میں ایسی کتابیں تیار کرنا تھا۔ جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہندوستانیوں کے ذہنوں کو منور کر سکیں، چنانچہ ان کتابوں نے ہندوستان میں نئے افکار و خیالات کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سوسائٹی نے پندرہ علمی کتابیں تالیف یا ترجمہ کر کے اردو کے خزانے کو مغربی علوم و فنون سے مالا مال کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ان کاموں کیلئے جو مغربی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر رکے ہوئے تھے، راہ ہموار ہو گئی۔ مولانا حالی سوسائٹی کی اس افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اگر غور سے دیکھئے تو یہ (سوسائٹی) ہمارے ان مقاصد جلیلہ میں سے ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر انسان بال فعل کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا۔“

سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے خواشی میں متن کے بعض الفاظ اور اشارات و اصطلاحات کی تشریح و توضیح کا التزام کیا گیا ہے۔ جن سے ہندوستانی عام طور سے ناواقف ہوتے تھے سوسائٹی کی کتابیں تعداد کے لحاظ سے کم سہی لیکن کیفیت کے اعتبار سے غیر معمولی افادیت و اہمیت کی حامل ہیں ان تصانیف نے انیسویں صدی میں شمالی ہند میں جدید تعلیم کی تشویق و ترغیب میں دم عیسیٰ کام کیا۔ ڈاکٹر اصغر عباس کا یہ خیال مبالغہ آمیز نہیں کہ

”انیسویں صدی میں شمالی ہند میں ترجموں کے سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی کی یہ آخری کوشش تھی جو بروئے کار آئی.... ان کتابوں نے ملک کو قرون وسطیٰ کے اندھیرے سے نکلانے کیلئے جو فضائیا کی اس کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے منصوبوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کا خواب بھی سرسید نے اس کام کے دوران دیکھا گویا اس کے تمام خط و خال ان کے ذہن میں پورے طور پر انگلستان کے سفر کے بعد متعین ہوئے۔ اس لئے علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کیلئے بھی سائنٹفک سوسائٹی کا مطالعہ از بس ضروری ہے کہ یہی سوسائٹی علی گڑھ تحریک کا نقطہ آغاز ہے۔“

۱۰ مقالات عالی حوالہ ص ۶

۱۱ سرسید کی صحافت ص ۵۹

بہر حال سوسائٹی کی کتابوں اور اسی کے اخبار کی تحریروں سے ہندوستانیوں کے اذہان و افکار میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ انگریزوں کا جو خوف اور لرعب ہم پر طاری تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا اور ہمیں بدلے ہوئے ماحول اور معاشرے میں سانس لینے کا ایک اندازہ لیب ہوا۔ مولوی عبدالحق نے ایک جگہ سوسائٹی کے قیام کے ان اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”ان رسر سید کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی و علمی تھا اور اس کا ایک جزو سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا تھا جو اس وقت عمل میں آ رہا تھا۔“

اس سوسائٹی کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے اتباع میں ہندوستان میں سائنس کی بہت سی اصلاحی انجمنیں اور سوسائٹیاں وجود میں آئیں جنہوں نے ملک کے ہمہ جہت ترقی میں کلیدی رول ادا کیا بنارس انسٹیٹیوٹ، اناوہ ریڈنگ اینڈ ڈسٹریکٹ کلب، سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور بہار، انجمن تہذیب لکھنؤ، ساروجنک سجا پونا، کنگ سوسائٹی اڈیہ اور انجمن راجپوتانہ وغیرہ کا قیام سائنٹفک سوسائٹی ہی کے اثرات کا مرہون منت تھا۔ سوسائٹی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط موجود ہیں جن میں اس امر کا واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ مولانا حالی کا مندرجہ ذیل بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

”قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کیلئے یہ سوسائٹی قائم ہوتی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان میں بلکہ ملک کے اکثر حصوں میں پہنچے ہیں شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی قومی انسٹیٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی پھر ۲۵ برس کے عرصے میں جس

قدر سوسائٹیاں انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اسکے اور اسی

کی رسی سے قائم ہوئیں۔" لے

سوسائٹی سے اخبار سے پہلے ہندوستانی اخبارات کا یہ حال تھا کہ وہ محض قارئین کی تفریح و طبع اور دلگلی کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے حیرت انگیز اور خوش کن خبروں سے اپنے پڑھنے والوں کو سچا اور مسرور کرنا ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ ان میں علمی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین شاذ و نادر ہی پھلتے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اپنے پیش رو اخباروں کے اس انداز اور روایت سے ہٹ کر صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا اور صحیح خبروں کے پہلو بہ پہلو علمی، تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی مضامین شائع کر کے اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی اور ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا، جس کی وجہ سے اسے جلد ہی اپنے ہم عصر اخباروں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہو گیا حتیٰ کہ گورنمنٹ بھی اس کی آواز کو عوام کی آواز سمجھ کر اس کا دزن محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ اس کا دیکھا دیکھی دوسرے اخباروں نے بھی اپنا انداز بدل کر یہی روش اختیار کرنا شروع کر دی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آواز جو صداب صحرا کے مصداق تھی عوام کے دلوں میں گھر کرنے اور گورنمنٹ کے کالوں میں پہنچنے لگی۔

سوسائٹی اپنے اجلاسوں میں عورتوں کی تعلیم، کم برابر زور دیتی رہتی تھی اگرچہ اس زمانے میں سوسائٹی کا یہ ثواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن اسکی اس ہوشمندانہ تبلیغ کا نتیجہ ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسکے علاوہ سوسائٹی نے کسانوں کی نجات و بہبود کیلئے بھی کوششیں کیں۔ اس نے نہ صرف علم فلاح پر کتابیں تصنیف کرائیں بلکہ اسکی نگرانی میں کشتکاری سے متعلق مختلف علمی تجزیے بھی کئے گئے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی کی قیادت نے ہماری زبان کے علمی ذخیلے میں قابل ذکر اضافے کساحہ ساتھ ملک میں جدید خیالات کو فروغ دینے میں نیا جہد کیا۔ اسکی کوششوں کی بدولت سائنس سے دلچسپی کا رجحان عام ہوا اور عیسائی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ترقی کی نئی راہ ملی۔ محقر یہ کہ ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی میں سوسائٹی کی خدمات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

لے حیات جاوید حصہ دوم ص ۴۴

سائٹفک سوسائٹی کے تراجم

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ لیکن انہوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں چالیس کتابوں کی فہرست پیش کرنے کی بجائے صرف اکتیس کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر اصغر عباس کی تحقیق کے مطابق سوسائٹی سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوئیں۔ عبدالحق کے بیان کی تائید کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولوی ذکاء اللہ کی ترجمہ کردہ سترہ کتابوں کو بھی سائٹفک سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن ان سے ذہول ہوا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ کتابیں سائٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید میں "مطبع مرتضوی دہلی" میں طبع ہوئیں اور ان کا ٹائٹل پریس انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا۔ اصغر عباس نے اپنی پیش کردہ فہرست میں صرف مصنفین کے نام لکھے ہیں مترجمین کے نہیں۔ کیوں کہ ان کتابوں پر مترجم کا نام درج نہیں ہوتا تھا اس لئے اب ان ناموں کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ حامد حسین قادری کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ گنگا پر شاد اور مولوی فیض الحسن (سوسائٹی کے) مترجم کتب تھے۔ ذیل میں ان پندرہ کتابوں کی فہرست پیش کی جا رہی ہے، جنہیں سوسائٹی نے شائع کی تھیں۔ کتابوں کے وہی نام درج کئے گئے ہیں جو ان کے سرورقوں پر لکھے ہوئے ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	پریس کا نام	سال طباعت	کیفیت
۱	مصر کی قدیم تاریخ	رولن		۱۸۶۴ء	رولن کی کتاب "Ancient History of Egypt" کے علاوہ چند مفید مضامین کا اضافہ بھی شامل تھا اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں انسٹیٹیوٹ پریس سے شائع ہوا۔

۱۷ سرسید احمد خاں حالات و انکاد ص ۱۵۱ء سرسید کی صحافت ص ۶۷ء مطابہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۴

محمد زماں نر فرنگی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ایکوس نے کیا تھا۔ یہ اسی ترجمہ ہے	۶۱۸۶۴	کلکتہ بال پبلسٹیشن پریس	پادری ایکوس	تاریخ چین	۲
Ancient History of Greece کے مفید حصے کا ترجمہ حاشیے کیساتھ دوسرے حصے کا ترجمہ مع حاشیے کے	۶۱۸۶۵	سر سید احمد پرائیویٹ پریس	رولن	یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ	۳
تیسرے حصے کا ترجمہ اور مفید حاشیہ	"	"	"	"	۴
یہ باتصویر تھی اور حاشیہ آرائی بھی کی گئی تھی	"	"	"	"	۵
بہ اضافہ حاشیوں کے	"	"	"	"	۶
ابتداء سے ۱۸۶۱ء تک مع دو حاشیوں کے	۶۱۸۶۶	"	ڈاکٹر اسکاٹ برن	رسالہ علم فلاحیت	۷
مع حاشیہ	۶۱۸۶۵	علیگندہ انسٹیٹیوٹ پریس	ولیم سنیر	رسالہ علم انتظام مدن	۸
اسکا ترجمہ دھرم نرائن نے کیا تھا مل			اسٹور انفسٹن	تاریخ ہندوستان	۹
کی کتاب کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ صحیح معنوں میں			ولیم انومیرس	رسالہ علم برقی	۱۰
دھرم نرائن اسے موافق تھے			اسٹورٹ مل	اصول سیاست مدن	۱۱
سوسائٹی کا آخری ترجمہ ہے۔ اس میں	۶۱۸۶۲	ٹیوٹ پریس	جان مالکم	تاریخ ایران بعد اول	۱۲
تقدیم زمانہ سے حال تک کے حالات					۱۳
دہن ہیں۔ اسے چار حصے تک تک			ولکنسن	رسالہ علم جغرافیہ	۱۴
شائع ہوئے تھے۔			چارلس ٹامس	رسالہ نچرل فلاسفی	۱۵
				رسالہ علم آب و ہوا	
				رسالہ جر ٹھیل	

سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا

سر سید احمد خاں

سر سید کے بارے میں بڑا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک اردو زبان باقی رہے گی ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھی انھوں نے تنہا جتنا بڑا کام کیا وہ کئی انجمنیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے صرف مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ اردو کے حال اور مستقبل کو بھی سنوارا اور اسے مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ تاریخ میں آج ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے ان کی طرح اپنی پوری زندگی جدید علوم و فنون کی ترویج و تشویق اور اردو زبان کی اشاعت و حمایت کیلئے وقف کر دی ہو۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع و عمیق اور نظر انتہائی دقیقہ رس اور بین اور حقیقت شناس تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کیا، ان کے اندر اپنے اسلاف سے محبت اور جدید علوم سے دل چسپی پیدا کی اور بحیثیت مجموعی انھیں نوحہ آئندہ مستقبل کی راہ پر لگا دیا۔

سر سید ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں اپنے نانا خواجہ فرید الدین کی حویلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر تقی قلعہ دہلی میں بادشاہ کے مقربین بارگاہ میں تھے۔ سر سید بھی کاہ بگاہ ان کے ہمراہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار میں جایا کرتے تھے میر تقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب جنوب مشرق واقع تھا، ہونادری اور مرہٹی یورش و یلغار میں کئی بار لٹ چکا تھا جس کے کچھ حصے مسمار بھی ہو چکے تھے۔

سر سید کا خاندان شاہ عبدالعزیز کا معتقد تھا۔ ان کی والدہ شاہ غلام علی کی مرید تھیں چنانچہ انھوں نے ہی سر سید کو بسم اللہ پڑھانی گھر پرہ قرآن ختم کرنے کے بعد سر سید نے دیگر اساتذہ وقت سے عربی و فارسی درسیات کی کتابیں پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب۔

میں بڑی مختصر معانی اور مطول مانا ملتا تک اور فارسی میں کہ یا خالق باری "آمد نامہ وغیرہ کتابیں پڑھیں اس کے بعد اپنے ماموں زین العابدین سے مورثی علم ریاضی و ہندسہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔

سرسید کی جوانی نہایت زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزری۔ انھوں نے اپنے والد سے تیرا اور تیراندازی سیکھی تھی، جو اس فن میں ماہر و کامل تھے۔ سرسید میلوں اور جھڑلوں کی سیر کے ساتھ عورتوں کی رنگین اور پرکشش محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ان محفلوں میں وہ اپنی حاضر جوانی، قادر الکلامی اور بذلہ سخن کی سند بھی لیتے رہے۔ اس زمانہ میں وہ طبع آزمائی کرتے تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔ حالی نے ان کی قادر الکلامی اور بذلہ سخن کا ایک واقعہ حیات جاوید میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامے نہایت حسین تھی۔ مگر سنا ہے کہ اس کی ماں بھدی اور ساڑھے رنگ کی تھی۔ ایک محفل میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ بھرے کیلئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے۔ اور وہیں ان کے ایک قدھاری دوست بھی بیٹھے تھے وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ است" سرسید نے یہ مصرعہ پڑھا "گرچہ تلخ است لیکن بر شیریں دارد"۔ اس زمانہ میں سرسید نے صہبائی، غالب، مولانا مملوک العالی، آزادہ اور شیخہ جیسی ہستیوں سے کسب فیض کیا۔ ان کی شادی سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہو چکی تھی جہی سے وہ متاثرانہ زندگی گزار رہے تھے۔

سرسید نے اپنی عمر کی اکیسویں منزل طے کی تھی کہ ۱۸۳۸ء میں والد کے دست شفقت سے ہمیشہ کے لئے حرم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے قلعہ کی آمدنی کا سہارا بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ فارمعاشہ ہوئی۔ اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خالصا ماب سے جو اس زمانہ میں دلی میں صدر امین تھے عدالت کا

۱۸۳۶ء نثار اعظمی، نیا دور ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۶

۱۸۳۷ء حیات جاوید حصہ اول ص ۴۵-۴۴

۱۸۳۸ء بحوالہ سرسید اور علی گڑھ تحریک ص ۱۵

کام سیکھ کر ان ہی کے پاس سررشتہ دار ہو گئے۔ بعد ازاں ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔

یہیں سے سرسید کی علمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد ہی انھوں نے قوانین مال سے واقفیت حاصل کی اور ایک دستور العمل تمام دفتر کٹنری کا مرتب کیا۔ اس کے بعد فارسی میں ایک فہرست بطور نقشہ کے تربیت دی جو جام جم کے نام سے ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں قوانین دیوانی و منصفی کا ایک خلاصہ اس امید پر مرتب کیا کہ شاید اس کی وجہ سے انھوں منصفی کا عہدہ مل جائے اس کے لئے کٹنری آگرہ نے گورنمنٹ سے سفارش بھی کی اور یہ طے پایا کہ جہاں بھی منصفی کا عہدہ خالی ہو وہاں سرسید کا تقرر کیا جائے۔ لیکن اس حکم کے معا بعد اس عہدے کے لئے امتحان پاس کرنا ناگزیر قرار دیا گیا چنانچہ منصفی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے خلاصے کو ۱۸۴۰ء میں ”انتخاب الاخویں“ کے نام سے شائع کیا۔

۱۸۴۱ء میں مین پوری میں منصفی کے عہدے پر سرسید کا تقرر ہوا ۱۸۴۱ء میں ان کا تبادلہ قلع پورہ سکر ہو گیا اور ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو وہ وہاں سے تبدیل ہو کر دہلی چلے آئے۔ دہلی کے زمانہ قیام میں انھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب ”آثار السنادید“ لکھی جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اس زمانے میں انھوں نے نوادش علی سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں اور بہادر شاہ ظفر نے انہیں جو اد الدولہ عارف بیگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سرسید ۱۲ جنوری ۱۸۵۵ء کو صدر امین کے عہدے پر ترقی پا کر بجنور چلے گئے۔ یہاں انھوں نے ضلع کلکٹر کے ایما سے ”تاریخ بجنور“ لکھی اور ”آئین اکبری“ کی تصحیح فرمائی۔ یہاں آئے ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی قیامت نیز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کے عہدے پر ترقی دے کر انھیں مراد آباد بھیج دیا گیا ۱۸۵۹ء میں باغیوں کیلئے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ایک رکن سرسید بھی تھے۔ یہیں سے انھوں نے ”تاریخ سرکشی بجنور“ اور اسباب بعاوت ہند“ لکھ کر شائع فرمائے۔ مراد آباد میں انھوں نے فارسی کا ایک مدرسہ قائم کیا مئی ۱۸۶۲ء میں ان کا تباغازی پورے سے ہو گیا۔

اس کے بعد کے حالات کی کسی قدر تفصیل گذشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ لہذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ سرسید جولائی ۱۸۶۷ء میں ملازمت سے شکر و شوق ہو کر علی گڑھ

چلے آئے۔ ان پر ۱۸۹۵ء میں کلج کے فڈ میں غبن کا بھوٹا الزام لگایا گیا جسے وہ حین حیات نہ بھول سکے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتساب بول کا عارضہ لاحق ہوا، ۲۷ مارچ کو صبح سے درد سر میں مبتلا ہوئے اور شام کو شدید ریشہ کے ساتھ بخار چڑھا اور رات دستش بچتے سرسید مسلمانان ہند کو سوگوار چھوڑ گئے۔ بابائے قوم کو کلج کے احاطے میں آسودہ خاک بنا گیا۔

سرسید کی شخصیت شش جہت نیگننے کی طرح تھی۔ جس کے ہر پہلو میں ایک نیا رنگ اور ایک نئی کشش دکھائی دیتی ہے۔ اپنی ہنگامہ نیز زندگی میں انھوں نے علمی و ادبی مذہبی و تہذیبی، تحقیقی و تنقیدی اور سیاسی و معاشرتی میدانوں میں اپنے نقوش و اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کے مذہبی و معاشرتی و سیاسی کارناموں پر تبصرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس موقع پر ہمیں ان کے ان کارناموں کا تذکرہ مقصود ہے جس کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے۔

یوں تو بنیادی طور پر سرسید ایک سیاسی رہنما تھے۔ انھوں نے براہ راست اردو ادب کے موضوع پر ایک قلم نہیں اٹھایا لیکن پھر بھی انھیں جدید اردو نثر کے معاروں میں شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ بالواسطہ طور پر ان کی اردو خدمات روز بروز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ دعوای حق بجانب ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناپیر پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ شبلی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفاہی مشن اور اصلاح کی حیثیت پر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئی ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔“

سرسید نے قدیم روایات سے ہٹ کر ’مادیت‘، اقلیت، ’نیمحریت‘ اور حقائق نگاری کی طرف خاص توجہ کی۔ بلاشبہ سادہ نثر نگاری کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی، لیکن اس کے موضوعات و مضامین محدود تھے۔ اس طرح دلی کالج کی خدمات تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے

۱۷۔ بحوالہ نصاب ص ۶۱

۱۸۔ نصاب ص ۵۸

ہیں کہ اس کا مقصد بھی جدید علوم و فنون کی اشاعت پر موقوف تھا۔ اور جہاں تک غالب کی نثر نگاری کا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو نثر کو ایک نئی راہ دکھائی۔ لیکن ان کی نثر میں بھی زندگی کے متنوع و گوناگون مسائل کا فقدان ہے اور پھر اس کا حلقہ اثر بھی ان کے دوستوں کی محفلوں سے باہر نہیں بڑھ سکا۔ زندگی کے متنوع اور فطری و عصری مسائل سے جس نے سب سے پہلے اردو ادب کو روشناس کرایا وہ سرسید ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے ادب کا درشتہ زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

”کہنے کو جدید نثر فورٹ ولیم مرحوم دہلی کالج اور غالب کے خطوط میں فروغ پا چکی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جدید نثر جس کے دامن میں علوم جدید سمائی ہو، جو روح عمر اور نئی فکر سے آشنا ہو، سرسید ہی کی صاف و شفاف کھڑی بلکہ بعض اوقات کھردری عبارت میں ملتی ہے۔ ”تہذیب الاخلاق“ ہی کے صفحات پر نئی علمی نے جنم لیا ہے، وہ نثر جس میں سیاسی، اصلاحی اور علمی خیالات کے اظہار کی توانائی تھی۔“ ۱۷

تہذیب ہو یا معاشرت، معشیت ہو یا سیاست، تاریخ ہو یا علمی مباحث گویا تمام شعبہ ہائے زندگی پر سرسید نے اپنے تراش قلم کا جو ہر دکھایا اور اسے انتہائی پہنچایا۔ ڈاکٹر سید عبدالرشید نے چند لفظوں میں ان کی خدمات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادی موضوع اور آزادی اسلوب کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل پرست اور تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔“ ۱۸

اردو صحافت نگاری کا آغاز اگرچہ انیسویں صدی کے روائل ہی سے ہو چکا تھا۔ جام جہاں نادر ۱۸۲۲ء

۱۷ اردو کا المیہ ص ۱۱ - ۲۱۰

۱۸ میرامن سے عبدالحق تک ص ۹۵ - ۹۴

شمس الاخلاق (۶۱۸۲۳) اور دہلی اردو اخبار (۶۱۸۳۶) وغیرہ ملاحظہ کر اردو اور فارسی کے اخبار تھے "سید الاخبار" سرسید کے بھائی سید محمد نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا جس میں سرسید بھی کبھی کبھار مضامین لکھا کرتے تھے۔ یہ ان کا ابتدائی تجربہ تھا جو ان کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ ۱۸۴۵ء میں ماسٹر رام چندر کی ادارت میں دہلی سے ایک پرچہ "فوائد الناظرین" کے نام سے جاری ہوا۔ اس میں خبروں کے پہلو بہ پہلو انگریزی کتابوں اور سالوں کے تراجم بھی شائع ہوتے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں "فوائد الناظرین" کو یقیناً بارہ حاصل ہے لیکن اس میں انسانی زندگی کے مسائل کا فقدان تھا۔

سرسید نے سوسائٹی کے اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ "اردو تہذیب الاخلاق" کے ذریعے اردو صحافت کو ایک نیا موڑ اور ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ انھوں نے سادہ اور سہل شریکی بنیاد ڈالی اور اسے ایسے ڈانڈے سے روشناس کرایا جس پر دیوپری نہیں بلکہ بنی نوع انسان رواں دواں تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ انسانی زندگی کی غمازی، ترجمانی اور عکاسی کرنے لگی۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ "تہذیب الاخلاق" کے اجرا کے تین چار مہینے بعد ہی سرسید کی مخالف شروع ہو گئی اور "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں متعدد رسالے جاری کئے گئے جن کا مقصد سرسید کے نظریات و خیالات کی تردید کرنا تھا۔ اس طرح جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مباحثانہ اور مناظرانہ انداز نے اس زمانے کے اکثر مضمون نگاروں کو بلند پایہ مضمون نگار بنا دیا۔ چونکہ سرسید کی زبان نہایت صاف شستہ، عام فہم اور لفظی تکلفات سے مبرا و موافق تھی اس لئے ان کے مخالفین کو بھی ان کے جواب میں ان ہی جیسا انداز تحریر اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح سرسید کی غیر شعوری تقلید سے ان کے ہم عمر مضمون نگاروں نے اردو نثر کو شکل پسندی اور لفظی گورکھ دھندوں سے آزاد کرنے میں اہم رول کیا۔ ڈاکٹر محمد امین الدین قادری نے اسے معترف ہیں۔

سرسید کے دوستوں اور طرف داروں کے کارناموں کے علاوہ ان کے مخالفوں اور بدخواہوں نے بھی نادانستہ طور پر اس رسالہ کی تقلید میں کئی پرچے اس کے جواب میں لکھے اور لطف یہ کہ ان میں اس قسم کی زبان استعمال کی گئی جیسی کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں استعمال کی تھی اس طرح اردو دانشا پرداز غیر ارادی طور پر سادہ شریکی کی

طرف مائل ہو گئے اور انھیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ہم قدیم ڈگر سے ہٹ کر
چل رہے ہیں۔ پچاس پچاس سال کے عرصے میں اردو زبان میں سادہ اور بے
تکلف شکر کا اتنا ذخیرہ اور شہکاروں کی اس قدر فراوانی ہو گئی کہ اگر اس
کے متعلق باضابطہ طور پر تعلیم دی جاتی یا اہل ملک کو اس طرف بار بار متوجہ کر لیا
جاتا تو نصف صدی سے کم میں اس قدر کامیابی قطعی ناممکن تھی۔

بہر حال اردو زبان و ادب پر سرسید کے راہ قدر احسانات ہیں۔ ان کا قدم اگر بساط صحافت
پر نہ پڑا ہوتا تو شاید اردو نشراتی کم مدت میں اجتماعی زندگی کی ترجمان نہ بنتی اور نہ علمی و تحقیقی
مطالب و مفہوم کے اظہار کا وسیلہ بنتی۔

تصانیف سرسید کی تصانیف جو کتابوں اور رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں وہ تین حصوں
میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، مذہبی، تاریخی، اور علمی جن کی مجموعی تعداد ۳۳ ہے۔ ان
کتابوں میں سے بعض اہم کتابوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے یہاں ان کا تفصیلی ذکر تین اوقات
کے مترادف ہوگا۔ پچاس صرف نام شمار ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ہر کتاب کے بعد قوسین میں
سال اشاعت بھی درج کیا گیا ہے۔

مذہبی ۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۸۴۲ء) ۲۔ تحفہ حسن (۱۸۴۲ء) ۳۔ کلمۃ الحق (۱۸۴۹ء) -
۴۔ راہ سنت و درّ بدعت (۱۸۵۰ء) ۵۔ نئیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ (۱۸۵۲ء)
۶۔ کیبائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ (۱۸۵۳ء) ۷۔ تبیین کلام (۱۸۶۳ء) ۸۔ سالہ طعام
اہل کتاب (۱۸۶۸ء) ۹۔ خطبات احمدیہ (۱۸۷۰ء) ۱۰۔ تفسیر القرآن (۱۲۹۶ھ تا ۱۳۰۹ھ)
۱۱۔ رسالہ ابطال غلامی ۱۲۔ انظر فی بعض مسائل الامام الغزالی (۱۲۹۷ھ) ۱۳۔ جواب امہات المؤمنین
تاریخی ۱۴۔ حام جم (۱۸۴۰ء) ۱۵۔ آثار الضادید (۱۸۴۴ء) ۱۶۔ سلسلہ الملوک (۱۸۵۲ء)

۱۷۔ اردو کے اسالیب بیان ص ۳۷

۱۸۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات جاوید از حالی" اور اردو نشر کی تاریخ میں سرسید کا
مقام از سلیمان محمود حسین

۱۹۔ بعض مصنفوں نے اس کا نام "احکام طعام اہل کتاب" بھی لکھا ہے۔

۱۷- تاریخ ضلع بجنور (۱۸۵۶ء) تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء) ۱۹- اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء)

۲۰- ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر دیویو (۱۸۷۲ء)

علمی : ۲۱- انتخاب الاقویں (۱۸۷۰ء) ۲۲- تسہیل فی جبر النقیل (۱۸۷۷ء) ۲۳- فوائد الافکار فی

اعمال الفرہار (۱۸۷۷ء) ۲۴- قول مبین در ابطال حرکت زمین (۱۸۷۵ء) ۲۵- علاج

دو

ہومیو پیتھک (۱۸۷۷ء)

متفرق : ۲۶- سفر نامہ لندن ۲۷- سیرت فریدیہ (۱۸۷۷ء) ۲۸- تحقیق لفظ نصاریٰ ۲۹- ہندوستان

کے طریقہ تعلیم پر اعتراض (۱۸۷۲ء) ۳۰- رسالہ لائل محمد زآف انڈیا ۱۸۷۰ تا ۱۸۷۱ء

۳۱- انشاء اللہ ۳۲- نادان خدا پرست ۳۳- سفر نامہ پنجاب (۱۸۸۵ء) اس کے علاوہ سرسید نے آئین

اکبری کی تصحیح کی تھی

سرسید احمد خاں کے نامور رفقا

وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں اپنے مشن کو فروغ دینے کیلئے اولوالعزم

اور باہوصلہ دانشوروں کی رفاقت و حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ سرسید احمد خاں ایسے ہی خوش

نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں وسیع النظر اور باشعور عالموں، ادیبوں، شاعروں اور مدبروں

کی ایک معتد بہ جماعت مل گئی تھی جس نے دائے درے سخن اور قدمے ان کی مشن کی

کامیابی کے لئے کوشش کر کے اسے زندگی اور توانائی عطا کی اور نہ صرف ان کی زندگی میں

ان کا ساتھ دیا بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی تحریک کو زندہ رکھا اور اسے ترقی دینے

کے لئے کوشاں رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی تصنیف سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا

میں سرسید کے ان ساتھیوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے جن میں مجموعی طور پر ستائیس نام شامل

ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے مطابق اس فہرست میں مزید ناموں کے اضافے کی گنجائش ہے۔

لے ملاحظہ ہو سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا میں ۸۴-۸۳

لیکن ہم یہاں صرف ان ہی لوگوں کا ذکر کریں گے جنہوں نے سوسائٹی کے مشن کی تکمیل میں ان کی معاونت کی اور اس محاذ پر پوری تہمت ہی سے ان کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ محسن الملک وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکار اللہ، مولوی سمیع اللہ خاں، مولانا وحید الدین سلیم اور راجہ جے کشن داس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکار اللہ کے کارناموں پر دنی کالج کے ضمن میں تبصرہ کیا جا چکا ہے اس لئے ان کا ذکر دوبارہ نہ کیا جائے گا۔

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک سرسید کے مشن کے سب سے بڑے مؤید اور ان کی تحریک کے زبردست مبلغ تھے جس سال سائنٹفک سوسائٹی وجود میں آئی وہ اسی سال اس کے رکن بنے۔ ان کی تصانیف کو کوئی بلند مرتبہ حاصل نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے وہ مضامین ہیں جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ "اور تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین صحافت نگاری کے اعلیٰ نمونہ ہیں جن سے اردو صحافت کو ایک نئی راہ ملی ہے۔

نواب محسن الملک کا نام سید مہدی علی خاں تھا۔ وہ ۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاواہ کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم اٹاواہ میں ہی حاصل کی۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد ان کے ذہن میں دینی امور کے متعلق نئے نئے خیالات ابھرنے لگے۔ اس ضمن میں وہ شیعہ اور سنی مذاہب کے اختلافات پر غور و فکر کی طرف مائل ہوئے اور آخر کار کافی تفحص و تحقیق کے بعد انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے سنی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے "آیات بنیات" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو شیعہ عقائد کی تحقیق و تنقید کے موضوع پر اس زمانے کی اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

محسن الملک نے ضلع کلکٹری میں دس روپیہ ماہوار تنخواہ پر فخر کی حیثیت سے

سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ضلع کلکٹر مسٹر اپلن ہوم نے ان کے کام سے خوش ہو کر اہلہد کے عہدے پر ان کا تقرر کر دیا۔ اس کے بعد ہی غدڑ کا واقعہ پیش آیا جس میں انہوں نے انگریزوں کی کافی مدد کی۔ چنانچہ امن و امان کی بحالی کے بعد وہ اسی ضلع میں پہلے سررشتہ دار اور بعد ازاں تحصیلدار بنائے گئے۔ اٹا وہ کا مدرسہ اور منصفی و کوتوالی کی عمارتیں ان ہی کے زیر نگرانی تعمیر ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوئی اور پھر یہ دوستی یک جان و دو قالب کی مصداق بن گئی، حتیٰ کہ کبھی کبھی سرسید ان کے ساتھ اپنے تعلقات کے اظہار کے لئے تمکک لکھی اور محب و محبوب کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ اور وہ بھی اکثر "انا احمد و احمدنا" (میں احمد (سرسید احمد) ہوں اور احمد ہمارا ہے) کہہ کر اس ارتباط کی توثیق کرتے رہتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں محسن الملک نے ڈپٹی کلکٹر کا امتحان پاس کیا جس کے نتیجے میں وہ

۱۸۶۶ء میں مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں کشنور آباد کی سفارش پر

گورنمنٹ نے انہیں خلعت عطا کیا۔ اس اعزاز پر سرسید نے انہیں ولایت سے تہنیتی خط بھیجا

تھا۔ ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات ریاست حیدرآباد نے حاصل کر لیں۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سالار جنگ

کے سکریٹری مقرر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ریاست کے معتمد اور سکریٹری بنائے گئے

بعد میں انہیں اپنی کارکردگی کی بنا پر ریاست کی طرف سے محسن الملک محسن الدولہ منیر نواز

جنگ ہمدی علی خاں بہادر کا خطاب اور سہ ہزار روپیہ عطا ہوا اور تین ہزار روپیے

ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ ریاست حیدرآباد کے بعض معاملات طے کرانے کی غرض سے انہوں

نے انگلینڈ کا سفر کیا جو ان کے لئے کسی اعتبار سے نہایت مفید ثابت ہوا۔ اس سفر کے دوران

ان کی انگلستان کے متعدد عمائدین اور دانشوروں سے ملاقات ہوئی اور مسٹر کلیڈ سٹون

وزیر اعظم انگلینڈ سے ایسے دوستانہ روابط قائم ہوئے کہ دونوں کے درمیان تاحیات

خط و کتابت جاری رہی۔

۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱

۱۸۹۳ء میں محسن الملک ملازمت سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ چلے آئے یہاں وہ سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اپنی سکریٹری شپ کے زمانے میں انھوں نے کالج کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا اور اپنی پزیرشوش اور سحر آفریں تقریروں سے اتنا روپیہ جمع کرایا کہ تمام قرضے ادا کرنے کے بعد بھی اس کی تحویل میں کافی رقم باقی رہ گئی۔ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے انھیں "قیصر ہند" کا طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۰۷ء میں کالج کے کام سے ۵۵ شملہ گئے ہوئے تھے کہ ۱۶ اکتوبر کو وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جسدِ خاکی کو شملہ سے علی گڑھ لاکر سرسید کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کیا گیا جاتی نے ان کے انتقال پر ایک رباعی اور ایک قطعہ کہا تھا۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے۔

مہدی کے لئے قوم غذا دل ہے ساری

کہرام ہے کشمیر سے تارا اس کمار

سرسید کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے عقلی افکار کے اثرات کو قبول کرنے والوں میں محسن الملک کو اولیت حاصل ہے انھوں نے سرسید کی عقلیت میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ سرسید کے ساتھ رفاقت کی ایک اہم اساس نیچر کی اہمیت کا ادراک و اعتراف تھا۔ محسن الملک نے بھی نیچر کو تسلیم کیا۔ لیکن سرسید کی طرح اس کی ہمہ گیری کو قبول نہیں کیا۔ ان کے نزدیک نیچر سے مراد طبیعت اور طبائع موجودات ہے۔ اور قانونِ فطرت اس باقاعدہ تربیت کا اظہار ہے۔ جو قدرتی اشیاء میں پائی جاتی ہے اور جس کو ادبِ بابِ نظر کی ایک کافی تعداد نے دیکھا ہے۔

حالی اور شبلی نے محسن الملک کے طرز نگارش کی بڑی تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تصانیف کو کوئی ادبی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ طرزِ ادا اور سلاست و صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ اور بیان اور منطقی استدلال تو ان کی ان تحریروں میں معراجِ کمال

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء ص ۳۳۵

۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو حصہ شراذرام بابو سکینہ ص ۷۷

کی حد تک پہنچ گیا تھا: بحیثیت مجموعی اردو صحافت کو ترقی دینے میں سرسید کے بعد ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

تصانیف

(۱) رسالہ میلاد شریف، مصنفہ ۱۸۶۰ء

(۲) آیات بنیات (۱۸۶۰ء)

(۳) تقلید عمل بالحدیث

(۴) کتاب المحبت

(۵) والشوق مکاتیب

(۶) مسلمانوں کی تہذیب

(۷) مکاتیب الخلائق۔ یہ محسن الملک اور سرسید کے ان خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو ایک دوسرے کو لکھے گئے تھے۔

(۸) مکمل مجموعہ لکچرہ۔ یہ ان کے لکچرہ کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے "تہذیب الاخلاق" اور "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" میں لکھے تھے۔ انھوں نے خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سرسید کی مدد کی تھی۔

نواب وقار الملک:

سرسید کے زیر اثر ملک میں بے شمار شخصیتیں ابھریں، جنہوں نے قوم کی گمراہی قدر خدمات انجام دیں۔ وقار الملک بھی سرسید کے ان ہی رفقا میں شامل ہیں جن کی زندگی کا مقصد قوم کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح تھا۔ وہ سرسید کے تعلیمی تحریک کے اخلاقی پشت پناہ اور روح رواں تھے۔ انھوں نے اپنی سبھی نفسی سے اس تحریک کے دائرہ اثر و نفوذ کو وسعت و ہمہ گیری عطا کی۔

وقار الملک کے والد فضل حسین مراد آباد کے قصبہ سنبھل کے رہنے والے تھے وہ ملازمت کے واسطے سراوہ ضلع میرٹھ میں مقیم تھے کہ ۱۸۶۹ء میں ۱۲۵ھ مطابق

۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی تاریخی نام چراغ علی رکھا گیا۔ یہی لڑکا بڑے ہونے پر مشتاق حسین کے نام سے مشہور ہوا اور اب وقار الملک کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ابھی مشتاق حسین چھ ماہ کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ۲۸ اگست ۱۸۴۱ء کو ان کے سر سے باب کا سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ ان کی دائرہ بتول النساء بیگم اپنے درہمیتیم کو ساتھ لے کر امر دہہ میں اپنے والد مولوی انور علی کے یہاں چلی آئیں۔ قدیم دستور کے مطابق جب مشتاق حسین چار سال چار ماں اور چار دن کے ہوئے تو حافظ غلام بنی قریشی نے رسم بسم اللہ ادا کی۔ اس کے بعد انھیں محلہ کے مکتب میں بیٹھایا گیا جہاں انھوں نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد عربی کی کتابیں تفسیر جلالین تک مولوی واقف علی سے پڑھیں، ۱۸۵۴ء میں ۵۵ امر دہہ تحصیل کے اسکول میں داخل ہوئے پانچ سال تک وہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں انھوں نے لڑکی انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن انجینئرنگ میں دل چسپی نہ ہونے کی وجہ سے ایک سال بعد بغیر سند حاصل کیے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ اپنے پھوپا امام الدین کے پاس ہومراد آباد میں تحصیلدار تھے عدالت کا کام سیکھنے کی غرض سے چلے آئے اور کلکٹری میں امیدوار کی حیثیت سے کام کرنے لگے اسی زمانہ میں ان کے پھوپا نے اپنی منجھلی لڑکی سے ان کا نکاح کر دیا۔ ستمبر ۱۸۶۰ء میں مشتاق حسین تحصیل مراد آباد میں بیس روپے ماہوار پر انکم ٹیکس کے عارضی طور پر مقرر ہوئے لیکن سات ماہ بعد جو ب کام ختم ہو گیا تو ان کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔

اسی زمانہ میں سرسید بھی بحیثیت صدر الصدور مراد آباد ہی میں متعین تھے۔ چنانچہ یہیں نشی امام الدین کی وساطت سے مشتاق حسین کی ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی کچھ دنوں کے بعد ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کا غازی پور تبادلہ ہو گیا۔ اور ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء کو مشتاق حسین تحصیل میں اطلاق نویسی پر مامور ہو کر امر دہہ چلے گئے۔ یکم جولائی ۱۸۶۸ء کو

۱۔ محمد اکرام اللہ خاں، وقار حیات ص ۱

۲۔ محمد اکرام اللہ خاں، وقار حیات ص ۳

انھیں نصر کے عہدے پر ترقی دے کر علی گڑھ بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۲۱ مئی ۱۸۶۲ء تک اسی عہدے پر مامور رہے۔ علی گڑھ میں انھیں پہلی بار سرسید کی ماتحتی میں کام کرنے اور ان سے زیادہ قریب آنے کا موقع ملا۔ ۱۸۶۸ء میں جب سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس جانے لگے تو انھوں نے ۱۸ اگست ۱۸۶۸ء کو مشتاق حسین کی سروس بک پر مندرجہ ذیل۔
دیپارک لکھا :-

منشی مشتاق حسین سے رشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق نہایت
مختی اور نہایت کار گزارہ..... افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری
پر مجھ کو ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر..... جس عہدے
یہ شخص نوکر ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ
لیاقت اس میں موجود ہے۔“ ۲۷

۱۸۶۳ء کے شروع میں مشتاق حسین کو (علی گڑھ) میونسپلٹی کے ممبر منتخب
ہوئے یہاں بھی انھوں نے بہتریں کارکردگی کی سند حاصل کی۔ بالآخر سرسید کے دوسرے
رفقا کی طرح وہ بھی ۱۸۶۵ء میں ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں انھوں نے
سولہ برس تک مختلف عہدوں پر مامور رہ کر ریاست کی نمایا خدمات انجام دیں۔ جن کے
صلے میں انھیں وقار الملک کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے نواب سرآسمان
جاہ کی خدمت میں اس بنا پر اپنا استعفا پیش کر دیا کہ صاحب موصوف کو ان پر پہلے جیسا
اعتماد نہیں رہ گیا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۲ء تک ان کے وظیفے و عیزہ کا تصفیہ ہو گیا۔
اس کے بعد ۲۳ اکتوبر کی رات کو انھوں نے حیدرآباد کو خیر باد کہا اور مستقل سکونت
کے ارادے سے علی گڑھ چلے آئے یہاں وہ سرسید کی تحریک میں شامل ہو کر پوری تڑپ
کیساتھ اس کی کامیابی کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء میں وہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج

۲۷ ایضاً ص ۹

۲۷ کوالہ وقار حیات ص ۹

کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور جب تک علی گڑھ میں رہے کالج کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو لارڈ منٹو وائسرائے اور گورنر جنرل ہند کالج کے معاینے کے لئے علی گڑھ تشریف لائے تو انھوں نے وقار الملک کو نواب کا خطاب عطا کیا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو مسلم یونیورسٹی کے قیام کو روپیہ عمل لانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تو وہ اس کے انچارج سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس انتخاب کے بعد انھوں نے ایک اپیل شائع کی جس میں ملت کے دردمند اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

میرے بھائیو! میری آخری عمر کی صرف ایک بڑی تنہا یہ ہے کہ اب تم میں سے ایک شخص اپنا یہ فرض سمجھ کر کہ اسلامی یونیورسٹی کو مکمل کرنا ہے اپنی پوری کوشش چنڈہ کی فراہمی میں صرف کرے اور تاج پوشی کے مبارک جشن سے پہلے کم از کم بیس لاکھ روپیہ فراہم کرے اپنی قومی زندگی کا عمل ثوب دے دے۔

کالج اور مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلے میں غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے وقار الملک کی صحت بری طرح متاثر ہوئی اور ان کی طبیعت مستقلاً خراب رہنے لگی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں وہ یونیورسٹی کمیٹی کے معتمد اعزازی کے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ صحت کی بحالی و تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کبھی کبھی وہ سواری اور دہرہ دونوں کا سفر کر لیا کرتے تھے ایک بار شملہ گئے ہوئے تھے کہ کالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد وہ فوراً امر وہ چلے گئے۔ تقریباً سال بھر علاج ہوتا رہا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو شب کے دس بجے ان کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔

ان کی وفات پر مدیر معارف نے انھیں ان الفاظ میں خراج تحسین

۱۔ خلیق احمد نظامی، پیش لفظ خطوط وقار الملک ص ۵

۲۔ بحوالہ وقار حیات ص ۵۶۶

۳۔ ایضاً ص ۷۷

پیش کیا تھا۔

”نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا
مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آدانی کا مرثیہ پڑھا
مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقہان پر نوحہ کہا۔ مولانا حالی کو
دخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن دری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا۔ لیکن
وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولو العزماتہ اخلاق
کی گم شدگی پر فریاد۔ وہ ہمارے کار فرما قافلے کا آخری مسافر تھا
اس کے بعد وہ ددربو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔

نواب صاحب کی شخصیت ہماری قومی تاریخ میں علمی دادی اعتبار سے نہیں تہذیبی و سیاسی
نقطہ نظر سے اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ہماری تہذیب کے اعلا قدردوں کے امین اور آئینہ دار تھے انھوں
نے ہماری تہذیب کے ان عناصر کو جو جدید علوم و فنون کے شانہ بہ شانہ چل سکتے تھے پر دان چڑھایا
اور ان کی افادیت و برتری کو ثابت کیا۔ ان کی کوئی مستقل و طبع زاد تصنیف موجود نہیں۔ لیکن تہذیب
الاخلاق کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر نواب صاحب باقاعدہ طور پر لکھنے کا سلسلہ جاری
رکھتے تو اردو ادب کو یقیناً ایک نیا آہنگ اور اسلوب عطا کر جاتے۔

مضامین تہذیب الاخلاق کے علاوہ ان کی ایک اہم علمی یادگار ”مرکز نشہ نیپولین بونا پارٹ“ ہے
جو قیام علی گڑھ کے زمانے میں انگریزی کی ایک کتاب ”فریچ ریویوشن اینڈ نیپولین“ سے اردو میں ترجمہ
کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۸۷۰ء میں وقار الملک نے سرسید کے بعض سوالوں کے جواب میں ایک ضخیم رسالہ بھی لکھا تھا
جس کی تصنیف پر انھیں انعام ملا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۰۲ء میں ”خطوط وقار الملک“
کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے۔

۱۲ نوالہ خطوط وقار الملک ص ۲

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی :-

سرسید کے افق عظمت کا ایک روشن ستارہ مولوی چراغ علی بھی تھے۔ وہ شروع ہی سے مذہبی تحقیقات اور مناظرے سے خاص دل چسپی رکھتے تھے اور معتز ضنین اسلام کے رد میں مضامین اور رسالے لکھتے رہتے تھے۔ سرسید سے ملاقات کے بعد وہ ان کے دست و بازو بن گئے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ان کے مشن کی کامیابی کے لئے وقف کر دینے کا عزم ارادہ کر لیا۔

مولوی صاحب کا تعلق سر زمین کشمیر تھا۔ ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ جن کے چار بیٹے "چراغ علی" عنایت علی اور منصب علی تھے۔ ان میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ مولوی محمد بخش اردو، فارسی اور عربی میں اچھی استعداد رکھنے کے علاوہ انگریزی سے بھی خوبی واقف تھے۔ وہ میرٹھ، بہار، نپور اور پنجاب میں سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ اور دوران ملازمت ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔

والد کے انتقال کے وقت چراغ علی کی عمر گیارہ برس کے قریب تھی۔ ان کی تعلیم ان کی دادی اور والدہ کے زیر نگرانی میرٹھ میں ہوئی۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث و تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے اور ضلع بستی میں بیس روپے ماہوار پرنسٹنٹ محرم ملازم ہو گئے اس ملازمت کے درمیان انھوں نے درسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور محنت شاقہ سے نہ صرف عربی، فارسی، اور انگریزی پر عبور حاصل کر لیا۔ بلکہ عبرانی اور سریانی میں بھی بقدر ضرورت دستگاہ بہم پہنچائی۔ اسی زمانے میں ان کے والد کے ایک دوست محمد ذکریا بہ سلسلہ ملازمت بستی آئے اور انھوں نے چراغ علی کے سرپرست شفقت رکھا۔ جب وہ

۱۔ حاد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ص ۳۷۲۔ لیکن سکینہ نے سال پیدائش ۱۸۴۴ء لکھا ہے (تاریخ ادب

اردو صفحہ ۳۷۵)

۲۔ عبدالحق، چند ہم عصر ص ۳۸

بستی سے تبدیل ہو کر لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے چراغ علی کو ایک خط لکھا کہ لکھنؤ کے جوڈیشیل کمشنر مسٹر گورادسلی آپ کے والد کے دوست ہیں اگر آپ لکھنؤ آکر ان سے میں تو بعید نہیں کہ وہ آپ کو کوئی معقول جگہ دلادیں۔ چنانچہ ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳ کے قریب چراغ علی نے لکھنؤ پہنچ کر کمشنر موصوف سے ملاقات کی۔ اسلئے انھوں نے چراغ علی کا تقرر منصرم کے عہدے پر کر دیا۔ بعد میں مولانا صاحب کاتبالہ سیتاپورہ کو ہو گیا۔

اس وقت چراغ علی نہ صرف سرسید کی تحریک سے واقف ہو چکے تھے بلکہ غالباً نہ طور پر ان کے معتقد بن چکے تھے۔ انھوں نے سرسید سے خط و کتابت بھی شروع کر دی تھی اور تہذیب الافلاق میں مضامین بھی بھیجے لگے تھے اسی دوران سرسید لکھنؤ آئے تو چراغ علی نے سیتاپورہ سے لکھنؤ پہنچ کر ان سے ملاقات کی۔ کچھ دنوں کے بعد جب ریاست حیدرآباد کی طرف سے ترجمے کا کچھ کام سرسید کے سپرد کیا گیا تو انھوں نے اس کے لئے نولوی چراغ علی کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے رخصت لے کر علی گڑھ چلے آئے اور ترجمے کا کام انجام دینے لگے، جس کی انھیں اجرت ملتی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں جب نواب سالار جنگ نے سرسید کو خط لکھ کر مخصوص قسم کی سلاجیتوں کے حامل ایک ہونہار اور معقول شخص کی تلاش میں مدد کی درخواست کی تو انھوں نے چراغ علی کو حیدرآباد بھیج دیا۔ وہ وہاں چار سو روپیہ ماہوار مشاہرے پر اسٹنٹ ریویونیو سکریٹری اور کالہ معتمد مال کڈاری مقرر ہوئے۔ اس وقت ریویونیو سکریٹری کے عہدے پر محسن الماں ممکن تھے۔ جب وہ پولیٹیکل اینڈ فائننس ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری مقرر ہوئے تو چراغ علی چند روز سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر محکمہ مالگزامتی کے خمدان مقرر کر دئے گئے۔ محسن الملک کی سبکدوش ہونے کے بعد انھیں سکریٹری پولیٹیکل اینڈ فائننس ڈپارٹمنٹ مقرر کیا گیا۔

چراغ علی کا انتقال ۱۱ جون ۱۸۹۵ء کو ممبئی میں ہوا۔ جہاں وہ بہ مسلسلہ ملان مقیم تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ اپنی اس مختصر زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے اسلام

سہ مولوی عبدالحق چند ہم عمر میں

سہ ایضاً

کی حمایت و صیانت میں صرف کیا اور اپنے زور قلم اور قوت استدلال سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر انگریزوں کے الزامات کے منہ توڑ جواب دئے۔ وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے تاہم معصوم بچوں سے باتیں کرنے اور ان کے درمیان وقت گزارنے میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ تعلیم نسواں کے فروغ سے بھی انھیں کافی دل چسپی تھی۔ "تہذیب الاخلاق" کے اکثر و بیشتر مضامین ان کے اسی دینی و اصلاحی جذبے اور جوش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی دوسری تصانیف سے بھی اپنی حمیت اور ملی غیرت و دردمندی کی شاعریں پھوٹی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک طرز نگارش کا تعلق ہے ان کی تحریر میں عقیدہ لفظی پیچیدگی بیان اور عبارت آرائی سے پاک و صاف ہوتی ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے پورے غور و فکر اور تحقیق و تفتحص کے ساتھ اس کا حق ادا کرتے تھے انھوں نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی تاہم ذاتی کوشش سے اتنی استعداد بہم پہنچالی تھی کہ عیسائیوں کی کتابوں کے جواب انگریزی ہی میں لکھے ہیں مندرجہ ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں

دینی :-

(۱) **تعلیقات**۔ پادری عماد الدین (مرتد) نے اپنی کتاب "تاریخ محمد" میں اسلام پر متعدد اعتراضات کیے تھے؛ اس رسالے میں ان کے جوابات دیے گئے ہیں، یہ ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

(۲) **(تحقیق جہاد)** *Critical Exposition of popular JEHAD*
 مولوی صاحب کی یہ معرکہ آرا کتاب انگریزی میں ہے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ایسے بزدل شمشیر فروغ حاصل ہوا ہے، یہ کتاب اسی اعتراض کے رد میں لکھی گئی ہے۔

(۳) **Reform Under Muslim Rule**

مولوی صاحب نے یہ کتاب پہلے انگریزی میں لکھی تھی بعد میں انھوں نے اس کے چودہ صفحات کا اردو میں ترجمہ کر کے "اعظم الکلام اور لقاء الاسلام" کے عنوان سے شائع کیا
 (۴) **Mohammad the True prophet** (محمد صلیم نبی برحق)

اس تصنیف میں حضور اکرم کے عادات و اطوار سے متعلق تمام اعتراضات و شبہات کا تحقیقانہ اور عالمانہ طور پر ازالہ کیا گیا ہے۔

(۵) اسلام کی دنیوی برکتیں - اس رسالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام سے کیا کیا برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

(۶) قدیم قوموں کی مختصر تاریخ - ایام الناس نامی ایک مختصر اور دو رسالے میں اس کے مصنف نے قرآن پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے جو دنیا میں کبھی موجود نہیں تھیں اس کتاب میں اس اعتراض کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

سرکاری تصانیف :-

(۷) مہجٹ - (میزانہ) ریاست حیدرآباد کا میزانہ کتابی شکل میں سب سے پہلے مولوی چراغ علی نے مرتب کیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو صفائی اور اقتصاد موصوف کے میزانہ میں ہے وہ بعد کے میزانہ میں نہیں۔

(۸) ایڈمنسٹریشن رپورٹ (رپورٹ نظم و نسق) سال ۱۸۸۷ء کی رپورٹ جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۹) حیدرآباد کن اینڈ سالار جنگ - یہ کتاب انگریزی زبان میں چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

بی بی ہاجرہ ساریہ قبلیہ اور العلوم جدیدہ والاسلام ان کی نامکمل تصنیف ہیں۔ ان کے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب "براہین احمدیہ" کی تصنیف میں بھی مدد کی تھی۔ علاوہ بریں بے شمار مضامین جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے ان کی یادگار ہیں۔

مولانا وحید الدین سلیم :

سرسید کے رفقا میں وحید الدین سلیم کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ جدید شاعری

میں نہ صرف اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ ماہر سائنات، صاحب نظر صحافی اور صاحب کمال انشا پرداز کی حیثیت سے بھی جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ کئی برسوں تک انھیں سرسید، حالی اور شبلی کی صحبت نصیب رہی جس نے ان کے کج رجحان کو جلا بخشی۔ بقول خود ان کے ”مجھے تو سید صاحب نے انسان بسایا اور نہ میں نہ ملاٹا رہتا۔ کہیں میاں جی گری کرتا یا کسی مسجد میں مؤذنی کرتا ہوتا۔“

وجید الدین کی تاریخ پیدائش ابھی تک پردہ خفا میں ہے۔ ڈاکٹر منظر عباس نقوی نے مختلف ماخذ سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۸۵۹ء قرار پاتا ہے۔ سلیم نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن پانی پت میں ہی حاصل کی۔ وہاں انھوں نے ایک شریف خاتون شمس النساء سے قرآن حفظ کیا بعد ازاں میر علی تقی حمزہ سونا پتی سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اس کے بعد باپ حاجی فرید الدین کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اٹھ گیا پختا پخت حضرت غوث علی شاہ نے جن کے یہاں ان کا گذر والدہ کا کام کیا کرتی تھیں، ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ موصوف نے سلیم کا داخلہ میونسپل بورڈ کے ایک مقامی اسکول میں کرایا۔ اسی زمانے میں وہ شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے اور شاہ صاحب کی مدح میں ایک سو ایک اشعار لکھا ایک قصیدہ لکھا جس کے صلے میں انھوں نے ایک جے پوری اشرفی اور ایک نہر تار بنارسی چادر عطا کی۔

وجید الدین ۱۸۸۲ء میں میڈل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب میں اول آئے۔ اس کے بعد اور نیٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں دو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ لیکن جب سالانہ امتحان میں اول آئے تو وظیفے کی یہ رقم بڑھ کر پانچ روپے ہو گئی۔ لاہور میں انھوں نے فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کی تعلیم مولانا عبداللہ ٹونکی سے اور عربی ادب اور تفسیر کی تعلیم مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کی۔ فاضل کے امتحان میں اردو مضمون نگاری کو پرچے کا جواب ایک طویل نظم میں لکھا اس پر ممتحن بڑا خوش ہوا اور اسے اخبار میں سائے کرایا

۱۷ بروایت ڈاکٹر قاضی عبدالستار: رسالہ نوائے ادب اپریل ۱۹۷۱ء کو الہٰ آباد میں نظر دوسرا کارواں ۱۹۸۷ء ص ۱۷۱

۱۷ وجید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۱۲

۱۷ ایضاً ص ۱۵

اور لکھا کہ دنیا میں اس قابلیت کے لوگ بھی موجود ہیں کہ فاضل کے امتحان میں مضمون کے جواب میں ایسی پاکیزہ اور برجستہ نظم لکھ سکتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کے سلسلے میں منظر عباس نے درجہ بریلوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلیم نے لاہور میں منشی فاضل کے علاوہ انٹرنس کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ رام بابو سکسینہ نے بھی لکھا ہے کہ مولانا سلیم نے لاہور میں زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ لیکن مولوی عبدالحق جن کی ماتحتی میں انھوں نے داد المرحومہ حیدرآباد میں کئی برسوں تک کام کیا تھا، لکھتے ہیں "انگریزی نہیں جانتے تھے۔" وحید الدین جدید تعلیم سے واقف تھے۔ بقول مولوی عبدالحق.... مغربی تعلیم کا جو نشا ہے اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ سلیم کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے لاہور میڈیکل کالج سے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اپنے ماموں کے مشورے پر انھوں نے قانون کی تعلیم شروع کی، لیکن ماموں کے انتقال کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ ختم کر کے وہ پانی پت چلے آئے۔

مولانا سلیم کی ملازمت کا آغاز تقریباً ۱۸۸۷ء میں ایجرن کالج بھاؤل پور سے ہوتا ہے یہاں قریب ساڑھے تین برس تک السنہ شرقیہ کے استاد رہے اس کے بعد جنرل عظیم الدین خاں کے اصرار پر ۱۸۹۰ء کے اواخر میں انھیں رام پور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کا عہدہ قبول کرنا پڑا، لیکن اس کے چھ مہینے بعد جب عظیم الدین خاں کا قتل (۱۸۹۱ء) میں ہوا تو وہاں کی ملازمت سے دست بردار ہو کر وہ پانی پت چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد وہیں طبابت۔

۱۔ نوالہ وحید الدین سلیم حیات اور ادبی کارنامے ص ۱۵

۲۔ ایضاً ص ۱۷

۳۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۸۵-۸۴

۴۔ چند ہم عمر ص ۱۲۳

۵۔ ایضاً ص ۱۲۳

۶۔ نقوش (مکاتیب نمبر) ص ۲۶۹

شروع کی۔

حالی نے سرسید سے سلیم کی قابلیت کی بڑی تعریف کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں سرسید نے تار دے کر انہیں علی گڑھ بلایا۔ وہ مولانا حالی کے ساتھ علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں پچاس روپے ماہوار پر سرسید کے ادبی معاون (لٹریٹری اسٹنٹ) کی حیثیت سے وہ سرسید کی وفات (۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء) تک کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی ادارت میں بھی وہ سرسید کی مدد کرتے رہے۔ دریں اثنا وہ سرسید کے مضامین کے لئے مواد فراہم کرتے اور تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ درحقیقت یہی وہ زمانہ تھا جبکہ سرسید، حالی اور شبلی کے علاوہ دوسرے اہل علم اور عالی ظرف پیش واؤں کی صحبت میں رہ کر انہوں نے اپنی علمی استعداد اور اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔

سرسید کے انتقال کے بعد وحید الدین نے علی گڑھ ہی سے ایک رسالہ "معارف" کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ مئی ۱۸۹۸ء میں منظر عام پر آیا۔ لیکن علی گڑھ کی آب و ہوا ان کی صحت کو اس تہ آئی چنانچہ نومبر ۱۹۰۰ء میں وہ پانی پت چلے آئے اور ساتھ میں "معارف" کا دفتر بھی لیتے آئے۔ لیکن دسمبر ۱۹۰۱ء میں اسے اس لئے بند کرنا پڑا کہ اس کے خریداروں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سلیم کتابوں کی تجارت کرنے لگے، لیکن جب اس تجارت میں کوئی منفعت نظر نہیں آئی تو محسن الملک کی دعوت پر وہ دوبارہ علی گڑھ چلے آئے۔ محسن الملک نے سو روپیہ ماہانہ پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر کر دیا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے سے مولانا کا نام گزٹ میں اسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے پھینے لگا۔ اب محسن الملک کی وفات کے بعد وہ گزٹ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں حمید الدین اور چند نوجوانوں کے تعاون سے انہوں نے "ابن مترجمین" قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی علمی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈالنا تھا۔

۱۔ منظر عباس نقوی، وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۲۹

۲۔ ایضاً ص ۱۸۵

سلیم اور حمید الدین اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، جن کا کام ترجمہ شدہ کتابوں کی اصلاح کرنا تھا۔ جون ۱۹۰۹ء میں وہ شدید بیمار پڑے تو رخصت لے کر پانی پت چلے آئے اور وہیں سے جولائی ۱۹۰۹ء میں اپنا استعفا بھیج دیا۔

۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے سید میر جان نے مولانا شبلی کے مشورے سے "مسلم گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ مولانا شبلی کسی تقریب کے سلسلے میں پانی پت گئے تو انھوں نے اس اخبار کی ایڈیٹری کے لئے مولانا سلیم کو راضی کر لیا۔ چنانچہ لکھنؤ آکر انھوں نے "مسلم گزٹ" کی رداوت کا قلم دان اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن آزاد نگاری کے سبب اگست ۱۹۱۳ء میں انھیں اس کی ادارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ وہ پانی پت چلے آئے۔ چند ہی دنوں کی بے کاری کے بعد وہ لاہور کے "زمیندار" اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد اس اخبار کی تعداد میں دن دو نارات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ اور کچھ دنوں میں اس کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی، لیکن موصوف کی آزاد منشی کی وجہ سے اس اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور تین چار سال تک وہ بے کار رہے۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ تو اردو میں نصابی و درسی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے "دارالترجمہ" کا ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ مولوی عبدالحق اس کے سرگراں قرار پائے۔ انھوں نے شمالی ہند سے چیدہ و چنیدہ صاحب علم حضرات کو بلا کر اس کام کے لیے مامور کیا، جن میں ایک سلیم بھی تھے۔

۱۸ نومبر ۱۸۱۹ء کو حیدرآباد پہنچ کر انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ بعد میں ان کی خدمات شعبہ اردو میں اسٹنٹ پروفیسری کے عہدے پر منتقل کر دی گئیں۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں سلیم کے دانتوں میں پائریا کی وجہ سے درد پیدا ہوا۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے گیارہ بارہ دانت نکلوائے گئے، لیکن اس کی وجہ سے جو زخم ہوئے وہ جان یواں ثابت ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۴۱۱

۴۱۳ ص ایضاً

کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے، کسی طرح سے مشروبات حلق کے نیچے اتار لیتے تھے۔ بالآخر ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

وجید الدین کی زندگی کا بیش تر حصہ صحافت نگاری میں گزرا۔ وہ ایک نڈر اور بیباک صحافی تھے، جس کی وجہ سے انھیں کئی بار پریس اینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پہاڑ جیسے عزم و ارادے میں کوئی لغزش نہیں آئی وہ ساری عمر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ اپنے رسومات قلم سے انھوں نے اردو میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحات وضع کئے ہیں۔ دوران قیام حیدرآباد سیکڑوں الفاظ و اصطلاحات ایجاد کیں۔ وہ انگریزی کم جانتے تھے لیکن جب انگریزی سے اردو الفاظ بنانے کی ضرورت پڑتی تو وہ فوراً ایک موزوں لفظ ایجاد کر دیتے تھے۔ ان کی اس زود ایجادی کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

”وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں

کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے

موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں

سائچے بنے بنائے رکھے ہیں، جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔“

سلیم اردو زبان و اردو ادب کے ایک مایہ ناز ستون تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اردو کے

شیدائی رہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کام نامہ یہی ہے کہ جدید علوم و فنون سے متعلق سیکڑوں

بلکہ ہزاروں نئے الفاظ اور اصطلاحات جو ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سے بیش تر کے موجد وہی ہیں

اس سلسلے کی ان کی کتاب ”وضع اصطلاحات علمیہ“ اس کی بین دلیل ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں :-

سر سید کے رفقا میں مولوی سمیع اللہ کی شخصیت اپنی سیرت کی پاکیزگی، اخلاق کی بلندی

اصولوں کی پختگی اور قومی خدمات میں بے لوث اور پر خلوص اہتمام کے باعث ایک امتیازی

شان و حیثیت کی حامل تھی۔ علی گڑھ تحریک کے تعلیمی منصوبوں کو بروئے کار لانے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

وہ دہلی میں ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں میاں محمود خاں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام عزیز محمد خاں تھا انھوں نے مولانا مملوک العلی ادرص 'الدین آزادہ' جیسے علمائے عصر سے تعلیم حاصل کی وہ دہلی علی گڑھ اور آگرہ میں حج رہے۔ ۱۸۶۸ء (۱۲۸۸ھ) میں وہ علی گڑھ میں صدر الصدور تھے۔ ۱۸۶۲ء (۱۲۸۵ھ) میں لارڈ ڈنار تھ بروک کے ساتھ انھوں نے مصر کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد انھیں سی۔ ایم۔ جی کا خطاب عطا کیا گیا۔ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲-۹۳ء) میں انھوں نے ملازمت سے پینشن لی۔

سائٹفک سوسائٹی کے قیام کے وقت ہی سے وہ اس کے رکن منتخب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کی وضع قطع مولویانہ تھی۔ لیکن برسرید کی صحبت و معیت اور ان کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ کوٹ پینٹ اور ٹرکی ٹوپی پہننے لگے جس زمانہ میں مدرسۃ الاسلامیہ کی بنیاد پٹری وہ علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ برسرید کے ایما سے انھوں نے مدرسے کی نشست اول رکھی اور اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر معتد بہ رقم جمع کی جس کی وجہ سے مدرسے کو مالی مشکلات سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی دائے دئے، سخنے اور قدمے مدرسے کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سائٹفک سوسائٹی کے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۷ء میں دوبار سکریٹری مقرر ہوئے۔ مئی ۱۸۴۷ء میں وہ اور پنڈت رادھا کشن سکریٹری تھے۔

لیکن شبلی کی طرح مولوی سید محمد بھی بہت دنوں تک برسرید کا ساتھ نہ دے سکے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب کالج میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا تو مولوی سید محمد

۱۷ ڈاکٹر اصغر عباس، برسرید کی صحافت ص ۱۷۱

۱۸ مولوی عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر جلد ۱، ص ۱۷۰

۱۹ ایضاً ص ۱۷۱

۲۰ ڈاکٹر اصغر عباس، برسرید کی صحافت ص ۱۷۳

نے اس کی شکایت سرسید سے کی جس پر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ چنانچہ یہ بدظن ہو کر سرسید سے علاحدہ ہو گئے، لیکن عبدالحمیٰ حسنی نے لکھا ہے کہ انہوں نے سید محمود کی جانشینی کے مسئلے پر اختلاف کے باعث علاحدگی اختیار کی تھی لے الہ آباد یونیورسٹی کا مسلم پور ڈنگ ہاؤس ان ہی کے فیاضانہ و مخیرانہ جذبات اور قومی محبت کی ایک زندہ مثال ہے ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں انہوں نے دلی میں انتقال کیا لے

وہ بڑے علمی مرتبے کے آدمی تھے انہوں نے عربی زبان میں کچھ اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور وہ "مسافر ان لندن" کے عنوان سے ان کے جو مضامین گزٹ میں شائع ہوئے تھے، ان کی فہرست ذیل ہے۔

(۱)	مسافر ان لندن	۳۱ اگست	۱۸۸۰ء
(۲)	" - - "	۳ اور ۱۱ ستمبر	۱۸۸۰ء
(۳)	" - - "	۱۵ اور ۱۹ اکتوبر	۱۸۸۰ء
(۴)	" - - "	۲۴ اور ۲ دسمبر	۱۸۸۰ء

راجہ جے کشن داس:

راجہ جے کشن داس بندہ ابن داس رئیس مراد آباد کے منجھلے بیٹے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں ختم اپنی کی حیثیت سے داخل ہوئے بعد ازاں تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے اسٹنٹ جج کے منصب تک پہنچے۔ زمانہ غدر میں انہوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی، چنانچہ صلے کے طور پر انگریزی حکومت نے انہیں میوٹنسی میڈل عطا کیا اور سی، ایس، آئی کے خطاب سے سرفراز کیا۔

۱۷۱ نمبر، الخواطر، جلد ۱، ص ۱۷۱

۱۷۱ ایضاً ص ۱۷۱

۱۷۳ بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۱۷۳

جے کشن داس کے سرسید سے خصوصی روابط تھے۔ سرسید انھیں بھائی جے کشن داس کہا کرتے تھے۔ سائٹفک سوسائٹی کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس کے رکن بنے۔ سرسید کی کوششوں اور کاوشوں سے جب ۱۸۶۶ء میں بٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا، تو وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اگست ۱۸۶۷ء میں جب سرسید تبدیل ہو کر بنارس آئے تو راجہ صاحب سائٹفک سوسائٹی کے سکریٹری ونگر ان منتخب ہوئے اور فروری ۱۸۷۲ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ان کے سکریٹری شپ کے زمانے میں سوسائٹی نے بڑی ترقی کی۔

راجہ جے کشن داس نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قیام میں بڑی مدد کی اور جب اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز رکھی گئی تو انھوں نے اس تجویز کی زبردست حمایت کی، چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں ان کی یادگار کے طور پر "راجہ جے کشن داس جوہلی میور گولڈ میڈل اور" راجہ جے کشن داس جوہلی میور سلور میڈل کے نام سے دو انعامات سال کے دو کامیاب ہندو طلبہ کو دیے جاتے ہیں۔

نارنج شاہد بے کہ سرسید کے فیضان نظر نے کتنے حذف
حاجی محمد اسماعیل خاں؛
 میرے کو در شہو اور بنا دیا انھیں میں حاجی محمد اسماعیل
 خاں بھی تھے وہ سائٹفک سوسائٹی کے معاونین میں ایک اہم رکن کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اکتوبر
 ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۷ء تک "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے ایڈیٹر رہے۔

محمد اسماعیل خاں کی ولادت ۱۲۰۱ھ (۱۸۵۴-۵۵) میں رتاوڑی میں ہوئی۔ انھیں
 علوم متداولہ کے علاوہ ترکی زبان میں بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ طبع زاد مضامین کے ساتھ ساتھ
 ترکی کے بلند پایہ مضامین کو اردو کا جامہ پہنا کر وہ گزٹ میں شائع کرتے تھے۔ وحید الدین نے ۱۸۹۰ء

۱۷ خطا خود علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۲۳ اگست ۱۸۶۷ء ص ۵۳۹

حوالہ مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۱۲

۱۷ علی گڑھ گزٹ ۳ جولائی ۱۹۲۱ء حوالہ سرسید کی صحافت ص ۱۷۳

میں "معارف" کے نام سے ایک رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا، تو محمد اسماعیل خاں کو اس کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے اسی دلچسپی کے بنا پر انھیں صوبہ شمالی مغرب کی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا تین برس تک وہ اس کے رکن رہے۔

سر سید کے سیاسی افکار و نظریات کی تبلیغ کے لئے محمد اسماعیل خاں نے "افادہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ جوش مذہبی کے علاوہ ان کی کسی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ گزٹ میں ان کے مضامین بکثرت شائع ہوئے ہیں ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں

۲۶ مئی ۱۸۹۱ء	(۱) ہندوستانی اور مناکت یورپین لیڈیوں سے
۹ اپریل ۱۸۹۵ء	(۲) گذشتہ اور موجودہ زمانے کے مسلمان
۲۸ مئی ۱۸۹۵ء	(۳) تجارت اور مسلمان
۹ اگست ۱۸۹۵ء	(۴) زمینداری اور اس کی تباہ حالت
۱۴ اگست ۱۸۹۵ء	(۵) خوش اقبالی یا بد اقبالی یا اقتضائے وقت
۸ مئی ۱۸۹۶ء	(۶) علوم و فنون
۵ جون ۱۸۹۶ء	(۷) یورپ کے اخبارات
۲۱ اگست ۱۸۹۶ء	(۸) فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں علمی طوفان
۲۸ اگست ۱۸۹۶ء	(۹) جہل مرکب

چوتھا باب
متفرق ادارے

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس - ۱۸۱۲ء

کمپنی کے اعلیٰ افسران ابتدا ہی سے اس بات کی فکر میں تھے کہ کمپنی کے ملازمین خصوصاً سول اور فوجی ملازمین کو دیسی زبانوں کی تعلیم دی جائے، لیکن ہندوستانی لڑائیوں میں ملوث اور اپنی تجارت اور اقتدار کی توسیع و ترقی میں ہنہمک رہنے کی وجہ سے وہ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلیٹ (Joseph Colleet) نے ۱۷۷۱ء میں "فورٹ سینٹ جارج اسکول" کی بنیاد ڈالی جو بعد میں "رائٹرز کالج" کے نام سے مشہور ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ پہلا ادارہ تھا جس میں مدراس پریسیڈنسی کے سول ملازمین دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ کالج قلعہ سینٹ جارج میں برسوں قائم تھا۔

۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا، جس میں کمپنی کے سبھی ملازمین (سول ملازمین) کو تین سال تک کیلئے تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا چنانچہ کلکتہ، مدراس، اور بمبئی احاطوں کے ملازمین اس میں تعلیم حاصل کرنے لگے، لیکن کورٹ کے حکم کے بموجب گورنمنٹ سکرٹری ٹامس براؤن نے ۶ اگست ۱۸۰۵ء کو کالج کونسل کو ایک خط لکھا جس میں مدراس اور بمبئی کے طلبہ کو واپس بھیجنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی کے طلبہ واپس بھیج دئے گئے اور ان کی تعلیم کا انتظام ان ہی احاطوں میں کیا گیا۔ افسوس کہ بمبئی کے اس تعلیمی ادارے سے متعلق ہماری معلومات نہیں کے برابر ہیں۔ البتہ مدراس کے ادارے کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۱۲ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول کو از سر نو قائم کیا گیا اور اس کا نام "فورٹ سینٹ جارج کالج" رکھا گیا۔

۱ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما ص ۲۰۳

۲ وارثی، فورٹ ولیم کالج ص ۶۴

۳ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اور ڈاکٹر بی بی، مشرانے سال قیام ۱۸۰۸ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کی تحقیق کے مطابق قیام کا سال ۱۸۱۲ء ہے۔
(جامعہ ۵۰ جنوری ۱۹۸۳ء)

فورٹ سینٹ جارج کالج آٹھ سال تک فورٹ سینٹ جارج کے احاطے میں چلتا رہا۔ ۱۶۸۱ء میں جبکہ طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو مسٹر گارو (Garrow) کا مکان دس سال کے لئے چھپے پر لیا گیا، بعد ازاں ایک تاجر مسٹر مورایٹ (Moovatt) کا مکان نو ہزار روپے میں خرید کر کالج کو اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس عمارت میں ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جسے ”کالج ہال“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اپنی آخری عمر تک کالج اسی عمارت میں چلتا رہا۔

تعلیمی شعبہ جات :-

فورٹ سینٹ جارج کالج میں دکنی، تامل، کنٹر اور ملیالم کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت ہندوستانی اور ریاضی کے شعبے تھے۔ یہ کالج فورٹ ولیم کے طرز پر قائم کیا گیا تھا لیکن اس اعتبار سے اسے فورٹ ولیم کالج پر تفوق و برتری حاصل تھی کہ یہاں صرف سول ملازمین ہی نہیں بلکہ وکلا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے لہذا متذکرہ بالا شعبوں کے علاوہ قانون کا شعبہ بھی قائم تھا۔ پروفیسر سری نو اس چاری لکھتے ہیں۔

”فورٹ ولیم کالج پر اس کالج کو اس لئے فوقیت حاصل تھی کہ یہاں ہندوستانی ادب زبان کے ساتھ ساتھ قانون اور دوسری ملکی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لئے یہاں صرف منشی (Writers) ہی نہیں بلکہ وکلا اور حجوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی“

کالج کے اساتذہ :-

اس زمانے میں مدرسوں اور کالجوں میں درس و تدریس دینے والوں کو منشی کہا جاتا تھا۔ کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام تھا لیکن دکن میں ایسے منشیوں کا فقدان

۱۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال، مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما۔ ص ۲۱۳

۲۔ History of the city of Madras P. 216

بجوال مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما۔ ص ۲۱۳

تھا، جو مشرقی علوم و السنہ کی کما حقہ تعلیم دے سکیں۔ چنانچہ شمالی ہند سے ارباب علم کو مدعو کر کے اس کالج میں مامور کیا گیا۔ ان منشیوں کے نام جو اس کالج میں تعلیم و تعلم کی خدمات انجام دے رہے تھے، حسب ذیل ہیں۔

- | | | |
|----|------------------|----------------------------|
| ۱۔ | تراب علی نامی | شعبہ ہندوستانی و فارسی |
| ۲۔ | حسن علی ماہلی | شعبہ عربی، فارسی اور ریاضی |
| ۳۔ | جد مبراد | تامل |
| ۴۔ | سنو سوامی | تامل |
| ۵۔ | بی۔ جی۔ باننگلون | کنڑ |
| ۶۔ | سی۔ ایم۔ دشتی | ملیالم |

منشی شمس الدین احمد، ابراہیم بیجا پوری، منشی مظفر، قاضی ارتضار علی خان، مولوی مہدی داصف، سید شاہ حسین حقیقت، سید وود عاشق، غلام حسین معاون، مرزا عبداللہ باقی دقا، عید القادر تمہاز، سید تاج الدین، غلام دشنیک، نمد خان اور میر حیدر بگرامی وغیرہ برسوں اس کالج سے وابستہ رہے۔

کالج کا کتب خانہ :-

فورٹ سینٹ جارج کالج کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ اس میں تامل، سنگو، کنڑ، مرٹی، ملیالم، سنسکرت، بنگلہ، اڑیا، ہندی، برہمی، اور جادی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کتابوں اور مخطوطوں کے ذخیرہ موجود تھے جن میں شیخ عین الدین کے مذہبی سائے "احکام و مسائل" کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا۔ شمس العشق اور شاہ میران جی کی دینی تصانیف گل باس اور جل ترنگ کے مخطوطے بھی تھے۔ ولیم ٹیلر نے اس کتب خانے کے جملہ مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں مرتب کر کے فورٹ سینٹ جارج کالج پریس سے شائع کی تھی۔ اسکی

سے سید شمس اللہ قادری، اردو کے قدیم نسخ ۱۱۵

پہلی جلد بشمول ۷۷۰ صفحات ۱۸۵۷ء میں از رو سری جلد جو ۴۴۲ صفحات پر مشتمل ہے،
۱۸۶۰ء میں شائع ہوئی۔ ٹیلر کا بیان ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں مخطوطات
کی تعداد تین ہزار تھی۔ یہ ذخیرے میکینزی (MacKenzie) کلکشن انڈیا ہاؤس کلکشن، اور
براؤن کلکشن کے ناموں سے موسوم تھے۔ کرنل میکینزی کا ذخیرہ بہت ہی قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ٹیلر
نے اس کے بارے میں لکھا ہے :-

“The most valuable collections of historical
documents relative to India that ever was
made by any individual in Europe or in Asia.”
ترجمہ :- یورپ اور ایشیا کے کسی شخص نے بھی ہندوستان سے متعلق تاریخی دستاویزات
کا اتنا قیمتی مجموعہ تیار نہیں کیا ہے۔

میکینزی کی وفات (۱۸۲۱ء) کے بعد ان کا گراں بہا ذخیرہ جو کتابوں اور مخطوطوں
کے علاوہ متعدد نقشوں، سکوں اور مجسموں پر مشتمل تھا، کمپنی نے اس کی بیوی سے دس
ہزار پونڈ میں خرید لیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکرٹری پرونیسرو سن نے اس ذخیرے کی
فہرست مرتب کر کے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔ یہ فہرست بھی دو جلدوں میں ہے
اور ”میکینزی کلکشن“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس ذخیرے کے عربی، فارسی، سنسکرت،
جاوی، برمی زبانوں کے مخطوطے، نقشے، سکے اور مجسمے دو قسطوں میں جنوری ۱۸۲۳ء
اور جنوری ۱۸۲۵ء میں از گلینڈ روانہ کئے جا چکے ہیں۔ باقی ذخیرے جو دراوڑی زبان کے
کتابوں اور کئی مخطوطات پر مشتمل تھا ستمبر ۱۸۲۸ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے
کے حوالے کر دیئے گئے۔

۱۔ بحوالہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما ص ۲۲۱

۲۔ ” ” ” ” ” ”

۳۔ ” ” ” ” ” ”

۴۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، جامعہ جنوری ۱۹۸۳ء ص ۵۲

اس طرح انڈیا ہاؤس کلکشن اور براؤن کلکشن میں بھی ہندوستان کی تقریباً سبھی کلاسیکی زبانوں اور مقامی زبانوں میں کتابیں موجود تھیں ان میں مخطوطات کی تعداد بالترتیب دو ہزار ایک سو چھ اور دو ہزار چار سو چالیس تھی۔

شعبہ تصنیف و تالیف :-

کالج کے نصاب کو مد نظر رکھتے ہوئے دکن کے علاوہ عربی، فارسی، ہندوستانی، سنسکرت قانون اور ریاضی سے متعلق کتابیں لکھی گئیں اور شائع کی گئیں۔ دکنی زبانوں میں صرف و نحو اور لغت و قواعد کے علاوہ داستان، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات سے متعلق کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ڈاکٹر رفیعہ رقم طراز ہیں۔

”ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ہند کی زبانوں میں اردو کی اس قدیم شکل کو ”دکنی“ نام دے کر اس کی توسیع و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ جہاں کھلتے ہیں ہندوستانی کتابیں تیار کی جا رہی تھیں وہیں مدراس میں اردو کی قدیم شکل ”دکنی“ کا رچا رہا تھا۔ کالج کابجی پریس تھا، جس میں کالج کی کتابیں طبع ہوتی تھیں۔ اس پریس میں سب

سے پہلے - *Analysis, Grammar and Dictionary of Hindustani Language.* - ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اسکی قواعد و لغت، مصنفہ ڈاکٹر ہنٹر، پریس ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

اساتذہ و طلبہ کو انعام :-

عمدہ اور کارآمد تصنیف پر کالج کا انتظامی بورڈ انعام کا اعلان کرتا ہے۔ بہت افزائی کرتا رہتا تھا۔ مقناکہ عقید و وقیع کتابیں تیار ہو سکیں۔ جیسے کہ ”پہلی زبانوں میں

۱۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال، جامعہ جنوری ۱۹۸۳ء ص ۵۲-۵۲
۲۔ ہماری زبان علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۷

بہت سی گراں بہا کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔ کالج کے جن مصنفین کو عمدہ تصنیف پر داؤد دہش سے نوازا گیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں :-

نام مصنف	تصنیف	انعام کی رقم
(۱) قاضی ارتضار علی خاں خوشنود	نقود الحساب	ایک ہزار روپے
(۲) تراب علی نانی	وسیط النحو	سات ہزار روپے
(۳) مہدی واصف	حقیقۃ المرام فی تذکرۃ العلماء والاعلام	

کالج کے اساتذہ کے علاوہ غیر متعلق مصنفین کو بھی انعام و اکرام دیا جاتا تھا اور ان کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔

مدراس گورنمنٹ نے ہندوستان کی زبانوں میں سے دو زبانیں سیکھ کر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے بھی انعام کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان ”یونیٹ سروس گزٹ“ میں شائع ہوا تھا جسے مدراس کا اردو اخبار ”اعظم الاخبار“ نے بھی نقل کیا تھا، وہ لکھتا ہے۔

”یونیٹ سروس گزٹ میں لکھا ہے کہ مدراس کے گورنر جنرل سر ہنری پانچر صاحب بہادر.... اس ملک کے تمام شمشیر بند سرداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ اگر کوئی سرداران سات زبانوں میں سے دو زبانیں یا زیادہ سیکھ کے امتحان دیوے تو اس کو سرکار کی طرف سے ایک مشرت ہزار روپے انعام ملیں گے۔“

کالج کا خاتمہ :-

شروع میں مدراس گورنمنٹ کالج کی ترقی کے لئے بڑی کوشاں تھی، لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپیاں کم ہوتی گئیں اس کے باوجود ۱۸۳۵ء تک درس و تدریس کے پہلو پہ پہلو تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں کسی طرح برقرار رہیں لیکن اس کے بعد کالج کا زوال

۱۷ بحوالہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما ص ۲۱۹

شروع ہو گیا۔ آخر میں فائنل ڈپارٹمنٹ کی طرف سے بھی دو ٹوک جواب مل گیا کہ کالج کی امداد ممکن نہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں اسے ختم کر کے اس کا انتظام مدراس لٹریچر سوسائٹی کے ساتھ کر دیا گیا اور طلبہ کے امتحان کے لئے بورڈ آف انزائمینٹس قائم کر دیا گیا۔

کالج کی تصانیف :-

کالج میں خاصی تعداد میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں لیکن وہ سبھی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔ ہم ذیل میں صرف وہی درود کی قدیم شکل تصانیف کی فہرست پیش کر رہے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے، مزید تحقیق و تلاش سے اس میں اضافہ ممکن ہے۔

۱۔ وسیط النحو	تراب علی نامی	۴۔ مجمع الامثال	از محمد واصف
۲۔ حکایات الجلیلہ	نشی شمس الدین احمد	۸۔ انگریزی ہندی اور	”
۳۔ اظہر الصلاح	تاج الدین حسین خاں بھت	۵۔ فارسی لغت	”
۴۔ مرصا و المشاقین	”	۹۔ دلیل ساق	”
۵۔ ایفاح و انکشاف	امیر حمید بگڑامی	۱۰۔ مناظر اللغات	”
۶۔ نرائض ارتضیہ	ارتضاء علی خاں خوشنود	۱۱۔ انوار سہمی	از محمد براہیم خاں جیا پوری
		۱۲۔ اصول فن قبالت	ڈاکٹر ایڈورڈ بالفورد

جن کتابوں کے مصنفین کے نام معلوم نہیں ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں :-

- ۱۳۔ رسالہ حروف تہجی ۱۳۶۔ تعلیم نامہ، ۱۵۔ صنعت حریر، ۱۶۔ میزان الحساب، ۱۷۔ قانون خرید و فروخت
- ۱۸۔ گلستاں سر باب، ۱۹۔ قواعد شکر می، ۲۰۔ عربی حکایت لطیفہ، ۲۱۔ سر کیبور آڈیس،

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ہماری زبان علی گڑھ، ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۹

۵۔ نجیب اشرف نے اس کا سال اشاعت ۱۹۸۲ء درج کیا ہے۔

انوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۳۰

لیکن مسعود حسین خاں نے سنہ طباعت ۱۹۸۳ء لکھا ہے (جماور جنوری ۱۹۷۰ء ص ۱۵۱)

۲۲۔ بکاولی، ۲۳۔ چہار درویش، ۲۴۔ گلستاں ہندی۔

جو کتابیں طباعت کے مراحل سے نہیں گزریں یہ ہیں۔

۲۵۔ ملکہ زماں و کام کندہ، ۲۶۔ سنگھاسن تبتی، ۲۷۔ ترجمہ گلستاں، ۲۸۔ آئین و قوانین افواج کپتی علاقہ مدراس، ۲۹۔ فوجی قوانین، ۳۰۔ قوانین تعلیم فوج۔ ۳۱۔ مقالات خمس یا ہندوستانی سلیکشن۔

فورٹ ولیم کالج کی پانچ کتابیں اخلاق ہندی، باغ و بہار، انخوان الصفا، گل بکاولی اور باغ اردو اس کالج میں پڑھائی جاتی تھیں، لیکن یہ کتابیں زیادہ دنوں تک نصاب میں شامل نہ رہ سکیں کیونکہ ان کتابوں کی زبان اور مدراس میں بولی جانے والی ہندوستانی زبان میں بڑا فرق تھا، جسکی وجہ سے طلبہ کو پڑھنے میں پریشانی ہوتی تھی۔ چنانچہ "مقالات خمس" کے نام سے دکنی زبان میں متذکرہ کتابوں کا ایک انتخاب مرتب کیا گیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن "ہندوستانی سلیکشن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مرتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مرتب نے اس پر ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں سبب تالیف کے علاوہ اپنے افسروں کی مدد میں قصائد بھی لکھے ہیں۔

ایجوکیشنل کمیٹی کلکتہ - ۱۸۳۵ء

ایجوکیشنل کمیٹی ایک سرکاری ادارہ تھا جسے ۱۸۳۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد ویسی زبانوں میں کتابیں تیار کرنا تھا، جیسا کہ کمیٹی نے ۱۸۳۵ء کے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ "ویسی علم و ادب کا بنانا اس کمیٹی کا مقصد رہے گا اور اس کی مساعی اس جانب رہنی چاہئیں"۔ لیکن پانچ سال تک اس کمیٹی نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی جب گورنر جنرل آکلینڈ نے علمی کتابوں کو ویسی زبان میں منتقل کرنے کی طرف توجہ مبذول

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نجیب اشرف کا مضمون نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۱ء

۲۔ بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۲۰

کرائی تو یہ کمیٹی حرکت میں آئی اور ۱۸۳۱ء میں ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ایڈورڈ ریانسے (Royal) پرنسپ، ملٹ اور سردر لینڈ اسکے رکن منتخب ہوئے چونکہ گورنر جنرل اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کا منشا یہ تھا کہ اس معاملہ میں تینوں احاطوں کو اتفاق سے کام کرنا چاہئے، چنانچہ بمبئی اور مدراس کے بورڈ آف ایجوکیشن سے مراسلت کے بعد ذیلی کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ کے خاص امور حسب ذیل تھے۔

(۱) صرف دغور پر کتابیں تیار ہونی چاہئیں۔

(۲) اس کام کے لئے ایسے مصنفین کا انتخاب کرنا چاہئے جو بلا معاوضہ یا کم تنخواہ پر کتابیں ترتیب دے سکیں۔

(۳) اس کے بعد علم کی ہر شاخ میں ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو اخلاقی اور ذہنی ضرورتوں کو پورا کریں۔

(۴) جو کتابیں شائع کی جائیں گی مؤلف کو ان کی اجرت دی جائیگی۔

اجرت کے سلسلے میں کمیٹی نے یہ تجویز ظاہر کی تھی کہ سائنس کی معمولی ضخامت کی کتاب پر ایک ہزار روپے تک دئے جاسکتے ہیں۔ حسب ذیل موضوعات کی کتابوں کی ترتیب کو اولیت دی گئی تھی۔

(۱) دیسی زبانوں کی ریڈرس۔

(۲) ہندوستان کے بعض اضلاع کے حالات۔

(۳) تاریخ بنگال

(۴) ہندوستان کی عام تاریخ۔

(۵) اخلاقی تاریخ و تعلیم پر ایک رسالہ

لے مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۲۱-۱۲۰

سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ، اقوامی نقطہ نظر سے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتابوں کی تالیف کا منصوبہ بڑا شاندار تھا، لیکن افسوس کہ اس منصوبے پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھی کہ اسے گورنمنٹ کی خاطر خواہ اعانت حاصل نہ ہو سکی اور نہ تو باصلاحیت اور تجربہ کار تصنیفین کم تنخواہ پر مل سکے۔ اس کے باوصف عربی، سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں میں خاصی تعداد میں کتابیں تیار کی گئیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر میس (Mees) نے ایک ریڈر تیار کی جو مدرسوں میں جاری کی گئی۔ مارٹین کی "تاریخ ہند" کے اردو اور ہنگلہ ترجمے کے علاوہ دوسری علمی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے لیکن سب سے اہم اور مفید کتاب جو اس کمیٹی نے تیار کرائی وہ "بنگالی انسائیکلو پیڈیا" ہے جو ریورنڈ کے ایم۔ بزجی کے زیر نگرانی تصنیف کی گئی تھی۔

آرکیالوجیکل سوسائٹی ڈھلی۔ ۱۸۲۷ء

آرکیالوجیکل سوسائٹی ہندوستان کی پہلی سوسائٹی ہے، جسے انگریزوں نے خالص اپنے مفاد کے پیش نظر قائم کیا تھا اور شروع میں صرف انگریزوں کو اس کی ممبری کا حق بھی دیا گیا تھا لیکن بعد میں ہندوستانیوں کو بھی ایک محدود تناسب میں اس سوسائٹی کا آئری رکن منتخب کیا گیا۔

دلی اور مضافات ذلی کی قدیم عمارتوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ۱۸۲۷ء کو آرکیالوجیکل سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ شروع میں جے۔ تقاسن سرپرست اور ٹی۔ مڈکاف اس کے سرپرست منتخب ہوئے۔ سوسائٹی نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے خاکوں، نقشوں اور دیگر ذرائع سے دلی اور اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی قدیم عمارتوں سے متعلق معلومات فراہم کرنا شروع کیں، لیکن چونکہ ابتداء میں ہندوستانی اس کے رکن نہیں بنائے گئے تھے اس لئے اس کام میں

لے دیواندرکار گپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ) ص ۸۸

دشواریاں پیش آئیں اور انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ہندوستانیوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر یہ کام رو بہ عمل نہیں لایا جاسکتا۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں مسٹر تھامسن نے سوسائٹی کی تنظیم جدید کی اور ہندوستانیوں کو بھی اس کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ان میں سے سر سید کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد سوسائٹی کے ماہانہ جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسوں میں قدیم عمارتوں سے متعلق مقالے پڑھے جاتے تھے اور ان مقالوں پر سر سید سے بحث و مباحثہ بھی کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے ”آثار الصنادید“ کے دوسرے ایڈیشن میں جو ترمیم و اصلاح کی ہے وہ سوسائٹی کے جلسوں سے حاصل شدہ معلومات پر مشتمل ہے۔

سوسائٹی اپنے زمانہ قیام میں ایک رسالہ شائع کرتی تھی، جس میں سوسائٹی کی نشستوں میں پڑھے گئے مقالوں کو شائع کیا جاتا تھا۔

مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۵۸ء

انیسویں صدی کے نصف اوائل تک ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح لکھنؤ میں بھی چھوٹے بڑے متعدد پریس قائم ہو چکے تھے لیکن ۱۸۵۰ء کے ہندوستان گریسٹینز کی وجہ سے بیشتر مطابع چند چمکیوں کے ساتھ دم توڑ چکے تھے، جو ایک درہم باقی رہ گئے تھے ان کی حالت بھی کربک شب تاب سے زیادہ نہ تھی۔ اس ہنگامہ محشر نے نہ صرف ہماری سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بساط الٹ پلٹ دی بلکہ ہمارے ذہنی، علمی ادبی ذخائر کو بھی کافی نقصان پہنچایا، کیونکہ انگریزوں نے ہماری علمی درس گاہوں کو نقصان پہنچانے اور ہمارے علماء و فضلاء کو موت کے گھاٹ اتارنے کے ساتھ ساتھ سرکاری اور نجی کتب خانوں کو بھی جلایا اور دیران کیا۔ محمد ایوب قادری کہتے ہیں۔

”۱۸۵۰ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہزاروں انسانوں کو قتل کیا، اور ہزاروں عمارتوں کو ڈھایا اور منہدم کیا بہت سی درس گاہیں اور مدرسے دیران و برباد ہوئے

سینکڑوں علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء گولیوں کا نشانہ بنے۔ بہت سے کتب خانے برباد

ہوئے۔

سلاطین دہلی کے سینکڑوں برس کے ذخیرے اور علمائے قدیم کی کتابیں برباد ہو گئیں
شاہی قلعہ کے کتب خانے کی بربادی سب سے بڑا سانحہ تھا۔ یہ وہ کتب خانہ تھا جس میں
ہمایوں کے ذخائر تھے جس میں اکبر کے حکم سے ترجمہ کی ہوئی اور جمع کی ہوئی اور جمع شدہ کتابیں
سقیں تھیں۔

یہ دلی کے کتب خانوں کا حال تھا، خود لکھنؤ میں شاہان اودھ کے بیشتر کتب خانوں
کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ غدر کے دنوں سے جو گراں بہا مخطوطات اور علمی نوادریج رہے
وہ بھی ضائع ہو رہے تھے۔ یہ حالات تھے جبکہ منشی نول کشور (۱۹۳۶-۱۹۸۵ء) کو ایک
مطبع قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کیلئے انکی نگاہ انتخاب شاہان اودھ کی راجدھانی پر
پڑی۔ اس سے قبل وہ کچھ دنوں تک "اخبار سفیر" آگرہ کے ہتہم کی حیثیت سے، بعد ازاں چار سال
تک منشی ہر سکھ رائے کی ماتحتی میں "مطبع کوہ نور" لاہور میں بھی کام کر چکے تھے۔

دورانِ نیام آگرہ اور لاہور انہوں نے صحافت اور چھاپہ خانہ کے کام میں کافی جہارت پیدا
کر لی تھی۔ غدر کے بعد مطبع کوہ نور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ آگرہ چلے آئے اور اس
بعد لکھنؤ آ کر نومبر ۱۹۵۷ء سے قبل انہوں نے ایک پریس قائم کیا۔ رام بابو سکینہ کا بیان ہے
یہ پریس منگھری اور ایٹ کی سرپرستی میں قائم کیا گیا تھا۔
کاظم علی خاں پریس کی پہلی جائے تیام کوٹھی غالب جنگ بتاتے ہیں بلکہ اس کے
برخلاف مفتی عصمت اللہ لکھتے ہیں کہ منشی نول کشور نے اپنا پریس پیلے آغا میر کی سرانے میں
کیا تھا۔

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات ص ۶۲-۶۳

۲۔ تاریخ ادب اردو حصہ ۹۹ ص ۹۹

۳۔ جامو، فروری ۱۹۸۱ء ص ۸۲

۴۔ نیا دور، اپریل ۱۹۶۵ء ص ۶

جس کی تصدیق امیر حسن نورانیؒ اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمیؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ابتدا میں منشی نول کشور نے چھوٹے چھوٹے ہینڈ پریس آغا میر کی سرانے (محلہ ڈیوڑھی) میں قائم کئے تھے۔ اس کے بعد انھیں گولہ گنج اور رکاب گنج لے گئے۔ ان دنوں انکے پریس میں سرکاری فارم چھپا کرتے تھے، جنھیں وہ خود اپنے کندھوں پر لاد کر کشتری لے جایا کرتے تھے۔ جب کام بڑھ گیا اور کچھ رقم بھی جمع ہو گئی تو پریس کو مکتب خانہ سلیمان قدر کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد حضرت گنج میں مبارک منزل کی عمارت اور اس سے متصل کی زمینیں خریدیں اور ان میں مکانات تعمیر کرا کے پریس اور اس کا سارا دفتر ان عمارت میں منتقل کر دیا۔ اسی اثنا میں کاغذ کی کمی محسوس ہوئی تو کاغذ کا ایک کارخانہ (Paper Mill) بھی قائم کیا۔

منشی نول کشور کا اخبار:-

نول کشور نے اپنے پریس سے ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء سے ”اودھ اخبار“ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار بعد میں اتنا مقبول ہوا کہ ان کے مطبع کو ”اودھ اخبار پریس“ کے نام سے بھی موسوم کیا جانے لگا۔ اس اخبار کے ایک دو شمارے پندرہ روزہ شائع ہوئے تھے کہ اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ جو چہار شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۶۲ء سے ہفتہ میں دو بار چھپنے لگا، ۱۸۶۶ء سے سہ روزہ اور بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ یہ اخبار پہلے چار صفحات پر مشتمل تھا، بعد میں سولہ صفحے کا کر دیا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خاص ہتواروں مثلاً ہولی، دیوالی اور عید و بقرعید پر اس کے خاص نمبر شائع ہوتے تھے، جس کی صفحات کبھی کبھی ۴۸ صفحات تک پہنچ جاتی تھی۔

اس اخبار کو اپنے عہد کے اخباروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ شمالی ہند میں

۱۔ تعمیر ہریانہ (نول کشور نمبر)، جولائی اگست ۱۹۰۹ء ص ۲۹

۲۔ نیا دور (منشی نول کشور نمبر)، نومبر دسمبر ۱۹۰۸ء ص ۶۲

۳۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ایضاً ص ۶۲

نکلنے والا کوئی اخبار اس سے زیادہ ثقہ و معتبر خبریں شائع نہیں کرتا تھا، کیونکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ بعض یورپین ممالک میں بھی اس کے نامہ نگار موجود و مقرر تھے انکلینڈ میں اس کے لئے خبر رسائی کا کام مسٹراے ایچ پارس کر رہے تھے، جو کیمبرج کے کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ اس اخبار کی اہمیت اس لئے سمجھی تھی کہ مطبع نول کشور سے شائع ہونے والی علمی و ادبی کتابوں کے اشتہارات بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اس اخبار کے متعلق سر سید احمد خاں کے بڑے اچھے تاثرات تھے اور گارسن ڈی ٹی نے بھی اپنے خطبات میں اس کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔

۸ جنوری ۱۹۶۲ء کو منشی نول کشور نے ”اودھ اخبار“ میں ایک مضمون شائع کیا، جس سے پریس کے تقسیم کار اور تنظیم کام پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے (۱) ڈبلیو والٹر سپرنٹنڈنٹ انگریزی پریس (۲) راس مس (سپڈ اکاؤنٹنٹ) (۳) مولوی محمد ہادی علی (مصحح مطبع) (۴) منشی شیو پرشاد (مینجر مطبع) (۵) شیخ تشار علی (داروغہ مطبع) (۶) میر حسمت علی (مصحح سنگ) (۷) شیخ امیر علی (نقاش) (۸) علی محمد خاں (پرنٹر) منشی موصوف کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مطبع میں تین سو آدمی کام کرتے تھے۔ یہ متذکرہ بالا اشخاص کے علاوہ جن کے نام انھوں نے اپنے مضمون میں دئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

کلاڈیس، گومس، الیکزینڈر، منشی من بھول، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اشرف، منشی گو بند پرشاد فضا، مصنف گلزار فضا، منشی جوالا پرشاد، منشی امداد حسین حافظ علی بخش، لالہ پیارے لال اور لالہ جانکی پرشاد۔

۱۔ جوالا نیادور (منشی نول کشور نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۷۱۔

۲۔ جوالا نیادور اپریل ۱۹۶۵ء ص ۸۔ صباح الدین بلاں نے موصوف کے اسی مضمون

کے حوالے سے یہی نام درج کئے ہیں۔ لیکن ان میں کسی انگریز کا نام شامل نہیں

(نیادور منشی نول کشور نمبر نومبر دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۷۱)

اس تفصیل سے اس امر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ منشی نول کشور ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے، انگریزی پریس کانگریس انگریزی ہوا کرتا تھا۔

اخبار کے چند اہم ایڈیٹر:-

منشی نول کشور ہندوستان کے زیرک و عاقل اور لائق و فاضل لوگوں کو ادھ اخبار کا ایڈیٹر مقرر کرتے تھے۔ اخبار کی ۹۲ سالہ زندگی میں اس کے قریب تیس چالیس ایڈیٹر مقرر کئے گئے۔ ان میں منشی امیر اللہ تسلیم، قدر بگرا می (شاگرد غالب)، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نسیم دھلوی، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد و امتق، پنڈت بشن نرائن در، مرزایا س لگانہ چنگیزی، پیارے لال شاگر میرٹھی، منشی پریم چند، مرزا محمد عسکری، شوکت کھانوی اور امین سادنی کے نام قابل ذکر ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار جب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور انکا "فسانہ آزاد" قسط وار اخبار میں چھپنے لگا تو اس کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ لقبول نیار الدین اصلاحی اس کی تعداد بڑھکر بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

مطبع نول کشور کا شعبہ تصنیف و تالیف:-

اس مطبع کی حیثیت محض ایک پریس کی نہ تھی، بلکہ اس کا سب سے اہم جزو اس کا شعبہ تصنیف تھا۔ ہندوستان کے قابل اور مایہ ناز قلم کار، شاعر اور مترجمین کسی نہ کسی طرح اس سے وابستہ تھے۔ اس شعبے کا مقصد تھا۔

۱۷ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، نیا دور منشی نول کشور نمبر، نومبر ۱۹۰۰ء ص ۶۳

۱۸ ضیاء الدین اصلاحی، ایضاً ص ۶۰

- (۱) قدیم مستند کتابوں کے جو مسودات حاصل ہوں ان کی صحت اور حسب ضرورت مفید حواشی کا اضافہ، مصنف یا مولف کا تعارف وغیرہ لکھنا۔
- (۲) مکاتب، مدارس اور اسکولوں کے بچوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کرنا اور طلبہ کیلئے مفید اور غیر نصابی کتابیں، فرہنگ و لغات کی ترتیب و تالیف کرنا۔
- (۳) قدیم فارسی، عربی اور سنسکرت کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا۔
- (۴) اردو فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں اور بعض اہم کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کرنا۔

(۵) انگریزی زبان کی اچھی اور مفید کتابوں کے ترجمے اردو اور ہندی زبانوں میں کرنا۔

شعبہ تصنیف و تالیف کے چند اہم ملازمین :-

منشی نول کشور نے مطبع کے شعبہ تصنیف میں ایسے لوگوں کو ملازم رکھا تھا جو حاشیہ نگاری، تقریظ نگاری، دیباچہ نگاری، ترتیب، تصحیح اور ترجمے کے کام میں ماہر تھے، وہ لوگ شعبہ سے دو طرح سے وابستہ ہوتے تھے۔ اولاً وہ لوگ جو مستقل اور باضابطہ طور پر ملازم تھے اور پریس کی عمارت میں کام کرتے تھے، جن کا باقاعدہ مشاہر مقرر ہوتا تھا ثانیاً وہ لوگ جو اپنے گھروں پر کام کرتے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے تالیف یا ترجمے کا معاملہ طے کرتے تھے۔ مولانا سید امیر علی ملیح آبادی^۱، مولانا محمد احسن ناتوئی، مولانا احتشام الدین مراد آبادی، مولانا فخر الدین، مفتی سرور لاہوری، مولانا فضل احمد، مولانا خرم علی، مرزا ہادی علی اشک، مولانا قطب الدین، طوطا رام شایاں، مولانا عابد حسین جعفری، تصدق حسین

۱ ڈاکٹر انوار الحسن، نیادور (منشی نول کشور نمبر، ص ۵)

۲ یہ مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔

۳ ڈاکٹر انوار الحسن، نیادور (منشی نول کشور نمبر، ص ۵)

مرزا محمد عسکری، امیر اللہ تسلیم، منشی انوار حسین تسلیم، کالکا پرشاد موجد، رہی، سید
 امین حسن، امجد حسین وغیرہ اس کے باضابطہ ملازم تھے۔ اپنے گھروں پر کام کرنے والوں
 کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں خواجہ عبدالمجید خاں، مولوی بشارت علی، مولوی محمد
 اسماعیل میرٹھی، مولانا عبدالحق بریلوی، منشی گوکل پرشاد، ڈپٹی نذیر احمد، سید مہدی حسن،
 مولوی امانت اللہ، غالب، مردان علی خاں وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مطبع نول کشور کی چند ادبی کتابیں :-

مطبع نول کشور سے ہندو، مسلمان، عیسائی اور سکھوں کی مذہبی کتابیں ہندی، سنسکرت
 اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور گرمکھی میں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئیں۔ علاوہ بریں
 گنتی، پہاڑے، ابتدائی درسیات، لغات، داستانیں، شعرائے اردو کے دوادین اور
 ادب سے متعلق دوسری کتابیں اور مختلف علوم و فنون خاص طور پر طب کی کتابیں زیور
 طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ ان کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ جو مضمون کی طوالت کے
 پیش نظر درج نہیں کی جاسکتی۔ اردو ادب سے متعلق چند اہم اور غیر فانی کتابوں کے نام
 ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

بحر الفصاحت مؤلفہ نجم الغنی، تاریخ ادب اردو مترجم مرزا محمد عسکری، رام بابو سکسینہ کی

۱۷ عربی فارسی اور اردو کے ۲۶ لغات اب تک شائع ہو چکے ہیں، یہ لغات طبی لغات کے علاوہ
 ہیں، ان میں بعض لغات منشی نول کشور نے مدون کرائے تھے مثلاً "لغات کشوری" جس کے اب تک کئی
 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۸ اس مطبع سے متعدد داستانیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سب سے ضخیم "داستان امیر حمزہ" ہے
 اس کے آٹھ دفتر ہیں۔ ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں۔ اس کے علاوہ بوستان خیال
 ہرگز نامہ، صندلی نامہ، توج نامہ، ایرج نامہ، طلسم ہوش ربا، بوستان منفعت، ترجمہ الف لبیدہ (نظم و نثر)
 باغ و بہار، فسانہ مجائب وغیرہ ہیں۔

انگریزی کتاب "History of Urdu Literature" کا ترجمہ جو اس موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے، تذکرہ شمیم سخن، تذکرہ خواتین، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، تاریخ اردو کے قدیم۔ اس ضمن میں شعرائے اردو کے ضخیم کلیات و دواوین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کلیات میر، کلیات آتش، دیوان ناسخ، کلیات سودا، دیوان میر حسن، کلیات نظیر اکبر آبادی، دیوان خواجہ میر درد، دیوان قلیق، دیوان شہید، گلدستہ امانت، مراثنیٰ انیس، میراثی دبیر، مشنوی سحرالبیان، گلزار نسیم وغیرہ۔

مطبع کا اصل مرکز لکھنؤ تھا، لیکن الہ آباد، کانپور، آگرہ، دہلی، لاہور، پٹیالہ، اجیر، جبلپور وغیرہ میں بھی اس کی شاخیں قائم تھیں۔ کتابوں کی طباعت کی دلکشی اور دیدہ ریزی کی وجہ سے بیرون ممالک مثلاً افغانستان، ایران، جاوا، سماٹرا، لندن، ترکی، برما، عراق، بخارا اور افریقی ملکوں سے بھی کتابوں کی طباعت کے آرڈر آتے تھے۔ دنیا کے چھوٹے بڑے مشرقی کتب خانوں میں اس مطبع کی شائع شدہ کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے بقول میں نے ان دنوں کشور، کے مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں تاشقند، سمرقند، تہران، لندن اور نیویارک میں دیکھی ہیں۔

منشی نول کشور کی موت کے بعد ان کے بھتیجے اور متبشی بیٹے منشی پراگ نرائن اور ان کے بعد ان کے بیٹے منشی بشن نرائن اس مطبع کے دارشا اور ہتھم رہے۔ آج بھی یہ مطبع ان ہی کے اخلاف کی ملک ہے لیکن اس کی حیثیت اب صرف پریس کی رہ گئی ہے۔ اس کا شعبہ تصنیف و تالیف بہت پہلے ختم ہو چکا ہے۔

اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت مطبع نول کشور نے کی ہے اتنی خدمت ہندوستان کے کسی پریس نے نہیں کی۔ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ اس مطبع کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

لے نیادور (منشی نول کشور نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۳)

محدثن لٹریچر سوسائٹی، کلکتہ ۱۹۶۳ء

اپریل ۱۹۶۳ء میں بنگال کی مجلس قانون ساز کے ایک رکن مولوی عبداللطیف خاں نے محدثن لٹریچر سوسائٹی کے کی داغ بیل ڈالی۔ اس سوسائٹی کی مجلس منتظمہ حسب ذیل اہمیا پر مشتمل تھی۔

۱، سرپرست	سر ولیم گگر	بنگال کے لفٹنٹ گورنر
۲، صدر	قاری عبدالباری	
۳، نائب صدر	مولوی عباس علی خاں	
۴، سکریٹری	مولوی عبداللطیف خاں	

محدث رحیم الدین، مولوی قاسم علی، مولوی عبدالرؤف، مولوی عبدالحکیم، شیخ عینی بن طاس، سید مرتضیٰ سہاسی، ڈاکٹر میر اشرف علی، مولوی سید علی، مرزا احمد بیگ اور منشی بر لطافت حسین اس کے اراکین منتخب ہوئے۔ اس سوسائٹی کا ایک جلسہ مولوی عبداللطیف قیام گاہ واقع تال تلہ لین پر ہوا کرتا تھا۔ بقول ڈی ٹی اس ایجن کا مقصد قومی ادبیات روغ دینا تھا۔ نیز ادب، سائنس اور عمرانیات پر تقریروں، مقالوں اور مباحثوں کے بیچ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ تک مفید معلومات بہم پہنچانا تھا۔ یہ تقریریں اور مباحثے اردو یا عربی میں ہوا کرتے تھے۔ علاوہ برس اس کے سالانہ جلسے میں سائنس کے نئے نئے کوششوں کی ہندوستانیوں کو بہت دماغی اور معنوی طور پر کیا جاتا تھا۔

حسین آزاد نے اس کا نام "ایجن اسلامی کلکتہ" لکھا ہے (مقالات آزاد ص ۱۱۳) بعض لوگوں نے اس کا نام "مجلس مذاکرہ علمیہ" بھی لکھا ہے۔
ن لال، نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۰۔
بات گارساں دتاسی ص ۵۰۔

۲ اپریل ۱۸۶۰ء کو اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ جس میں بنگال کونسل کے ارکان کے علاوہ مدراس کے گورنر، مسلمان رؤسا و امرا اور ہندو، یہودی اور پارسی تجار بھی شریک جلسہ ہوئے۔ محمد حسین آزاد کے بقول شرکا کی تعداد دو ہزار آدمی سے کم نہ تھی۔ آزاد نے اس جلسے کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ اس جلسے میں موجود تھے، چنانچہ انہی کی زبانی سنئے۔

”..... طلسمات اور کیمیا کے عجیب عجیب طلسم دکھائے گئے۔ ایک کمرے میں سے دس بجے رات کے آفتاب نکلنا شروع ہوا۔ بعینہ صبح کا رنگ تھا، یعنی اول تو ہلکی ہلکی شعاعیں نکلیں پھر دسوپ کی درجہ بہ درجہ تمازت محسوس ہونی شروع ہوئی۔ اس آفتاب کی طرف دیکھنے سے اسی طرح آنکھوں کو نیرنگی حاصل ہوتی تھی۔ ماہِ نمشبت سنتے تھے وہاں آنکھوں سے رات کو آفتاب نکلا دیکھا۔ دوسرے کمرے میں بادل گر جتے تھے، بجلی چمکتی تھی۔ غرض برسا کا سارا سماں تھا۔ مینہ اس سے (کذا۔ یعنی) نہیں برسا یا کہ اہل مجلس کو تکلیف ہوا نہیں تو یہ بھی ممکن تھا۔ ہر کمرے میں تار برقی لگا ہوا تھا جس کا جی چاہتا تھا دوسرے کمرے میں پیغام سلام بھیجتا تھا جو چاہتا تھا اس پر خیر بھیجتا اور منگا لیتا۔ کچھ کسی کو مانع نہ تھی۔ اس کے علاوہ ہر طرح کے گلاب اور انواع و اقسام کے تجربے ہو رہے تھے۔ ایک کمرے میں سامانِ ضیافت نعمت ہائے بوقلموں کا موجود تھا، جو جس کو مرغوب تھا بے تکلف کھاتا تھا۔“

انجمن پنجاب اور اس سوسائٹی میں روابط پیدا کرنے کے لئے آزاد نے مراسلت شروع کی تھی، جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس سوسائٹی نے نئے نئے ایجادات سے ہندستانوں کو روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے اس کے جلسوں میں پڑھے گئے مقالوں اور تقریروں کو اس عہد کے اخبارات بڑے شوق سے شائع کرتے تھے۔ انجمن کے مصنفین کی ہمت افزا

۱۱۳ لے مقالات آزاد ص ۱۱۳

۱۱۴ لے ایضاً

کے لئے چھ ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر تھی اور اس کے لئے ”حیات اور نگ زیب“ ہندی مسلمان، انجمن اور اس کے کل پرزے اور مطبع کی تاریخ اور تمدن پر اس کے اثرات کے عنوانات مقرر پائے تھے یہ

انجمن پنجاب لاہور ۱۸۶۵ء

گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر اور پنجاب کے دوسرے اعلیٰ افسروں کے ایما سے پنڈت من سچول (ڈاکٹر اسٹنٹ کشر) نے ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء کو شکشا سمجھا کے دفتر دراجادھیان سنگھ کی حویلی، میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ

”اے صاحبان! ہم کئی برسوں سے اس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ دکنھنو وغیرہ کے اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے، ایک مجلس ریسائن نامی گرامی، عالم و فاضل شائق ہر علم و ہنر کے ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقح مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم ہنر کی تحریر و نیز تقریرِ عمل میں آکر بذریعہ چھاپہ منتشر ہوا کرے۔“

دورانِ تقریر پنڈت موصوف نے ڈاکٹر لائٹنر کا تعارف بھی کرایا۔ اس کے بعد لوگوں کے مشوروں سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کا نام پنڈت من سچول نے ”انجمن مطالب مفیدہ پنجاب“ تجویز کیا، جسے سمجھی لوگوں نے پسند کیا۔ لیکن بعد کے مصنفوں نے اس کا نام صرف ”انجمن پنجاب“ لکھا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۴۱ء سے لاہور میں اقامت گزیرے تھے اور فروری ۱۸۶۲ء سے وہ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے علمی کارکردگی کی وجہ سے ارباب بست و کشاد میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی، چنانچہ انھیں اس انجمن کا

۱۰ ڈی. ٹی، خطبات گارساں دتاسی ص ۵۰

۱۰ بحوالہ مقالات آزاد ص ۱۰

سکرٹری منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر صدر مقرر ہوئے اور منشی ہر سکھ رائے جو اخبار "کوہ نور" کے اڈیٹر تھے، شعبہ فارسی کے سکرٹری اور انگریزی شعبہ کے سکرٹری بابو نوبین چندر منتخب ہوئے اور اس کے ساتھ اس کے اراکین کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ اسی روز ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا جس میں لوگوں نے کثیر تعداد میں کتابیں تفویض کیں۔

اس انجمن نے اہل وطن کی قابل رشک خدمات انجام دیں۔ اس کے اراکین کی کوششوں سے نہ صرف پنجاب بلکہ پورے ملک میں یہ روشنی کامینار بن گئی اور جگہ جگہ اسکی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ آغا محمد باقر اس انجمن کی کوششوں اور سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اس انجمن کے زیر اثر اہل پنجاب نے اپنی حالت سنوارنے کی جدوجہد شروع کی اور اراکین کی کوششوں سے بہت کم وقت میں اہل ملک میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ عیش پسند اور جھول ذہنوں میں قوت عمل بیدار ہوئی اور اس نے بہت جلد ایک عہد آفریں جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔“

انجمن کی اس شہرت و مقبولیت کے پیش نظر حکومت پنجاب اپنے انتظامی امور میں اس سے رائے طلب کرنے لگی۔ کوئی نیا قانون نافذ کرنے سے پہلے حکومت اس کے عندیہ سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ بہر حال اس انجمن کی حیثیت آج کل کی قومی اسمبلی کی ہو گئی تھی جس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنائی دیتی تھی۔

اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی (Punjab Text Book Committee) اور لاہور بک ڈپو کا قیام ہے۔ اس بک ڈپو نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ملک کے چیدہ اور تجربہ کار قلم کار کو اس ڈپو میں ملازمت رکھا گیا۔ آشوب اور مولانا حالی اس کے ملازم تھے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے ذہن میں جو ادبی انقلاب پیدا ہوا وہ اسی کے ماتول کی رہین منت ہے۔

انجمن کا جلسہ ہینے میں ایک بار ہوتا تھا، جس میں اراکین انجمن تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ محمد حسین آزاد کے مقالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ادب کے علاوہ دوسرے علمی و معاشرتی موضوعات پر بھی تقریریں کرتے تھے۔ ان کے مقالے اور تقریریں انجمن کے رسالہ "رسالہ انجمن پنجاب" میں شائع کی جاتی تھیں۔ اس رسالے کی ادارت بھی آزادی کے سپرد تھی۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جدید شاعرے کی بنیاد ڈالی گئی، جس نے اردو شاعری کو فرسودہ روش سے تعرض میں بڑی مدد کی۔ اس انجمن نے اپنے عہد میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ بیرون ممالک کے اخبارات اس کی خبروں اور سرگرمیوں کو جگہ دینے لگے تھے۔ گارسن ڈی ٹیسی اس کا رکن اور "رسالہ انجمن پنجاب" کا خریدار تھا۔ اس نچنے خطبات میں اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

دھلی سوسائٹی ۱۸۶۵ء

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستان میں خصوصاً شمالی ہند میں متعدد سوسائٹیاں معرض وجود میں آئیں، ان میں اکثر و بیشتر سوسائٹیاں ایک دوسرے کی ریس میں قائم ہوئی تھیں اس ریس درشک اور مچھمی کے نتیجے میں دھلی سوسائٹی بھی وجود میں آئی۔

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو کوشنر دھلی کرنل سیمپٹن نے اپنی کوشٹی پر ایک جلسہ منعقد کیا جس میں سرکاری افسروں کے علاوہ دہلی کے ارباب علم اور یورپی باشندوں نے شرکت کی۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ

"پنجاب اور لکھنؤ کی سوسائٹیوں کو مثالوں میں رکھتے ہوئے ہمیں بھی ایسی بنیادوں پر ایک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنی چاہئے جہاں ہم ایک ساتھ بیٹھ کر اپنی قوم پر تبادلہ خیال کر سکیں یا مقالہ پڑھ سکیں۔ اور اس طرح علم کی شمع کو درخشاں رکھیں۔ خدیوہندوب کے اس مرکز (دھلی) کو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔"

چنانچہ اس جلسے میں دہلی سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

”بحث و مباحثہ اور مثالوں کے ذریعہ ادبیات تاریخ، آثار قدیمہ، علم سکھ، ادب لطیف کی توسیع و ترقی اور لوگوں میں ان کے نئے ذوق پیدا کرنا۔“

اس کے علاوہ سوسائٹی کے مقاصد میں ایک کتب خانے کا قیام، ایک رسالے کا اجرا، انگریزی کتابوں کے تراجم تیار کرنا اور دیسی زبانوں کے مترجمین کو ترجمے کے کام میں مدد پہنچانا بھی داخل تھا۔

ابھی تک سوسائٹی کا نام متعین نہیں ہوا تھا اور نہ تو اس کے عہدے داروں کا انتخاب ہی عمل میں آیا تھا، کیونکہ مذکورہ بالا تجاویز کو قبول انام کی سند حاصل کرنے کیلئے یہ طے پایا کہ یکم اگست کو ایک عام جلسہ بلایا جائے، چنانچہ یکم اگست ۱۸۶۵ء کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں سوسائٹی کا نام ”دہلی سوسائٹی“ قرار پایا اور حسب ذیل اشخاص اس کے عہدیدار منتخب ہوئے۔

کرنل ہیلٹن کشر دہلی	(۱) سرپرست
بیلٹن مک موہن نائب کشر دہلی	(۲) صدر (الف)
مرزا الہی بخش	(۳) صدر (ب)
لالہ صاحب سنگھ صاحب	(۴) نائب صدر
ڈبلیو۔ کولڈ اسٹریم جج اسمال کاز کوڈ	(۵) معتمد اعزازی
پیارے لال آشوب	(۶) معتمد

اس کے علاوہ مزید اکیس ارکان مجلس منظمہ کے منتخب ہوئے، جن میں دلی کالج کے پرنسپل مولوی ضیاء الدین مدرس دہلی کالج وغیرہ شامل تھے۔ ان ارکان میں مرزا غالب کا نام نہیں تھا، ان کا نام اس کے بعد کے اجلاس منعقدہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو شامل ہوا

اس جلسے میں سوسائٹی کی رکینٹ کے لئے آٹھ آنہ ماہانہ چندہ لازم قرار پایا۔ چنانچہ جو ممبر چندہ دینے سے احتراز کرتا تھا اس کا اخراج کر دیا جاتا تھا۔ شروع میں اس کے ارکان کو سوسائٹی کا رسالہ خریدنا پڑتا تھا، لیکن ۱۸۷۲ء سے انھیں بلا معاوضہ دیا جانے لگا۔ سوسائٹی نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں عطیات و چندہ وغیرہ سے دو ہزار روپے جمع کر لئے تھے۔ اگست ۱۸۶۵ء میں ۱۵ سو روپے ایک فی صد سود کی در سے نائب صدر لالہ صاحب سنگھ صاحب کی تحویل میں دئے گئے اور پانچ سو روپے سوسائٹی کے لوازمات اور کتابوں پر صرف کئے گئے۔

سوسائٹی کے اہم جلسے :-

سوسائٹی کے دو جلسے (۱) جلسہ خاص اور (۲) جلسہ عام ہفتہ میں ایک بار ہوا کرتے تھے اور دونوں جلسے ممکنہ طور پر منگل ہی کو رکھے جاتے تھے۔ جلسے کی کارروائی حسب ذیل طریقے پر انجام پاتی تھی۔

(۱) سابق جلسوں کی روداد اور اس کی منظوری

(۲) مقالہ خوانی اور ان پر بحث و مباحثہ

(۳) سکریٹری کی طرف سے پیش شدہ دیگر امور پر بحث

سوسائٹی کی یہ ایک روایت بن چکی تھی کہ حکومت کا کوئی اہم اور مقتدر شخص جب دلی

تشریف لاتا تو سوسائٹی اس کی خدمت میں سپانامہ اور ایڈریس پیش کیا کرتی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کی مختصر تاریخ بھی بیان کی جاتی تھی۔

۲۳ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے سرپرست و ممبران کرنل ہیلٹن نے سوسائٹی کے ارکان

کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل کی تشریف آوری متوقع ہے۔ چنانچہ سپانامہ پیش کرنے کی غرض

سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ گورنر جنرل میکلوڈ دلی تشریف لائے اور یہاں انھوں نے دربار

عام بھی کیا۔ اس دربار میں سوسائٹی کی جانب سے ایک سپانامہ پیش کیا گیا۔ اس

وقت سوسائٹی کے رجسٹر میں ۱۲۴ ممبروں کے نام تھے، جن میں ۹۶ ہندوستانی

اور باقی یوروپین تھے یہ اس سپانامے میں ان عطیات کا ذکر ہے، جو مقالوں کی شکل میں سوسائٹی کے ارکان کی جانب سے پیش کئے گئے تھے بقالہ نگاروں کے نام ہیں، منشی حکم چند، پنڈت بشیشور ناتھ، پیارے لال آشوب، احمد خان، مولوی الطاف حسین، مرزا غالب، مرزا شمس الدین احمد خان، لالہ کچھی نرائن اور منشی جیون لال۔

اس موقع پر سوسائٹی کے سکریٹری پیارے لال آشوب نے گورنر جنرل سے گزارش کی کہ وہ سوسائٹی کا مرئی اعلا ہونا قبول کر کے سوسائٹی کی عزت افزائی فرمائیں اور اس کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کریں۔

جب سوسائٹی کا کوئی عہدہ دار استعفیٰ دیکر باہر جاتا، تو اس کی خدمت میں بھی اسی طرح کے سپانامے پیش کئے جاتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا سپانامہ سوسائٹی کے انگریزی سکریٹری کولڈ اسٹریم کی خدمت میں ۱۸۶۵ء ہی میں پیش کیا گیا جبکہ ان کا تبادلہ لاہور کے لئے ہو گیا تھا۔ سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا، جس میں غالب کا لکھا ہوا یہ سپانامہ پیش کیا گیا۔

”صاحب جمیل المناقب... جناب مستطاب ولیم کولڈ اسٹریم صاحب بہادر سے عرض کیا جاتا ہے کہ آج دہلی میں جو شخص حق گزار اور حق شناس ہے، آپ کے تشریف لے جانے سے بہت غمگین اور ادا اس ہے۔ آپ کے باعث سے اس شہر میں علم نے وہ رواج پایا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے دلی کو خطہ یونان بتایا۔ انبیاء کے معجزوں میں بڑا معجزہ ہے مردے کو جلانا، مگر ہمارے نزدیک اس سے کم نہیں ہے جاہل کو عالم بنانا... روح، مرئی جسم کی اور علم، مرئی عقل کا ہے۔ دانش مند لوگ کیوں نہ جانیں کہ علم رتبے میں روح سے سوا ہے۔

آپ جس ملک میں تشریف لے جائیں گے، جیسا یہاں والوں نے آپ سے فیض پایا ہے وہاں والے بھی فیض پائیں گے۔

مہذا، یہ بات بھی دل نشین ہے اور ہم کو یقین ہے کہ ہمارے حضرت کہیں رہیں گے ہم کو بھول نہ جائیں گے اور وہیں سے ہماری ترقی میں توجہ فرمائیں گے،
 خاتے پرسوسائٹی کے صدر مرزا الہی بخش کا نام لکھا ہوا ہے اور اس کے نیچے ۴۳ ارکان کے دستخط ہیں، جن میں پچیس دستخط اردو اور اٹھارہ انگریزی میں ہیں۔
 جنوری، ۱۸۶۷ء میں سوسائٹی کے بانی اور سرپرست کرنل ہیلیٹن نے اپنا استعفا پیش کیا تو ان کے اعزاز میں بھی ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ایک الوداعی سپانامہ پیش کیا گیا تھا۔

سوسائٹی کے سکریٹری پیارے لال آشوب کا تقرر جب لاہور بک ڈپو میں ہو گیا تو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ دسمبر ۱۸۶۸ء کے جلسے میں ان کا استعفا منظور ہوا۔ اور اسی جلسے میں سوسائٹی کی طرف سے ان کی خدمت میں ایک سپانامہ پیش کیا گیا تھا، جس پر سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے۔ مرزا غالب نے اپنی دستخط کے ساتھ یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ

”فقیر اسد اللہ غاں غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا جو غم داندوہ ہے وہ میرا حجب جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں رہا ہے۔“

کتابوں کی ترتیب و طباعت میں سوسائٹی کا تعاون :-

سوسائٹی مشرقی کتابوں اور مخطوطوں کی ترتیب و تدوین میں حکومت کی مدد کرتی تھی۔ اس نے عطیات اور رکنیت کی فیس وغیرہ سے متعدد ہرقم جمع کر لی تھی، جس کا ایک

۱۔ اردوئے معلیٰ، مرتبہ سید تقی حسین ص ۲۵-۱۱۴۴

۲۔ ایضاً ص ۱۱۴۵

۳۔ مختار الدین، احوال غالب ص ۱۹۰

۴۔ بحوالہ مرحوم دہلی کالج، ص ۱۶۷، اور احوال غالب ص ۱۹۲

حصہ انگریزی کتابوں کے تراجم کی طباعت و اشاعت کیلئے مخصوص تھا۔ سوسائٹی کے نائب سکریٹری ٹچمن داس نے دسن کی ”رگ وید“ اور ایسری سنگھ نے ”The History of America“ کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی پرانی کتابوں اور مسودوں پر نظر ثانی کر کے ان کی طباعت و اشاعت کے لئے گورنمنٹ سے سفارش کیا کرتی تھی۔ اس کے تحت بہت سی کتابیں جو اب تک مراحل طباعت سے نہیں گزری تھیں یا نایاب تھیں، شائع کی گئیں۔ ان میں قصہ مصنفہ، قصیدہ ملکہ وکٹوریہ (نظم) اور تاریخ خاندان تیموریہ (نظم) کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

سوسائٹی کے چند مباحث :-

سوسائٹی اپنے عہد کے اہم مسائل اور اخلاقی امور پر کبھی بحث و مباحثہ کیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ہندو قانون تبدیلیت کو اس نے اپنے سبب کا موضوع بنایا تھا کیونکہ اس قانون میں بعض تبدیلیوں کی حکومت خواہش مند تھی۔

۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے وائسرائے کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس سے مشرقی علوم اور ہندوستانی زبانوں کی ہمت افزائی ہو سکے۔ اس عرضداشت کی ایک کاپی سوسائٹی کو بھی ارسال کی گئی تھی تاکہ وہ اس پر بحث و مباحثہ کر کے اپنے عندیے سے گورنمنٹ کو مطلع کر سکے۔ چنانچہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کا ایک خاص جلسہ منعقد ہوا اور بحث کا موضوع یہ تجویز ہوا کہ ”ہم ترجموں کے ذریعے یورپ کے علوم پر قادر ہو سکتے ہیں لیکن اس قدر نہیں جو انگریزی میں ان کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔“ اس کی حمایت و مخالفت میں ارکان کی رائیں سامنے آئیں۔ پیارے لال آشوب نے اس موضوع پر بولتے ہوئے کہا تھا کہ

سے بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۵۶

”یہ امر شاید خلاف واقعہ ہے۔ دیکھو مسلمانوں میں جس قدر علم آدھ سب ترجموں کے ذریعے سے عربی میں آیا۔ عربوں نے یونانیوں کی کتابیں ترجمہ کیں اور اس امر کی شاید یہ بات ہے کہ علم طب جو آج تک مسلمانوں اور ایشیا کی قوموں میں پائی جا رہی ہے وہ یونانیوں کی ہی ایجاد ہے۔“

عہدہ داران کی تبدیلیاں :-

سوسائٹی کے قیام کی ابتداء سے کیپٹن کولڈ اسٹریم اس کے اعزازی معتمد تھے بعد میں مسٹر بوائلین جج دہلی نے ان کی جگہ سنبھالی، جب آگرہ میں ان کا بھی تبادلہ ہو گیا تو ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو مسٹر اسمتھ ان کے جانشین مقرر ہوئے، مگر مئی، ۱۸۶۶ء میں ان کا تبادلہ بھی مراد آباد کیلئے ہو گیا تو پادری دہلے ان کی جگہ کیلئے نامزد ہوئے۔ ایک سال بعد وہ بھی اس عہدے سے دستبردار ہو گئے۔ فروری ۱۸۶۸ء میں کارسٹیفن نے اس عہدے کو عزت بخشی۔ لیکن نائب صدر کی حیثیت سے سوسائٹی کے خاتمے تک لال صاحب سنگھ صاحب ہی سرفراز رہے۔

اسی طرح سے کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے سکریٹری بھی بدلتے رہتے تھے ۱۸۶۹ء میں جب پیارے لال آشوب لاہور چلے گئے تو ان کی جگہ پر چند لال کو مقرر کیا گیا۔ سجن لال کا یہ خیال خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ جب چند لال کا تبادلہ کمشنری دفتر میں مترجم اعلیٰ کے عہدے پر ہو گیا تو ان کی جگہ پر مولوی ذکار اللہ کو مقرر کیا گیا۔ کیونکہ سوسائٹی کا سکریٹری اس شخص کو بنایا جاتا تھا جس کا مستقل قیام دلی میں ہوتا تھا۔

۱۔ بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۵۷

۲۔ سجن لال نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۸۲

۳۔ ایضاً ص ۸۲

جلسہ تہذیب لکھنؤ ۱۸۶۸ء

اردو شعر و ادب کی پرورش و پرداخت میں لکھنؤ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ روہیلوں، جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں اور بیرونی حملہ آوروں نے دلی پر پے در پے حملے کئے۔ ان کی ریشہ دوانیوں اور چہرہ دستیوں سے یہاں کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا اور یہاں کے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تو بیشتر صاحب کمال حضرات نے دلی کو خیر آباد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مستقر و مسکن بنایا۔ ارباب علم کے ورود سے لکھنؤ کی شان اور علمی فضا میں چار چاند لگ گئے، لیکن جلد ہی دوسرے علمی مراکز کی طرح لکھنؤ میں بھی علم و ادب کا چراغ بجھنے لگا۔ لکھنؤ کے چند پیش مندا اور اہل قلم حضرات نے اپنی زبان و تہذیب کی بقا و تحفظ کے پیش و نظر یکم فروری ۱۸۶۸ء کو "جلسہ تہذیب لکھنؤ" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی یہ اس انجمن کا مقصد خاص طور سے اردو زبان و ادب کی تعلیم و ترویج اور اردو کتابوں کی تصنیف و اشاعت تھا۔ شہر کے سربراہ آدرہ لوگ اس کے ارکان منتخب ہوئے۔

جلسہ تہذیب کے تحت ایک کتب خانہ، ایک دارالمطالعہ اور دو مدرسوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ان مدرسوں میں اردو زبان اور دوسرے علوم و فنون کے پہلو بہ پہلو صنعت و حرفت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کی طرف سے "رسالہ جلسہ تہذیب" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا گیا تھا۔

اردو شعر و ادب کی ترقی اور اشاعت کا ایک ذریعہ شاعرہ بھی ہے۔ جلسہ تہذیب کی جانب سے سال میں کئی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں دو خانہ سیٹھوں کی کوشش اور تنگ و دو سے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۴ء تک ہندوستان کے آٹھ بڑے شہروں میں بزم شاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان مشاعروں کی حیثیت تاریخی ہے۔ چنانچہ

۱۰ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو ص ۳۵

”گلدستہ سخن“ کے عنوان سے کانپور، دلی اور لکھنؤ میں ہونے والے مشاعروں کی روداد شائع ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کا جو مشاعرہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۲ء کو لکھنؤ میں ہوا تھا وہ جلسہ تہذیب ہی کے زیر اہتمام ہوا تھا یہ جلسہ تہذیب لکھنؤ لوگوں کی بے توجہی سے ختم ہو گیا، لیکن اس کا کتب خانہ اور دارالمطالعہ ”رفاہ عام ایسوسی ایشن“ کی عمارت میں اب بھی باقی ہے، جسکی وجہ سے اس انجمن کا نام بھی زندہ ہے۔ جلسہ تہذیب کی جانب سے اردو کی چند مفید اور کارآمد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن افسوس کہ یہیں ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

یونیورسٹی اور نیشنل کالج، لاہور۔ ۱۸۷۰ء

ڈاکٹر لائٹرنے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں لاہور کے سربراہ اور دہ لوگوں نے شرکت کی۔ اس جلسے میں اسفہوں نے یہ تجویز رکھی کہ مشرقی و مغربی علوم کے فروغ کے لئے لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم ہونا چاہئے، تاکہ اس صوبے میں دیسی زبانوں کو فروغ حاصل ہو سکے۔ شروع میں ڈاکٹر موصوف نے اس یونیورسٹی کا نام ”اور نیشنل یونیورسٹی“ یا ”مشرق دارالعلوم“ تجویز کیا اور اس کی ہیئت کے متعلق بتایا تھا کہ

”یہ ہندوستان کا قومی دارالعلوم ہوگا، جو مشرقی علوم و ادب اور مغربی فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہوگا جس کا خاص مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان میں مغربی علوم کی عمارت کو دیسی زبانوں کی عمارت پر اٹھانا چاہئے۔“

اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس یونیورسٹی کے قیام

۱۔ منشی نول کشور، سیریاچ، گلدستہ سخن ص ۳

۲۔ انجم رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ (غیر مطبوعہ) ص ۲۱۵

سے اس علاقے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ جس سے علوم و فنون کی تعلیم عام لوگوں کی دسترس میں ہوگی۔ اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے ۶۵ سربراہ آدرہ لوگوں کے دستخط سے ایک یادداشت لفٹنٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس منصوبے کی تائید میں انگریزوں نے سبھی کافی کوششیں کیں اور ایک کمیٹی بنا کر اس کے لئے رقمیں فراہم کیں۔ اس کے علاوہ انجمن پنجاب نے اپنے متعدد جلسوں میں اس مطالبے کو دہرایا۔ لیکن اس وقت یہ آواز صدا بہ صحرائی ثابت ہوئی۔ آخر میں عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انجمن پنجاب نے ۱۸۶۵ء میں ایک اور نمیل کالج قائم کیا۔ یہ کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک مقابل پاٹھ شالا میں چلنے لگا۔ بالآخر حکومت پنجاب نے ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو ایک کالج کے قیام کی منظوری دیدی۔ اس کے ایک سال بعد ۲۷ دسمبر ۱۸۶۹ء کو اس کا قیام عمل میں آیا۔ شروع میں اس کا نام لاہور یونیورسٹی کالج تھا لیکن بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے پنجاب یونیورسٹی کالج کر دیا گیا۔ اس کے قیام کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

(۱) دیسی زبانوں میں یورپین سائنس کا فروغ

(۲) دیسی لٹریچر کی اشاعت

(۳) مشرقی کلاسیکی زبانوں کی توسیع و ترقی کی بہت افزائی ہے

۱۱ جنوری ۱۸۶۰ء کو گورنر پنجاب میکلوڈ نے لاہور یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ اس کے پہلے رجسٹرار ڈاکٹر لائٹن اور پرنسپل مسٹر اجرنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۰ء ہی میں ڈاکٹر لائٹن اس کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے اور ۱۸۶۶ء تک وہ اس عہدے پر مامور رہے۔

۱۔ انجمن رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظامِ تعلیم کا حصہ ۱ غیر مطبوعہ، ص ۲۱۵

۲۔ ایضاً ص ۲۱۶

۳۔ بحوالہ یونیورسٹی اور نمیل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور دیسی سرمایہ ص ۵

اس کالج میں تعلیم کے دو شعبے قائم کئے گئے۔ مشرقی کلاسیکی زبانوں کی تحصیل اور دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کیلئے اور نیشنل کالج قائم کیا گیا۔ دوسرا شعبہ جنرل نالج کا تھا، جس میں سائنس، انجینئرنگ اور طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کالج کا الحاق یونیورسٹی سے کر دیا گیا اور اس کا نام یونیورسٹی اور نیشنل کالج کر دیا گیا۔ اب یہ اور نیشنل کالج کے نام سے مشہور ہے۔

اپنے قیام کے زمانے سے اب تک یہ کالج مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ان زبانوں میں تحقیق کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کالج کے موجودہ پرنسپل محمد باقر کے بقول ۱۹۸۰ء میں جب اس کالج کی بنیاد پڑی تو ڈاکٹر لائٹسٹرا اور ان کے رفقا تحقیق و تصنیف کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔۔۔ تحقیق کا یہ رجحان اور نیشنل کالج کو دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتا ہے۔

اس کالج میں سنسکرت، عربی، فارسی، پشتو اور گریکھی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ مشرقی زبانوں کے اساتذہ جو انیسویں صدی تک اس کالج سے وابستہ تھے، کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء	ہید مولوی	(۱) مولانا فضل الحسن سہارنپوری
۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۶ء	ہید منشی	(۲) مولانا عبدالحلیم بکلا نوری
۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۸ء	سکند منشی	(۳) مولوی محمد دین
۱۸۸۴ء تا ۱۹۲۲ء	”	(۴) مولوی محمد دین مختار
۱۸۸۱ء تا ۱۹۰۵ء	”	(۵) قاضی ظفر الدین
۱۸۸۳ء تا ۱۹۱۴ء	”	(۶) مولانا عبدالشہ لٹونکی
۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۰ء	”	(۷) محمد حسین آزاد

۱۔ بحوالہ یونیورسٹی اور نیشنل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ص ۱ (الف)

اور نیٹل کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم اردو یا ہندی میں دی جاتی تھی، لیکن بحیثیت مضمون اردو یا ہندی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، اردو اور ہندی تعلیم کا انتظام سب سے پہلے علی الترتیب، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں کیا گیا تو اردو تعلیم کے لئے سب سے پہلے محمود شیرانی کا تقریر بہ حیثیت اردو لکچرر کے ہوا۔ ان کی اردو خدمات محتاج بیان نہیں اس کے بعد جتنے بھی اردو لکچررز کا تقریر ہوا مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابوللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح اردو سے متعلق ہزاروں کتابیں اس کالج کے اساتذہ نے تصنیف کی ہیں۔ ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کر رہے ہیں۔ جو انیسویں صدی میں تصنیف یا تالیف کی گئی ہیں۔

نام مصنف یا مترجم	نام کتاب
مولوی غلام	(۱) تاریخ تموریہ کا اردو ترجمہ
سید شاہ چراغ	(۲) حدائق البلاغت اردو ترجمہ
لالہ بشن لال	(۳) ٹیلر کی قدیم تاریخ (ایک حصے کا اردو ترجمہ)
مولوی غلام مصطفیٰ	(۴) " (اقتباس کا اردو ترجمہ)
محمد غضنفر	(۵) تاریخ انگلینڈ اردو ترجمہ
لالہ گنگارام	(۶) Jod under Suraton "
منشی عبد الغزیز	(۷) درنا درہ اردو ترجمہ
ڈاکٹر امیر شاہ	(۸) واسکوگی کی کسٹری "
"	(۹) المنٹری فرکس "
ڈاکٹر رحیم خاں	(۱۰) میڈیکل جوریس پروڈی منس "
لالہ گنگارام	(۱۱) عمارتی سامان (تصنیف)

۱۱۔ یہ سات کتابیں ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے پریس سے شائع ہوئیں۔

مولانا فضل الرحمن	اردو ترجمہ	Saba Muallagu (۱۲)
”	”	عربی بیان (۱۳)
محمد دین	”	منتخبات اخلاق ناصری کا (۱۴)
”	”	ہملٹن کی میٹا فزکس (جلد اول) (۱۵)
غلام مصطفیٰ	”	ٹرگنومیٹری (۱۶)
”	”	varina اناٹومی (۱۷)
محمد غضنفر	”	Epitom کی تاریخ انگلستان (۱۸)
پنڈت جناردن	”	خلاصۃ الاخلاق (جلالی) (۱۹)
پیرزادہ محمد حسین	”	Hydrostatics (۲۰)
بابو سانسو جیش مکرجی	”	انٹنس آف جورسیر وولنس (۲۱)
امرنا سھ	”	گنسوٹ کی فزکس (۲۲)

انجمن اسلام بمبئی - ۱۸۷۴ء

سر سید احمد خاں کی طرح جنوبی ہند میں ایک ممتاز قانون دان بدرالدین طیب جی کو بھی مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی پسماندگی کا احساس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی کے چند روشن خیال، فیاض اور بہی خواہ مسلمانوں کے تعاون سے ۲۱ فروری ۱۸۷۴ء کو "انجمن اسلام" کے نام سے بمبئی میں ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ جدید تعلیم کی ترویج و ترقی کے پہلو بہ پہلو انجمن کا یہ مقصد بھی تھا کہ

"مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ممتاز اسلامی کلچر کا تحفظ کیا جائے اور تبدیلیاں اور اصلاحات اس انداز سے رو بہ کار لائی جائیں کہ وہ ہندوؤں کے طور پر یا بے جوڑ ظاہر نہ ہوں بلکہ ایک فطری ارتقار کے طور پر رونما ہوں۔ ہم وہ سب کچھ سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں جو تمام دوسرے لوگوں کے طریقوں، مراسم اور زندگیوں میں قابل قدر ہے۔"

بدرالدین طیب جی کے بھائی قمرالدین طیب جی اس انجمن کے صدر، ناخدا محمد علی روگھے نائب صدر اور منشی غلام محی الدین دلوانی و منشی غلام محمد اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان میں منشی ہدایت اللہ، عبداللہ دھرمسی، رحمت اللہ سایانی، فتح علی شیخ احمد اور جیراج بھائی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بدرالدین طیب جی نے اس وقت کوئی منصب قبول نہیں کیا۔ بعد میں انھیں اعزازی سکریٹری مقرر کیا گیا۔ ۲۱ ارکان پر مشتمل اس انجمن نے اسی روز ۱۴۹۷ روپے کا فنڈ جمع کر کے اپنے کام کا باقاعدہ آغاز کیا۔

۱۔ ایس۔ ایس۔ سنوی، مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۱

ڈاکٹر میمونہ دلوی کے بقول اس کے قیام کی تاریخ ۱۸ اپریل ۱۸۷۶ء ہے، جو درست نہیں

(بمبئی میں اردو ص ۳۴۰)

۲۔ بحوالہ مسلم انڈیا (جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۱)

انجمن کی سالانہ ممبری فیس بارہ روپے طے پائی۔ ۱۹۷۳ء تک اس فیس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

چونکہ انجمن اسلام کا اصل مقصد مسلمانوں میں علم و ادب کی اشاعت و ترویج تھا۔ اس لئے اس کے بانیوں نے اس کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ بمبئی میں ہندوستانی زبان کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ لیکن انجمن کی کوششوں اور کاوشوں سے مبادیوی کے جی۔ٹی۔ سی اسکول میں یکم مارچ ۱۹۷۸ء سے ہندوستانی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انجمن کی طرف سے ہر طالب علم کو مفت کتابیں فراہم کی گئیں اور چھپس روپے کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس کے بعد انجمن کی طرف سے بمبئی میں مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کا سروے کیا گیا اور ایک خط ڈائریکٹر آف پبلک انٹرکشن کو ارسال کیا گیا، جس میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب بیان کئے گئے تھے۔ اس میں ایک اہم سبب یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ

”بمبئی میں کوئی ایک بھی ایسا اسکول نہیں ہے جس میں محمدن بچے انگلش تعلیم ہند (اردو) میڈیم سے حاصل کر سکیں، جو کہ ہندوستان میں محمدن آبادی کے ایک عظیم تر حصہ کی مادری زبان ہے۔“

اس کے بعد ٹاؤن ہال میں ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں بمبئی کے سبھی فرقے کے مسلمان جمع ہوئے۔ اس جلسے میں ۳۶ ہزار روپے جمع کئے گئے جن میں سے دس ہزار ناخدا محمد علی روگھے ہی کے تھے، جس کا مقصد مسلمان بچوں کے لئے اسکول قائم کرنا تھا۔ حکومت کی جانب سے بھی پانچ سو روپے ماہانہ کا وعدہ کیا گیا۔ چنانچہ ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کو انجمن کا پہلا اسکول معرض وجود میں آیا۔ تین اساتذہ اور ۱۳ طلبہ سے اسکول میں درس

لے بحوالہ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۱

۱۱ ص ۱۱

تدریس کا کام شروع ہوا اس میں ہندی، اردو، فارسی، گجراتی، مراٹھی اور انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول کو جبل روڈ کے قریب حاجی زین العابدین کے امام بارگاہ میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اسکول بہت جلد مقبول انام ہوا۔ چنانچہ طلباء کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کے پیش نظر ۹ کمروں پر مشتمل ایک مکان پایدھونی پولیس اسٹیشن کے مقابل نوے روپے ماہانہ کرائے پر دو سال کے لئے لیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ مکان بھی ناکافی ہو گیا۔ اس لئے ناگپاڑہ میں ۲۰ جون ۱۹۸۲ء کو اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ شروع میں محض سات بچوں نے داخلہ لیا، لیکن سال کے اختتام تک ان کی تعداد بڑھ کر ۹۰ تک پہنچ گئی۔

انجمن کے بانی شروع ہی سے اسکول کی ذاتی عمارت کے لئے کوشاں و فکر مند تھے، اس کے لئے حکومت سے بھی کوشش کی جا رہی تھی۔ بالآخر حکومت نے نہ صرف یہ کہ انجمن کو ایک قطع زمین فراہم کر دی بلکہ اس کی عمارت کے لئے ۳۳ ہزار روپے بھی دینے کا وعدہ کیا۔ لہذا ایک لاکھ ۳۸ ہزار روپے کی لاگت کے تخمینہ سے اسکول کی عمارت کا کام شروع کیا گیا۔ ۳۱ اگست ۱۹۸۸ء کو بمبئی کے گورنر لارڈری نے خشت اول رکھ کر سنگ بنیاد کی تقریب کا آغاز کیا۔ اس موقع پر انجمن کے بانی اور اعزازی سکریٹری بدرالدین طیب جی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

”میں سمجھتا ہوں کہ ہم اپنا اصل مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے اگر ہم نے اپنی کوشش معیار تعلیم کو محض ہائی اسکول کی سطح تک پہنچانے تک محدود رکھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے آگے بڑھتے جانا چاہئے، تاکہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک کالج کے قیام کی پوزیشن میں آجائیں، جہاں سے ہم اپنے نوجوانوں کو یونیورسٹی میں بھیج سکیں۔“

جب اسکول کی عمارت بنکر تیار ہوئی تو ۲۹ فروری ۱۹۹۳ء کو اس کا جشن افتتاح منایا گیا۔ اس پر سرت موقع پر بھی بمبئی کے گورنر لارڈ بیرس کو مدعو کیا گیا تھا۔

انجمن کی طرف سے اردو، انگریزی اور گجراتی زبانوں میں ہفتہ وار اخبارات جاری کئے گئے۔ اردو میں ”مرآة الاخبار“ کے نام سے جو اخبار ۱۹۵۸ء سے جاری کیا گیا تھا منشی نور شید حسن طیش اس کے ایڈیٹر اور جو انٹ ایڈیٹر محمد امین زبیری مقرر ہوئے۔ انگریزی اور گجراتی میں جو اخبارات جاری کئے گئے تھے ان کے نام مانیٹر (Monitor) تھے۔

تعلیم نسواں کے سلسلے میں انجمن نے اہم رول ادا کیا ہے، پہلے اس نے سحانی پردہ پرائمری گرنس اسکول قائم کیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب بمبئی میونسپل کارپوریشن نے تعلیم کی ذمہ داری قبول کی تو انجمن نے اپنا یہ اسکول کارپوریشن کے سپرد کر دیا اور اس سے ہونے والی بچت سے ۱۹۳۶ء میں کھادک محلہ میں ایک گرنس ہائی اسکول قائم کیا۔ یہ ریاست کا پہلا غیر سرکاری اردو سکندری اسکول تھا۔ اسے جون ۱۹۳۸ء میں بمبئی کے مرکزی محلہ بیلاسی ڈڈ پر صابو باغ کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں لڑکیوں کے لئے ایک دوسرا سکندری اسکول جاری کیا گیا۔ اس طرح شہر بمبئی میں ۱۹۴۶ء تک انجمن کے زیر انتظام چار اردو میڈیم اسکول قائم ہو چکے تھے۔

انجمن نے پیشہ وارانہ تعلیم (Vocational Education) کے میدان میں بھی مثبت قدم اٹھایا۔ ریاست میں اس کی جانب سے سب سے پہلا کامرس اسکول قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں جس کا انجمن واحد ٹرسٹی تھا، ایک مکنیکل ہائی اسکول سیکشن کا اضافہ کیا گیا۔ اس ادارے کو بعد میں ڈگری کالج میں تبدیل کر دیا گیا، جس میں ڈگری اور ڈپلوما کورسز آئی۔ ٹی۔ آئی طرز کے کورسز نیز جزوقتی (Part Time) ڈپلوما کورسز کا انتظام کیا گیا ہے۔

انجمن کی جانب سے پرائمری اسکول کے ٹیچروں (خاتون ٹیچروں) کی ٹریننگ کیلئے ایک ادارہ ”جونیر اسکول آف ایجوکیشن فار وومن“ قائم کیا گیا۔ یہ اسکول اب گرنس اسکول میں قائم ہے۔ انجمن کے تحت بمبئی میں چھوٹے بڑے متعدد ادارے قائم ہو گئے ہیں، جو تعلیم کے تقریباً

سبھی میدانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔
 لیکن انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ ”اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ“ کا قیام ہے۔ یہ
 ادارہ ۱۹۲۷ء میں وجود میں آیا۔ سید نجیب اشرف ندوی اس کے روح رواں تھے۔
 اس کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے ہے۔ ڈاکٹر دیوانیدرکمار گپتا نے اس انسٹی ٹیوٹ کے حرب ذیل
 مقاصد بیان کئے ہیں۔

- ۱۔ ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کرنا۔
- ۲۔ تحقیقی کام کرنے والوں کی اعانت کرنا۔
- ۳۔ کتب خانوں کا قیام اور ان کی امداد اور مختلف کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی
 فہرست تیار کرنا۔

۴۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت اور تحقیقی رسالے کا جاری کرنا۔

ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے انجمن نے ۱۸۸۱ء میں جوہائی اسکول قائم کیا تھا اسے پورٹ
 گریجویٹ کالج میں منتقل کر دیا۔ ”کتاب نما“ کے تحت اردو میں شائع ہونے والے علمی و تحقیقی
 مضامین کی نشان دہی کی جاتی ہے، تاکہ ریسرچ اسکالرز اس سے استفادہ کر سکیں! انجمن
 کی طرف سے ایک کتب خانے کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس کا شمار بمبئی کے ایک اہم اور مفید
 کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ قاضی عبدالکریم پور بندری نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی
 اور دوسری زبانوں میں ۴۴۱۸ کارآمد اور بیش بہا کتب میں انجمن کی لائبریری کو
 تفویض کی تھیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے حامد اللہ ندوی نے جامع مسجد بمبئی کے
 کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے شائع کر دی ہے۔ علاوہ برس متعدد
 میاری کتابیں بھی شائع کی جا چکی ہیں، جن میں سید ظہیر الدین کی ”دلی گجراتی“ اور مرزا مظہر
 جان جاناں اور ان کا کلام ”مصنف عبدالرزاق قریشی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ دیوان
 غالب کے اردو اور ہندی ایڈیشن، انجمن کے تحت پریس ”ادبی ٹرننگ پریس“ سے چھپ کر شائع

۱۔ اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ) ص ۱۳۰

کئے جا چکے ہیں، جن کی بہترین طباعت پر وزارت اطلاعات و نشریات نے ہندوستان میں طبع ہونے والی کتابوں میں پہلا انعام دیا تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ایک علمی و تحقیقی مجلہ "نوائے ادب" کے نام سے جاری ہے۔ اس کے پہلے مدیر سید نجیب اشرف ندوی تھے۔ بعد ازاں ادارت کا قلمدان عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا گیا۔ یہ رسالہ پہلے سے ماہی تھا لیکن اب اسے ششماہی کر دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ روشنی کا مینار ہے۔

سندھ مدرسہ اسلامیہ، کراچی ۱۹۸۲ء

۱۹۸۲ء میں امیر علی کے ہاتھوں نیشنل محمدن ایسوسی ایشن کی بنیاد پڑی۔ اس ایسوسی ایشن کے تحت متعدد ادارے وجود میں آئے جن میں سندھ مدرسہ اسلامیہ بھی شامل ہے۔ امیر علی کسی مقدمے کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے کہ ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق تقریر کی اور باشندگان کراچی سے یہ اپیل کی کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر اس عظیم شہر میں ایک مدرسہ قائم کریں۔ چنانچہ ان کی موجودگی ہی میں ۱۹۸۲ء میں "سندھ مدرسہ اسلامیہ" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس مدرسے کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینا تھا۔

یہ مدرسہ جو اب ایک کالج کی شکل میں موجود ہے اور اس کے زیر نگرانی متعدد اسکول اور کالج چل رہے ہیں، علم و ادب کی ضوفشانی سے مسلم طلبہ کے قلب و جگر کو منور کر رہے ہیں۔ یہ مدرسہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے علاوہ تالیف و تصنیف کے کام میں اپنی خدا پش کر رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر اردو میں متعدد مفید اور کارآمد کتابیں معرض وجود میں آئیں۔

لے ایس، ایس، سنوی۔ مسلم انڈیا (اردو)، جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۳

انجمن حمایت الاسلام لاہور۔ ۱۸۸۴ء

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے پیش نظر لاہور کے چند دردمندوں نے مارچ ۱۸۸۴ء میں "انجمن حمایت الاسلام" کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کا مقصد تھا۔

(۱) اسلام کے مخالفین کا جواب تحریری و تقریری طور پر دینا اور اس کے لئے واعظوں اور رسالوں کا جاری کرنا

(۲) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۳) مسلمانوں میں اصلاح معاشرت، دینی و دنیوی علوم کی تحقیق اور باہمی اتفاق کا شوق پیدا کرنا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے سب سے پہلے ناظرین اور واعظوں کا تقرر عمل میں آیا۔ دو برس کی تک و تا کے بعد لاہور میں لڑکیوں کے لئے دس ابتدائی مدرسے قائم کئے گئے اور لڑکوں کے لئے بھی چند مدرسوں کا انتظام کیا گیا۔ ان تعلیم گاہوں میں، عربی، فارسی اور دینی تعلیم کے علاوہ اردو اور انگریزی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ انجمن نے ۱۸۸۵ء سے "حمایت الاسلام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۲۶ء سے ہفتہ وار نکل رہا ہے۔

۱۹۳۵ء میں اس انجمن کی جانب سے لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ علاحدہ ڈگری کالج کھولے گئے۔ رفاہ عام کے سلسلے میں اس کے کارناموں میں "یتیم خانہ" اور "سی دارالامان" کا قیام ہے، جو تقسیم ہند کے بعد بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش و پرداخت کا کام انجام دے رہا ہے۔ فی الحال اس انجمن کے تحت ۴۲ ادارے ہیں، جن میں دو ڈگری کالج، ایک انٹرمیڈیٹ کالج، ایک طبیہ کالج، سات ہائی اسکول، پچیس جوئیر ہائی، تعلیم بالغاں کے لئے دو ادارے، ایک صنعتی مرکز، دو دارالشفقت اور ایک دارالاطفال شامل ہیں۔

لے دیوانیدرکارگپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ) ص ۱۳۵

درس و تدریس کے علاوہ یہ انجمن تصنیف و تالیف کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتی ہے کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے اس نے ایک پریس اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے اور الاشاعت کی جانب سے تاریخ، سیرت، سوانح، تعلیم و ثقافت کے موضوعات پر بہت سی بلند پایہ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ سر محمد اقبال کی برسوں تک اس انجمن کے صدر رہے۔ اس کے سالانہ جلسوں میں اسفہوں نے اپنی کئی نظمیں پڑھیں۔

ابتدا میں اس انجمن کا مقصد صرف تبلیغ مذہب تھا، لیکن رفتہ رفتہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے مسائل اس کے دائرہ عمل میں داخل ہو گئے۔

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ۔ ۱۸۸۶ء

سر سید کی شخصیت بہت پہلو دار تھی، جس میں مصلح، ادیب، ناقد، مبلغ اور بالغ النظر صحافی وغیرہ کی حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں، انہوں نے متعدد سوسائٹیاں اور مدرسے قائم کئے ابتدا میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بحیثیت ایک قوم کے، فلاح و صلاح کی کوشش کرتے رہے لیکن ۱۸۶۸ء میں جب بنارس کے چند سربراہ اور وہ ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں اور دفتروں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کرنے اور اس کی جگہ پر ہندی زبان اور ناگری پی کو جاری کرنے کی تحریک چلائی تو سر سید کی فکر و نظر میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سر سید کہتے تھے کہ ”یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش محال ہے۔“ اسی زمانے میں جبکہ بنارس میں اردو کو ہٹانے کا پرجا عام تھا، ایک روز سر سید بنارس کے کسٹمر سٹریٹکسپیر سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے، گفتگو ختم ہونے کے بعد کسٹمر نے کہا ”آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال

ظاہر کرتے تھے۔ ”سر سید کے خالص مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے بارے میں غور و فکر کرنے کے یہی محرکات تھے۔

سائنسٹک سوسائٹی جس کا ذکر بالتفصیل ”تیسرے باب“ میں کیا جا چکا ہے، ہندو اور مسلمان دونوں کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کی داغ بیل بھی ڈالی جا چکی تھی، جس کا مقصد بھی صرف مسلمانوں کی تعلیم و ترقی نہ تھا۔ لیکن ان دو اداروں کے برعکس انہوں نے، ۲ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڑھ میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج و اشاعت تھا۔

اس کانفرنس کی طرف سے اردو زبان و ادب میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں شائع کی گئیں۔ اس کا سالانہ اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوا کرتا تھا۔ اس اجلاس میں قوم کے سربراہ اور مشاہیر شخصیتوں کے علاوہ سر سید کے رفقا بھی شامل ہوا کرتے تھے اور وہ لوگ مسلمانوں کی تعلیم اور فلاح و بہبود سے متعلق تقریریں کیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک اس کے معتمد سید وقار الملک رہے۔ جب ”انجمن ترقی اردو“ قائم ہوئی تو اسے اس کانفرنس کا ایک شعبہ قرار دیا گیا۔ اب یہ کانفرنس صرف نام کے لئے باقی ہے اور اس کا دفتر آج بھی علی گڑھ میں موجود ہے۔ لیکن اب اس کی سرگرمیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

اردو لٹریچر پرموٹنگ سوسائٹی بمبئی۔ ۱۸۹۴ء

بمبئی کے چند زبان پرور اور علم دوست حضرات نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کیلئے ۱۸۹۴ء میں ایک انجمن ”اردو لٹریچر پرموٹنگ سوسائٹی“ کے نام سے قائم کی تھی۔ اس

۱۔ بحوالہ علی گڑھ تحریک ص ۲۵

۲۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو ص ۵۱-۲۵۰

۳۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ص ۲۲۰

کے پہلے سکریٹری محمد علی شوق منتخب ہوئے، جو بمبئی کے قدیم خاندان ”دلوی“ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سوسائٹی کو گورنمنٹ کی اعانت و حمایت حاصل نہ تھی۔ اس کے موسسین نے اپنے ذاتی خرچ سے اسے قائم کیا تھا۔ اردو میں علوم و فنون کی عمدہ اور کارآمد کتابیں تیار کرنا اس کا خاص مقصد تھا۔

سوسائٹی نے ایک پروگرام یہ بھی بنایا تھا کہ وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوائے جائیں اور جن کے مضامین عمدہ قرار پائیں گے انھیں دس روپے کا انعام دیا جائے گا۔ علاوہ برس سوسائٹی نے انعام کے لئے منتخب مضامین کو شائع کر کے مضمون نگاروں کی ہمت افزائی کا بھی اعلان کیا تھا ۱۸۹۵ء کے مضامین کے لئے حسب ذیل عنوانات تجویز کئے گئے تھے۔

(۱) اردو لٹریچر کی ترقی

(۲) تاریخ اور ناول نویسی

(۳) اردو کی تصانیف اور ان پر سنجیدہ ریویو

(۴) حالات خواجہ حافظا بلبل شیراز

(۵) سلطان محمود غزنوی کی مختصر لائف

لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان عنوانات کے مضمون نگاروں میں کن لوگوں کو انعامات ملے تھے۔ عنوانات کے ملاحظہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی آرکان اردو زبان و ادب سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے اور کتنا معلومات افزا مواد فراہم کرنا چاہتے تھے۔ سوسائٹی کا مقصد ایک پریس بھی قائم کرنے کا تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اس سوسائٹی کا مقصد اردو زبان میں علمی کتابیں تیار کرنا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی کے سکریٹری محمد علی شوق نے دو کتابیں ”فوائد علم“ اور ”فردوسی“ اور اس کا شاہنامہ لکھیں۔ جو علی الترتیب ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں شائع کی گئیں۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں ایک اور کتاب ”عمارات اسلام“ مصنفہ عبدالقادر شیدا شائع ہوئی۔

گورنمنٹ کا تعاون حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ سوسائٹی تین سال کے اندر ختم ہو گئی۔ شوق نے جنوری ۱۸۹۷ء میں ایک رسالہ ”دراغشاں“ جاری کیا، جس میں اس وقتوں نے اس سوسائٹی کے ختم ہونے پر اظہار افسوس کیا تھا۔ اگر یہ سوسائٹی کچھ دنوں تک اور زندہ رہتی تو بعید از قیاس نہیں کہ اردو زبان میں معتدبہ اور مفید کتابیں تصنیف کی جاتیں۔

اے ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ص ۳۳۸

حاصل مطالعہ

انیسویں صدی ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی تاریخ میں دور رس اور انقلابی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس صدی کے شروع ہوتے ہوتے ہماری قدیم قدروں کے انحطاط کی رفتار خاصی تیز ہو گئی اور ان کی جگہ نئی تہذیبی قدریں اپنا سکہ جانے لگیں۔ مزید بریں صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور اس کے نتیجے میں سماجی اقدار و معیار کا ڈھانچہ بھی بڑی حد تک بدل گیا۔ اس لئے انیسویں صدی کے ادب میں گونا گوں اور ہمہ جہت تبدیلیوں کا ظہور بھی ایک فطری امر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت مغلوں کی حکومت رو بہ زوال تھی ٹھیک ہی وقت ایٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی روز افزوں ترقی کا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگریز افسروں کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف ہم ہی ہم ہوں گے اور ہندوستان جیسے عظیم ملک کی عنان حکومت ہمارے ہی ہاتھوں میں ہوگی۔ چنانچہ اب بعض یہاں بہتر نظم و نسق قائم کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی زبانوں سے کامل واقفیت کے بغیر وہ اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے حفظ و اتقان کے طور پر انہوں نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، تاکہ انگریزوں سے جو ملازمین ہندوستان آئیں وہ یہاں کی زبانوں سے خاطر خواہ واقفیت بہم پہنچا کر مقامی باشندوں سے روابط استوار کریں اور کمپنی کی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنائیں، لیکن یہ سیاسی «شر» اردو زبان کے حق میں بہت بڑے خیر کا منبع بن گیا۔

چونکہ فورٹ ولیم کالج کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑے پیمانہ پر انجام دینا تھا، اس لئے کالج میں ہندوستانی ادب و شعرا کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ کالج میں تصنیف و تالیف کا کام ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہوا۔ لیکن اردو اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ یوں تو اردو میں نوشت و خواند کا آغاز چودھویں صدی عیسوی ہی سے ہو چکا تھا اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح سے

۱۸۰۰ء تک جاری بھی رہا۔ لیکن اس دور کی تصنیف شدہ کتابیں فارسی کے ادق الفاظ اور تراکیب سے گراں بار ہوتی تھیں، جنہیں پڑھنے اور سمجھنے کے لئے عوام تو عوام پڑھے لکھے لوگوں کو بھی عرق ریزی اور مغز پاشی سے کام لینا پڑتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو نثر کے الجھے ہوئے کیسوڑوں کی مشاطگی کا کام سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج ہی میں شروع لیا گیا، چنانچہ اس کالج میں اردو کی تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں لغات، قواعد، داستانیں، انتخابات اور پند و اخلاق سے متعلق کتابیں شامل ہیں، لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتابیں ایک محدود مقصد اور مخصوص حالات کے تحت لکھی گئی تھیں اس لئے ان کا دائرہ کار بھی محدود تھا۔ البتہ چونکہ ان کا اسلوب سہل و سادہ اور عام فہم تھا اس لئے بعد کے مصنفین کیلئے یہ کتابیں مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ دراصل یہی وہ کالج ہے جسکی داد و ہش اور اکرام و نوازش کی بدولت اردو نثر کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دس بارہ سال بعد کمپنی کے ملازمین کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے دو کلیدی شہروں بمبئی اور مدراس میں بھی کالج قائم کئے گئے۔ بمبئی کے تعلیمی ادارے کے بارے میں ہماری معلومات نہیں کے برابر ہے، البتہ مدراس کے "فورٹ سینٹ جارج کالج" کے متعلق مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس کالج میں تعلیمی شعبے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شعبہ بھی قائم تھا، جس میں کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اردو کی قدیم شکل "دکنی" کا اعلیٰ نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

اردو نثر کی تصنیف و تالیف کے دوسرے دور کا آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے۔ اس کا قیام فورٹ ولیم کالج کے قیام کے کوئی پچیس سال بعد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے قیام کے مقاصد فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد سے یکسر جدا تھے۔ فورٹ ولیم کالج خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف دلی کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانیوں کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ یہاں مشرقی علوم و السنہ کے علاوہ مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی، لیکن چوں کہ اس

وقت تک ان موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں اس لئے دلی کالج کے ارباب حل و عقد کی کوششوں سے اس کالج کے تحت تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کالج میں مشرقی کتابوں کی تصنیف کے علاوہ مغربی علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ اس لحاظ سے مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں دلی کالج کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔

دلی کالج کا دوسرا اہم کارنامہ اردو صحافت کو فروغ دینا بھی ہے۔ اگرچہ اردو صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء سے ہوا، لیکن اس وقت تک صحافت کا کوئی معیار متعین نہیں ہو سکا تھا۔ جب دلی کالج کے اساتذہ کے زیر اہتمام متعدد رسالے نکلنا شروع ہوئے تو ان ہی سے رسالوں کے ذریعے صحافت کا ایک معیار قائم ہوا۔ ان رسالوں میں خبروں اور طبع زاد مضامین کے علاوہ انگریزی رسالوں اور اخباروں کے تراجم بھی شائع ہوتے تھے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دلی کالج نے ایسے طلبہ پیدا کئے جنہوں نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں اور کادشوں سے اردو میں ناول نگاری، سوانح نگاری اور تحقیق و تنقید کا آغاز ہوا نیز افادی ادب کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ طلبہ آگے چل کر ہماری زبان و ادب کے معیار ثابت ہوئے۔ اردو زبان جب تک زندہ رہے گی اتکا نام بھی درخشاں ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا۔ ان میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد مولوی ذکار اللہ، مولوی کریم الدین، ماسٹر امچندر، پیارے لال آشوب، موتی لال لہوی میر ناصر علی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ”نوائذ الناظرین“ ۱۸۴۵ء سے اور ”محب ہند“ ۱۸۴۷ء سے ماسٹر رام چندر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ کالج کے استاد منشی سید محمد نے ۱۸۴۸ء سے ”تحفۃ الحدائق“ شائع کرنا شروع کیا اور ”قرآن السعدین“ انگریزی کے استاد دھرم زابن نکالتے تھے۔

انیسویں صدی کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس صدی میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۴ء میں فارسی زبان کو سرکاری سند سے اتار کر اردو کو اس کا جانشین بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری سطح پر اسکولوں اور مکتبوں میں اردو کی تعلیم کا نظم کیا گیا اور ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں "ایجوکیشنل کمیٹی" کے نام سے ایک ادارہ اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اسکولوں اور مکتبوں کے لئے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ریڈریں تیار کرے۔ چنانچہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اردو میں بھی ریڈریں تیار کی گئیں۔

اردو نثر کی اشاعت میں منشی نول کشور کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ موصوف نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا اور اس کی شاخیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا دیں۔ اس پریس سے عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور گرمکھی کے علاوہ اردو میں ہزاروں کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں میں گنتی، پہاڑے، ریڈریں، لغات، قواعد، داستانیں، اور شعرا کے دواوین و کلیات وغیرہ شامل ہیں۔

انیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ، ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان کی زمام قیادت براہ راست برٹش پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں آگئی۔ چونکہ غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی تھی اس لئے اس کے بعد حکومت نے مسلمانوں کا استحصال شروع کیا۔ ان کی تعلیم کے دروازے مسدود کئے جانے لگے، یہاں تک کہ جو جاہلادیں مشرقی علوم و فنون کی توسیع و ترقی کے لئے وقف تھیں انکا استعمال بھی دوسرے کاموں میں کہا جانے لگا۔

ان حالات میں سر سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی تعلیم و ترقی کے پیش نظر "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی۔ اس سوسائٹی کے قیام کا اصل مقصد ہندوستانیوں میں مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت تھا۔ اگرچہ سوسائٹی اپنے قیام کی پوری مدت میں محض پندرہ کتابیں شائع کر سکی، لیکن سوسائٹی کے دوسرے کارناموں کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ خود سر سید احمد خاں نے

”تہذیب الاخلاق“ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ سوسائٹی کے اخبار ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ اور ”تہذیب الاخلاق“ کو اردو نثر کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے بحیثیت مجموعی یہ دونوں رسالے اردو صحافت کی تاریخ میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ گزٹ سے پہلے اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا اور اس نے ایک روایت کی شکل بھی اختیار کر لی تھی، لیکن ان اخباروں اور رسالوں میں صحافت کو معیاری اور معنی خیز بنانے والے عناصر مفقود تھے۔ گزٹ ہندوستان کا پہلا اخبار تھا، جو صحافت نگاری کے تقاضے کو کما حقہ پورا کرتا تھا، چنانچہ مذہب سے لے کر سیاست تک کو اس نے اپنا موضوع بنایا۔ گزٹ نے ہندوستان کو ازمنہ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے جو فضائیاں کی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سوسائٹی کے دوسرے کارناموں میں اس کے جلسوں کے لکچرس اور ان موقعوں پر جدید مغربی آلات سے کئے جانے والے عملی تجربے (Practicals) بھی قابل ذکر ہیں۔ سوسائٹی کی جانب سے ایک مرتبہ گیہوں کی کاشت پر تجربہ کیا گیا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ بہر حال عوام اور خواص کے لئے سوسائٹی کے یہ کارنامے بڑی اہمیت و افادیت کے حامل رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں متعدد سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کی گئیں، جن کا مقصد جدید خیالات اور علوم جدیدہ کو فروغ دینا تھا۔ ان سوسائٹیوں نے جدید تعلیم کی تشویق و ترغیب اور نشر و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہائی کے درمیان صرف شمالی ہند میں تقریباً بیس انجمنیں قائم تھیں، جن میں دہلی سوسائٹی، انجمن پنجاب لاہور، جلسہ تہذیب لکھنؤ، محمدن لٹریچر سوسائٹی کلکتہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یہ سوسائٹیاں مغربی علوم و فنون اور مغربی افکار و نظریات کو دسی لباس میں پیش کرتی تھیں۔ یعنی ان سوسائٹیوں کے جلسوں کی کارروائیاں، مقالہ خوانی اور بحث و مباحثے وغیرہ سب اردو زبان ہی میں ہوا کرتے تھے۔ اردو زبان کے فروغ میں ان عناصر کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان

سوسائٹیوں کی جانب سے اردو میں اخبارات اور جرائد بھی شائع ہوتے تھے، جن میں ان سوسائٹیوں کی روداد اور ان میں پڑھے جانے والے مقالات کے علاوہ خبریں اور بعض علمی مضامین بھی اشاعت پذیر ہوتے تھے۔ ان میں بعض سوسائٹیوں نے اردو میں مستقل تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔ اور بعض نے مشرقی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں حصہ لیا۔

پنجاب کے دو تعلیمی ادارے ”اورینٹل کالج لاہور“ (۱۸۷۰ء) اور ”سندھ مدرسہ کراچی“ نیز ”انجمن حمایت الاسلام“ لاہور نے اردو کے فروغ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان میں اورینٹل کالج کی خدمات سب پر بھاری ہیں۔ اس کالج نے اردو ادب سے متعلق متعدد بلند پایہ کتابیں شائع کیں۔

جنوبی ہند میں بمبئی کی دو انجمنیں ”انجمن اسلام“ اور ”اردو لٹریچر پروموٹنگ سوسائٹی“ نے اردو نثر کی جو خدمات انجام دیں انھیں بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انجمن اسلام کے روشن کئے ہوئے چراغ کی ضیا پاشیوں سے آج بھی ہم سب مستفیض ہو رہے ہیں۔

ماحصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کے ان تعلیمی اداروں اور علمی سوسائٹیوں نے اردو نثر کو جو فروغ بخشا ہے وہ ہماری آنکھوں سے محض اور پوشیدہ نہیں۔ اردو نثر کی ابتدا انظم کے پہلو پہلو ہوئی اور اوائل عمری ہی سے اس میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا، لیکن اردو نثر تقریباً اپنی پانچ سو سالہ زندگی کے بحیثیت مجموعی جمود و تعطل کا شکار رہی۔ اس لئے اس میں تصنیف و تالیف کا کوئی اعلا معیار بروئے کار نہ آسکا۔ لیکن انیسویں صدی کے تصنیفی و تالیفی اداروں نے اردو نثر کو ترقی کے معراج پر پہنچا دیا۔ شروع میں لغت، قواعد اور داستانیں لکھی گئیں اور چار عشرے تک انہی موضوعات پر توجہ مبذول رہی، لیکن ساتویں دہائی تک سیرت نگاری، سوانح نگاری، تشبیہ، بیاض نگاری، مقدمہ نگاری کے علاوہ نثر کے سبھی اصناف نشانہ ناول اور مختصر نثر نے، تحقیق و تنقید، طنز و مزاح وغیرہ پر معتد بہ اور بلند پایہ تصنیفات و تخلیقات معرض وجود میں آگئیں، نیز اردو زبان کو علمی الفاظ و اصطلاحات کا دافر ذخیرہ دستیاب ہوا اور اسکی وجہ سے اس زبان میں اظہار و ابلاغ کی صلاحیتیں فروغ پانگئیں۔ اس لئے یہ دعویٰ

غلط نہیں کہ انیسویں صدی کے تصنیفی اداروں ہی کا یہ فیضان ہے کہ اردو، دنیا کی کلاسیکی زبانوں سے آنکھ لانے لگی۔

ضمیمہ الف ۱

کانج کونسل کی تیار کردہ کتابوں کی فہرست

تعداد	نام کتاب	صفحوں کی تعداد چار صفحی آدھ صفحی	رسم الخط	تخمیناً خرچ روپیہ آنا	کہاں چھپی
۵۰۰	چار درویش	-	فارسی	۱۱۴۱	۱۲ ہرکارہ پریس
"	مثنوی میر حسن	۲۰	"	۱۱۲۵	- کلکتہ گزٹ پریس
"	گلستاں	۲۰	"	۴۰۲	۲ میر پریس
"	تو اکہانی	۲۰	"	۴۰۲	۲ ٹیلی گراف پریس
"	حکایات متفرقات	۲۰	"	۴۰۲	۲ کلکتہ گزٹ پریس
"	تیسی سنگھاسن (کنڈا)	۴۰	ناگری	۴۰۲	۲ ہرکارہ پریس
"	مرثیہ مسکین	۳۲	"	۳۳۳	-
"	شکنتلا نامک	۴۰	"	۱۳۰۶	۴ کلکتہ گزٹ پریس
"	اخلاق ہندی	۲۰	"	۴۰۳	۲ ٹیلی گراف پریس
"	بیال چھپی	۲۰	"	۴۰۳	۲ میر پریس
"	مادھول	۲۰	"	۴۰۳	۲ ہرکارہ پریس
"	ہفت گلشن	۲۰	فارسی	۴۰۳	۲ میر پریس

۲ ۹۴۱

۱۹۲ ۲۱۰

۵۰۲

کل تعداد صفحی

ضمیمہ الف ۲

گل کرسٹ کی انعام کے لئے ارسال کی ہوئیں تصانیف، ان کے مصنفوں کے نام اور

سفارشات۔

صغوں کی تعداد انعام چارتھی اٹھپچی میں خاص	مصنف	ہندستانی تصانیف (جو چھپا چکی ہیں)
۲۰۰ ۵۰۰ -	گلستان یا باغ اردو	میر شیر علی افسوس
کی وجہ سے میں نے مصنف کے لیے ایک ہزار روپیہ نہیں لکھا۔		
۴۰۰ ۳۰۰ -	تاریخ چرن، امانت اللہ، سدل مسر، بہادر علی، افسوس، لولال گوی اور غلام اشرف	نقلیات تقمانی
تین بطور خاص اجرت کے متحق ہیں کیونکہ ننگلی، عربی اور سنسکرت کا انہی پر پڑا اور تاریخی چرن کے آؤ سب سے زیادہ		
۱۰۰ ۲۵ -	مظہر علی خاں	پندنامہ (نظم میں)
انہوں نے ان کہانیوں کا انتخاب اپنے گھر اور کبھی کبھی دوسرے منشیوں کی مدد سے کیا اور ان کا موازنہ اور ترجمہ کیا۔	میر بہادر علی	نقلیات حصہ اول (بیویں میں)
۱۲۸ -	"	نقلیات حصہ دوم

قرآن شریف	بہادر علی، امانت اللہ	۵۰۰ - ۱۵۰۰	اگر انعام دینے میں کو اعتراض ہو تو ان میں سے دو مولویوں کو ۸۰۰ روپیہ تنخواہ ملنا چاہیے اور مرزا جو اس کو جو اس وقت ۸۰ روپیہ پاتے ہیں کم از کم ۱۰۰ روپیہ مشاہرہ ملنا چاہیے۔ اس ترجمے سے میر بہادر علی کی حقیقی قابلیت کا اظہار ہوگا۔
حاتم طائی	حیدر بخش حیدری	۳۰۰ - ۴۰۰	یہ ایک اچھی تصنیف ہے ہر مشرق کو پسند ہوگی۔
پریم ساگر	شری لال کوی	۲۵۰ - ۲۰۰	انعام اتنا کم اس لیے کہ مصنف ۵۰ روپیہ ماہانہ پاتا ہے۔
شرعے نظیر	میر بہادر علی	۱۵۰ - ۱۵۰	دونوں نہایت کارآمد کتابیں ہیں۔
اخلاق ہندی	"	۱۶۰ - ۱۵۰	دوسری مشہور ہو پبلشنگ کے فارسی ترجمہ "مفرح القلوب" کا ترجمہ ہے۔
گل بکاوی	نہال چند	۲۰۰ - ۱۵۰	
(پرس بھیجنے کے لیے تیار)			
سنگھاسن بتیسی	مزا کاظم علی جو اس	۱۹۰ - ۲۰۰	
بارہ ماسا (نظم میں)	"	۱۴۰ - ۲۰۰	یہ ایک طبع زاد نظم ہے، اور اتنی اچھی بن پڑی ہے کہ مصنف بہت
شکنتلا نامک	"	۱۴۰ - ۲۰۰	سے انعام کا مستحق ہے
بتیال پھسی	مظہر علی خاں ولا	۱۴۰ - ۲۰۰	یہ تینوں مناسب تصانیف ہیں لیکن جن کے لیے کوئی خاص بات نہیں کہی گئی انہیں
مادھونل	"	۱۵۰ - ۹۰	کی طرح ان کے بارے میں بھی کوئی خاص بات
ہفت گلشن	"	۱۰۰ - ۸۰	نہیں کہنی تے

۳۰۰	-	۳۰۰	غلام اکبر	تواریخ بنگلہ
۳۰۰	-	۳۰۰	حاجی مرزا مغل	بوستاناں (شریں) (جو پھپھکی ہیں)
۵۰۰	-	۵۰۰	خلیل خاں	امیر حمزہ
۴۰	۱۰۰	-	"	کائنات جو
۸۰	۱۶۰	-	حمید الدین	خوان الوان
۶۰	۱۵۰	-	سدل مسر	چندرا دتی
۴۰۰	-	۶۰۰	میر امن	اخلاق محسن (گنج خوبی)
۱۰۰	-	۲۰۰	کندن لال	کلا کام
۳۰۰	-	۳۰۰	شری (للو) لال کوی	راج نیستی
۲۰۰	-	۲۰۰	جید بخش	گلدستہ (جیدری)
۵۰	۱۰۰	-	میر ابوالقاسم	حسن اخلاط
۶۰	۱۵۰	-	باسط خاں	گل و صنوبر
۶۰	۱۱۰	-	توتارام	دل ربا
۵۰	۱۵۰	-	محمد بخش	فیروز شاہ
۲۰	۲۰	-	میر جعفر	مسکس کاشیہ (شر) (جو پریں لے لیے تیا کی جا رہی ہیں)
۳۰۰	-	۳۰۰	غلام شاہ بھیک	تواریخ السلاطین
۸۰	۶۰	-	"	قہر دل و حسن
۵۰	۱۰۰	-	محمد بخش	صہ فرعون
۴۰۰	-	۴۰۰	محمد عمر	تواریخ عالم گیری
۲۰۰	۲۰۰	-	منصور علی	سیف الملوک

یہ اور مندرجہ ذیل تین دوسری تاریخی کتابیں ہندوستانی درجہ کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

۲۰۰	-	۳۰۰	شاگرد علی	الفائیلہ
۴۰۰	-	۶۴۰	تصدق حسین	توارخ تیموری
۴۰۰	-	۳۰۰	غلام اشرف	اخلاق النبی
۱۵۰	۱۰۰	-	معین الدین	پند نامہ صنف فرید الدین (نظم میں)
۱۰۰	۲۰۰	-	غلام حیدر	گل و ہرمنز
۵	۱۰۰	-	شیخ محمد بخش	دہ جبال
۱۵۰	-	۲۵۰	غلام سبحان	در مجلس
۱۰۰	-	۲۰۰	حیدر بخش	جامع القوانین

اس فہرست کو دیکھنے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۹- اگست ۱۸۰۳ء تک ۴۵ سے زیادہ کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں، کیونکہ ۴- اپریل ۱۸۰۳ء تک ہندوستانی سے متعلق ۲۶ کتابیں تیار کی جا چکی تھیں۔ اس فہرست میں ۴- اپریل ۱۸۰۳ء تک شائع شدہ اور زیر طاعت بعض کتابیں شامل نہیں ہیں۔

۱۸۳-۱۸۲

ضمیمہ (ب)

دلی کالج کانصاب تعلیم (بابت ۱۸۵۳ء)

شعبہ مشرقی

عربی درجات

درجہ اول، فریق اول:-

(۱) درمختار ۱۰۰ صفحے (۲) دیوان حماسہ ص ۵۳۸ تا ۴۸۵

(۳) تاریخ بھینی ص ۲۴۲ تا ۳۷۴ (۴) مطول بحث اقلت تک (۵) پریم ساگر

درجہ اول، فریق دوم:-

(۱) ہدیہ انبیا الوکالت تا اختتام کتاب الغسل (۲) نور الانوار از ص ۱۰۰ تا آخر

(۳) دیوان متنبی تا ردیف لام، ۲۰۰ صفحے (۴) مسلم، کل (۵) پریم ساگر از ص ۱۰۰ تا آخر

درجہ دوم، فریق اول:-

(۱) تاریخ تیموری از ص ۲۰۰ (۲) شرح وقایہ از کتاب النکاح تا کتاب الوقت ۱۲۴ صفحے

(۳) فرائض سراجی پل (۴) پریم ساگر از ص ۱۰۰ تا ص ۲۰۰

درجہ دوم، فریق دوم:-

(۱) مقالات حریری کے ۲۰ مقام (۲) قدوری، کتاب الوقف سے آخر تک

(۳) قطبی، دوسرے باب سے بحث قیاس تک، ۱۰۰ صفحے

درجہ دوم، فریق سوم:-

(۱) کافیہ، مجرورات سے آخر تک (۲) شرح طاء، بحث فعل سے آخر تک

(۳) مقالات ہندی کے ۲۵ مقامات

درجہ دوم، فریق چہارم:-

(۱) ہدایت النہو، کل (۲) کافہ، مجرورات تک (۳) منتجات عربی، دو باب

درجہ دوم، فریق پنجم:-

(۱) دستور مبتدی، کل (۲) نوحیر، کل (۳) شرح مائتہ عامل، کل (۴) منتجات عربی، دو باب

فارسی درجات

درجہ اول، فریق اول:-

(۱) قصائد بدر چاچ، کل (۲) نصیراے ہمدانی، کل (۳) وقائع نعمت خان عالی، کل

(۴) پریم ساگر از صفحہ ۲۰۰ تا ۳۰۰

درجہ اول، فریق دوم:-

(۱) دیوان ناصر علی، کل (۲) جواہر الحروف

درجہ دوم، فریق اول:-

(۱) ساقی نامہ ظہوری، نصف اول (۲) طاہر، وحید تا اصطراب

(۳) عبد الواسع (۴) پریم ساگر ص ۵۰ تا ۱۵۰

درجہ دوم، فریق دوم:-

(۱) تل ذمن (۲) سہ نثر ظہوری (۳) قواعد فارسی (۴) بیتال پچھسی، نصف

درجہ سوم، فریق اول:-

(۱) سکندر نامہ، تاجنگ دارا (۲) رقعات عالم گیری، کل (۳) بیتال پچھسی، ۱۲ قصے

درجہ سوم، فریق دوم:-

(۱) زلیخا، نصف اول (۲) انشائے خلیفہ، نصف اول

سائنس کے درجہ

۱۸۵۰ء سے قبل عربی و فارسی کے درجات کے نصاب میں سائنس بھی شامل تھی لیکن
۱۸۵۰ء سے سائنس کی جماعت علاحدہ قائم کر دی گئی تھی، جس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔
نصاب بابت ۱۸۵۳ء

جماعت اول

- ۱۔ برنکلی (Brinkley) کی کتاب علم نسبت صفحہ ۱۵۱ تا ص ۲۵۳
- ۲۔ Ward's Algebraical Geometry حصہ دوم
ابتداء سے تیسرے باب تک اور باب ۶ اور ص ۲۸۲ تا آخر باب ہفتم
- ۳۔ تاریخ یونان

جماعت دوم۔

- ۱۔ احصائے تفرقات، کل
- ۲۔ Ward's Algebraical Geometry حصہ دوم
اٹھویں باب سے دسویں باب تک (بشمول ہر دو باب)
- ۳۔ میکائکس، مصنفہ نیگ ۳۵ دین فقرے سے ۷۲ فقرے تک
(بشمول ہر دو باب)

جماعت سوم۔

- ۱۔ Diff. Cal. ابتداء Minima اور Maxima تک
- ۲۔ وارڈ کی کتاب Quadratic مساوات درجہ دوم سے Ellips بیلی تک

۳۔ تاریخ انگلستان (اردو) ۱۰۰ صفحے (۴) ینگ کی کتاب میکائیکس ۵۵ صفحے
جماعت چہارم:-

۱۔ مفاح الافلاک، نصف اول ۲۔ علم مثلث (ٹرگنومیٹری)

۳۔ الجبرا۔ دوسرا باب اور چوتھے باب کے تین حصے ۴۔ تاریخ انگلستان (اردو)
جماعت پنجم:-

۱۔ اقلیدس کے چھ مقالے اور گیارہویں مقالے کی ۲۱ شکلیں ۲۔ رسالہ مساحت، کل
۳۔ تاریخ بنگال (اردو) کل (۴) الجبرا ۶۴ صفحے
جماعت ششم:-

۱۔ اقلیدس پہلے چار مقالے ۲۔ حساب
جماعت ہفتم:-

۱۔ اقلیدس پہلا مقالہ ۲۔ حساب تا کورا اعشاریہ

شعبہ انگریزی

نصاب بابت ۶۱۸۵۲

First English Class in Litterature:-

1. Shakespeare's Hamlet.
2. Milton's Paradise Lost.
3. Bacon's Essays.
4. Mackintosh's Ethical Philosophy.
5. Elphinstone's History of India.

First class - First Division in Math.

1. Differential and Integral calculus.
2. Mechanics and Conic Section.

2-Mechanics and Conic Section.

3-Webster's Hydrostatics

First Class Second Division in Math:-

1-Mechanics. 2-Hammett's Conic Section.

3-Webster's Hydrostatics. 4-Surveying. 5-Drawing

Second class in Literature and Math. —

1-Addison's Spectator, 100 Pages

2-Pope's Essay on Criticism.

3-Dryden's Absalom and Achitophel.

4-Keightley's History of England Vol. I with corresponding Geography.

5. انورسپیی

6. باغ و بهار

7. Plane Trigonometry and the nature and use of Logarithms.

8. Algebra as far as the Geometric Progression.

9-Euclid 21st. Proposition 11th. Book with revision of whole.

Third class in literature and math.

1-Goldsmith's Traveller.

2-Combett's Pleasure of Hope.

3-Goldsmith's Essay to six letters.

4-Masshman's India the whole.

5-Euclid 6 Book, 21st Proposition of the 11th Book.

6. Bridges Algebra as far as Quadratic Equations.
7. Natural Philosophy

۸- گل بکاوی
۹- مفید صبیان



ضمیمہ ج

- سائنٹفک سوسائٹی سے ترجمے کے لیے عبداللطیف خاں کی پیش کردہ فہرست
 ۱۔ رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی جو اور صاحب کے دائرہ علوم میں سے لیے جاویں۔
 ۲۔ رابرٹسن اور پرسکٹ صاحب کا رسالہ درباب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے۔
 ۳۔ ہبولٹ صاحب کی سیاحی کے حالات اور نیز حالات ^{سایا} اور کسی مصنف کے
 ۴۔ تاریخ خلفاء عباسیہ ۵۔ گلیک صاحب کی تاریخ انگلستان
 ۶۔ رسالہ درباب ترکیب اور نظام سلطنت انگریزی
 ۷۔ رسالہ درباب ^{سایا}
 ۸۔ ایک پرائس صاحب کا رسالہ درباب فن فوٹوگرافی، یعنی سورج کے عکس سے تصویر

کھینچنے کا فن

- ۹۔ رسالہ درباب امریکہ کی ترکیب اور انتظام موجودہ کے
 ۱۰۔ تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان
 ۱۱۔ حیات نامے مشہور مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے
 جو زمانے کے لوگوں کے نام یہ مشہور ہیں۔
 ۱۲۔ انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سنگ اور اشعار سنگ
 سے متعلق ہے۔

- ۱۳۔ کانیا صاحب کا رسالہ درباب ترکیب جسم انسانی کے
 ۱۴۔ ڈاکٹر اے۔ کانیا صاحب کی طبیعات متعلقہ تندرستی اور تعلیم
 ۱۵۔ ڈاکٹر سوٹنر کا رسالہ درباب سلامتی عقل
 ۱۶۔ بیلیٹ صاحب کا رسالہ درباب حقوق انسانی اور حقوق کی حفاظتوں کی
 ۱۷۔ ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کا رسالہ درباب تار برقی کے
 ۱۸۔ سٹی پائپر صاحب کا رسالہ درباب استعمال بجلی متعلقہ ملے کرنے کے

ماخذ و مصادر

- ۱۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات۔ رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۶۲ء
- ۲۔ "نیزنگ خیال، مرتبہ جعفر رضا۔ رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۷ء
- ۳۔ "مقالات محمد حسین آزاد، (حصہ اول، مرتبہ آغا محمد باقر) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
- ۴۔ اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر، تحقیقی جائزے (حصہ اول)، مکتبہ ادبستان سری نگر کشمیر ۱۹۶۶ء
- ۵۔ تحقیقی نوارد، اردو پبلسٹک مارگ لکھنؤ ۱۹۶۷ء
- ۶۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۷۷ء
- ۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد (حصہ اول)
- ۸۔ اکرام علی، شیخ مولوی، اخوان الصفا مرتبہ ڈاکٹر احراز نقوی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
- ۹۔ احسن مارہروی، تاریخ نثر اردو۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۶۰ء
- ۱۰۔ امام مرتضیٰ نقوی، باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ۔ الواعظ صنف پریس لکھنؤ ۱۹۷۰ء
- ۱۱۔ اسپننگر، ڈاکٹر، یادگار شعرا مترجم لیل احمد چندستانی ایڈیٹ الہ آباد ۱۹۶۶ء
- ۱۲۔ "آرپ ڈیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۵ء
- ۱۳۔ اصغر عباس، ڈاکٹر، سیرت کی صحافت، انجمن ترقی ادب و فن دہلی ۱۹۷۵ء
- ۱۴۔ "انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف لٹریچر، آرپ ڈیش اردو اکادمی ۱۹۷۶ء
- ۱۵۔ اشفاق احمد اعظمی، اندیر احمد شخصیت اور کارنامے نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۴ء
- ۱۶۔ افسوس، شیر علی، آرائش مغل۔ تہ قلب علی خاں۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء
- ۱۷۔ اقبال، افضل الدین، مدراس میں اردو ادب کی نشوونما، ماہنامہ اول، مبین پبلی کیشنز، آہلہ آباد ۱۹۷۹ء

- ۳۸۔ خواجہ احمد فاروقی چراغ رہ گند
- ۳۹۔ خورشید نعمانی، ڈاکٹر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، رحیمی پریس ممبئی ۱۹۷۷ء
- ۴۰۔ رام بابو سکینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مطبع منشی تیح کمار لکھنؤ ۱۹۷۹ء
- ۴۱۔ رفیق مارہروی، ہندوؤں میں اردو، نسیم بک ڈپو لکھنؤ
- ۴۲۔ سید جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقا، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۷۲ء
- ۴۳۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء
- ۴۴۔ سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق مرتبہ اے۔ صمد، نازپبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۲ء
- ۴۵۔ " " " " الخطبات الاحمدیہ
- ۴۶۔ " " " " اسباب بغاوت ہند، مرتبہ فوق کریمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۱ء
- ۴۷۔ " " " " آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی ۱۹۷۵ء
- ۴۸۔ سعادت حسین خاں، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، مرتبہ عطا کاکوروی، عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۸۶ء
- ۴۹۔ سلیمان محمود حسین، اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام، نعمانی پریس دہلی ۱۹۷۷ء
- ۵۰۔ سرور، رجب علی بیگ، فسانہ عجائب مرتبہ سید محمود رضوی، رام نراین لال بینی مادھوال آباد ۱۹۷۶ء
- ۵۱۔ سید عبداللہ ڈاکٹر، میرامن سے عبدالحق تک، چین بک ڈپو اردو بازار دہلی
- ۵۲۔ سری رام، لالہ، نمخانہ جاوید (جلد سوم)، دہلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۷۱ء
- ۵۳۔ سید محمد، مولوی، بابائے اردو، اعتماد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۷۷ء
- ۵۴۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک، آل انڈیا ایلی گنڈم مسلم یونیورسٹی ایڈیشن ممبئی
- ۵۵۔ سیر سیاح (گلدستہ سخن)، مطبع نوال کشور لکھنؤ ۱۹۷۲ء
- ۵۶۔ شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو، وزارت قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۷ء
- ۵۷۔ شیام سندر لال برقی، بہار سخن مطبع ال۔ بی۔ سیدار پور ۱۹۷۲ء
- ۵۸۔ شانسی رجن بمبٹا چاریہ، اردو اور بنگال، سرکیتی یوٹل بمبٹا چاریہ اشوکا کلکتہ ۱۹۷۹ء
- ۵۹۔ " " " " بنگال میں اردو زبان و ادب، نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۶ء
- ۶۰۔ " " " " بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، ریجنٹ پارک کلکتہ ۱۹۷۷ء

۴۱۔ شان محمد، ڈاکٹر سرسید تاریخی آئینے میں، انوار بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۴۷ء

۴۲۔ شیو پرشاد، راجہ ستارہ بند آئینہ تاریخ نامہ ترجمہ اتھاس تمنا شک (گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۹۷۸ء)

۴۳۔ شمس اللہ قادری حکیم، اردو کے قدیم، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۷ء

۴۴۔ صدیق الرحمن قدوائی، ماسٹر رام چندر، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۴۱ء

۴۵۔ صابر، مزار قادری بخش، تذکرہ گلستان سخن جلد اول مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

۴۶۔ عابد رضا بیداد، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار، انسٹیٹیوٹ آف انٹیل اسٹڈیز

رام پور ۱۹۴۹ء

۴۷۔ عبدالقادر سروری، اردو کی ادبی تاریخ، اعلیٰ پریس دہلی ۱۹۷۵ء

۴۸۔ عبدالحق، مولوی ڈاکٹر مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۴۵ء

۴۹۔ " چند اہم عصر، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۷۱ء

۵۰۔ " قواعد اردو، الناظر پریس لکھنؤ

۵۱۔ " مطالعہ سرسید احمد خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۵۲۔ " سرسید احمد خاں حالات و افکار، اردو مرکز دہلی ۱۹۶۰ء

۵۳۔ عبدالرحمن پرواز مفتی صدر الدین آزر دہ، مکتبہ جامعہ لیمٹڈ ۱۹۷۷ء

۵۴۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ہندوستانی اکیڈمی

الہ آباد ۱۹۳۶ء

۵۵۔ عبیدہ بیگم، ڈاکٹر فوزت ولیم کالج کی ادبی خدمات، نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۵۶۔ غالب اسد اللہ خاں، خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر کشمیری بازار لاہور ۱۹۶۳ء

۵۷۔ " اردو کے معنی حصہ دوم، تدوین و حواشی سید مرتضیٰ حسین، مجلس ترقی

ادب لاہور ۱۹۷۰ء

۵۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء

۵۹۔ فضل، فضل علی، کرنل کتھا، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۹۶۵ء

۸۰۔ کریم الدین، مولوی، گلستاہ نازیناں مرتبہ احمد لاری اور عطا کوری، عظیم الشان

بک پو پٹنہ ۱۹۷۲ء

۸۱۔ کریم الدین اور ایف فیلن، طبقات الشعراءے ہند طبقہ چہارم مرتبہ عطا کوروی، لیبیل بیتھک

پریس پٹنہ ۱۹۶۴ء

۸۲۔ کریم الدین طبقات شعراءے ہند، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۸۳۔ کلیم الدین، ڈاکٹر دو تذکرے، لیبیل بیتھک پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء

۸۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۹ء

۸۵۔ گنپت سہاے سر لو استو، اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ، برج باسی لال

گورالہ آباد ۱۹۶۹ء

۸۶۔ گارساں وتاسی، خطبات گارساں وتاسی، انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد

۸۷۔ لطف، مزار علی، گلشن ہند، دارالاشاعت پنجاب ۱۹۰۶ء

۸۸۔ مالک رام، قدیم دلی کا لٹ، مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، نئی دہلی ۱۹۰۵ء

۸۹۔ مسیح الزماں، ڈاکٹر معیار و میزان، رام نرائن لال پتی مادھو الہ آباد ۱۹۶۸ء

۹۰۔ محمد زبیر، اردو نثر کا تاریخی سفر، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۹۱۔ محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر گل کریسٹا اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۹۲۔ ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی عہد میں)، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۰ء

۹۳۔ صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و طلبہ سات ۱۹۶۰ء

۹۴۔ محمد مبین کیفی چریاکوٹی، جواہر سخن، ہندوستانی ایتھمی الہ آباد ۱۹۳۲ء

۹۵۔ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۹ء واقعات و شخصیات، پاکستان ایتھمی جی، آباد

کراچی ۱۹۷۶ء

۹۶۔ محمد اکرام التائی، وقار حیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۵ء

۹۷۔ منظر عباس، ڈاکٹر وحید الدین سلیم حیات اور ادبی کائنات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

۹۸۔ مہتممی، غلام ہمدانی مذکورہ ہندی دریا میں افحسا، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اوکھلا ۱۹۳۳ء

۹۹۔ مسعود حسین خاں، اردو کا المیر مرتبہ خلیل احمد بیگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۱۰۰۔ میمونہ دلوی، ڈاکٹر بی بی میں مہر دو، وکٹوریہ کالونیاں، لاہور ۱۹۷۰ء

- ۱۰۱۔ - - - - ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، دارالمصنفین اعظم گڑھ
۶۱۹۴۳
- ۱۰۲۔ مختار الدین، احوال غالب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۶۱۹۵۳
- ۱۰۳۔ محمود الہی ڈاکٹر، بازیافت، دانش محل لکھنؤ ۶۱۹۴۵
- ۱۰۴۔ مشتاق حسین، مکاتیب سرسید احمد خاں، فرینڈس بک ڈپو ہاؤس علی گڑھ ۶۱۹۴۰
- ۱۰۵۔ محی الدین قادری زور، اردو کے اسالیب بیان، مکتبہ معین الادب لاہور ۶۱۹۴۲
- ۱۰۶۔ مہدی افادی، افادات مہدی، ایاس ٹریڈرس حیدرآباد ۶۱۹۴۴
- ۱۰۷۔ محبوب رضوی، سید، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول، دارالعلوم دیوبند ۶۱۹۴۴
- ۱۰۸۔ میرامن، باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لیمٹڈ نئی دہلی ۶۱۹۴۴
- ۱۰۹۔ " " باغ و بہار مرتبہ سلیم اختر، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۶۱۹۴۴
- ۱۱۰۔ " " گنج خوبی مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ۶۱۹۴۶
- ۱۱۱۔ نادم سیناپوری فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۶۱۹۵۹
- ۱۱۲۔ نظامی بدایونی، قاموس المشاہیر، نظامی پریس بدایوں ۶۱۹۲۴
- ۱۱۳۔ نسیم قریشی، علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۶۱۹۴۰
- ۱۱۴۔ نجم الدین نقوی، منتخب سوانح اور خاکے، انوار بک ڈپو لکھنؤ ۶۱۹۴۴
- ۱۱۵۔ نساخ۔ عبدالغفور، قطعہ منتخب، مطبع نول کشور لکھنؤ
- ۱۱۶۔ نور اللہ اور بیٹے۔ پی۔ نایک، تاریخ تعلیم ہند، ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۶۱۹۴۳
- ۱۱۷۔ وفاراشدی، بنگال میں اردو، اردو پیشنگ ہاؤس دہلی
- ۱۱۸۔ وحید قریشی، یونیورسٹی اور نیشنل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرتما، لاہور ۶۱۹۴۰
- ۱۱۹۔ " " کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ مکتب ادب جدید لاہور ۶۱۹۴۵
- ۱۲۰۔ وقار عظیم، ہماری داستانیں، ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۶۱۹۴۴
- ۱۲۱۔ وقار الملک، نواب، خطوط وقار الملک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۶۱۹۴۴
- ۱۲۲۔ - - - - وقار، مجلہ وقار الملک ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مدیر عبید صدیقی ۶۱۹۴۴

English Books

- 123 Beale, W.T. An Oriental Biographical Dictionary
- 124 Blackland, C.E. Dictionary of national Biography, Ed. 1916
- 125 George Smith, the concise dictionary of national Biog-
 Part 1. Oxford University Press London, 1952.
- 126 Grierson, G.A. Linguistic Survey of India Vol. IX Calcutta 1916
- 127 Keay, F.E. A History of Hindi Literature, Oxford University
 Press London, 1933
- 128 Lester, Stephen and Sydney Lee, Dictionary of National
 Biography, Vol. VIII London 1885
- 129 Mirānsarān al-Ḥadīth and time of carry Vol. I
 Mirānsarān and word London, 1859.
- 130 M. S. Sastry, Origin of Modern Hindustani Literature,
 Naya Kitab Ghar Aligarh 1963
- 131 Selected Sentences from Educational Records Pt II
 Calcutta, 1922
- 132 Selected Sentences from Educational Record Pt I
 Calcutta, 1922
- 133 The evolution of Urdu, Colebrook and the language
 of the British in India, 1972
- 133 Dr. Muhammad, A History of English Education
 in India 187-1923, Calcutta 1895
 Urdu Edition
- 134 Urdu and English, Urdu and English, Urdu and English

۱۳۱ (۱) واہجہ فیہ ہندوستانی لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

۱۳۵ (۱) جہانگیر، (۱) واہجہ فیہ ہندوستانی لکھنؤ، ۱۹۵۸ء
ہندوستانی لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

۱۳۶ (۱) واہجہ فیہ، ۵۱۰ لکھنؤ، ۱۹۵۸ء (۱۹۵۵-۱۹۵۸)
لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

۱۳۷ (۱) لکھنؤ، ہندوستانی لکھنؤ، ۱۹۵۸ء
لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

عربی :-

۱۳۸. عبدالحی حسنی، مولانا، نزہۃ الخواطر و بیحۃ المسامح والنواظر، جلد ۱،

دائرة المعارف العلمانیہ حیدرآباد ۱۹۵۹ء

غیر مطبوعہ :-

۱۳۹. انجم رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ ۱۹۸۱ء

۱۴۰. بین نراین دہلوی، تفریح طبع، مملوکہ ڈاکٹر حنیف نقوی، ریڈر شعبہ اردو بتارس ہندو یونیورسٹی

۱۴۱. دیوانندر کمار گپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے، ۱۹۸۰ء

۱۴۲. شانتی رجن بھٹا چاریہ، تذکرہ تصانیف بنگال

انجارات اور جرائد

۱۴۳. آج کل، دہلی اکتوبر ۱۹۴۳ء

۱۴۴. " (اردو تحقیق نمبر) اگست ۱۹۴۷ء

۱۴۵. " جنوری ۱۹۸۰ء

۱۴۶. اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء

۱۴۷. جامعہ، فروری ۱۹۸۰ء

۱۴۸. " جولائی ۱۹۸۰ء

- ۱۷۲۔ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۳ء
- ۱۷۳۔ " اکتوبر ۱۹۶۵ء
- ۱۷۴۔ " اپریل ۱۹۶۷ء
- ۱۷۵۔ " اکتوبر ۱۹۶۷ء
- ۱۷۶۔ نیادور لکھنؤ نومبر ۱۹۶۱ء
- ۱۷۷۔ " (اطفال نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء
- ۱۷۸۔ " اپریل ۱۹۶۵ء
- ۱۷۹۔ " اپریل ۱۹۸۰ء
- ۱۸۰۔ " اگست ۱۹۸۰ء
- ۱۸۱۔ " ستمبر ۱۹۸۰ء
- ۱۸۲۔ " اکتوبر ۱۹۸۰ء
- ۱۸۳۔ " جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء
- ۱۸۴۔ ہفتہ وار ہماری زبان علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء
- ۱۸۵۔ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی یکم مارچ ۱۹۸۱ء
- ۱۸۶۔ ہندوستانی اپریل جون ۱۹۸۱ء
- ۱۸۷۔ پگڈنڈی سالنامہ ۱۹۵۹ء
(پہلا کارواں)
- ۱۸۸۔ فکر و نظر سہ ماہی، علی گڑھ جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء
- ۱۸۹۔ " دوسرا کارواں
(انگریزی)
- ۱۹۰۔ Radiance, weekly 13-19 Sept. 1987



بمیل
، دلی
چار
بے
ا
ت
مل
موا
ط
ب
م
پ
ا



یہ ایک خاصا منصوبہ بند تحقیقی مقالہ ہے۔ مصنف نے تمام ممکن اور قابل حصول مواد سے کام لیا ہے اور بڑی کوشش اور احتیاط کے ساتھ تیسری چیز جزیات کا استقفا کیا ہے

کیوں نہ ہو، اس تحقیقی سفر میں مقالہ نگار کی راہنمائی ایک ذی علم اور اردو میں اپنی مہم و فراست اور تحقیقی تقویٰ کے اعتبار سے معتبر و معروف شخصیت ڈاکٹر حنیف نقوی نے کی ہے،

اس مقالے کے پہلے باب میں فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم کی خدمات کو منظر عام پر لائے اور تازہ ترین علمی و تحقیقی مواد کو سامنے رکھ کر نہایت خوش سلیقگی سے انکی ادبی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اس قدر جامعیت اور اختصار کے ساتھ اردو کے موجودہ تنقیدی سرمایہ میں کوئی دوسری کتاب موجود نہیں جو ڈاکٹر سمیع اللہ کی اس تصنیف کے مد مقابل رکھی جاسکے مقالہ کا دوسرا باب دہلی کالج کی ادبی خدمات کے اوراق پارینہ کو الٹ کر انکی قدر و قیمت سے ہمیں آگاہ کرانے کے لئے وقف ہے۔ اردو کے طلبہ کو مصنف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس موضوع پر انہوں نے ہماری موجودہ نسل کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔

مقالہ کا تیسرا باب علیگڑھ کی مہتمم ہاشان سائنٹفک سوسائٹی کے تجزیے پر مشتمل ہے جس کے تحت بہت سی معیاری علمی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا جو تھے باب میں ان اداروں کے زیر اثر عالم و خود میں آئے والے اور بہت سے علمی و تحقیقی اداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے آخر میں اس موضوع کے پورے دائرہ کار کا احاطہ کیا ہے اور اپنے سابع کو اس انداز میں پیش کر دیا ہے کہ پوری تصویر واضح طور پر ابھر کر سامنے آجائی یہ مقالہ صحیح معنوں میں ایک تحقیقی کارنامہ ہے اور اس بات کی شہادت بھی کہ مصنف صحیح فیصلہ کرے اور تنقیدی جامع پرکھ کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا ادبی استوہی معیاری ہے

ڈاکٹر سید عبدالباری
صدر شعبہ اردو، جی ایس پی جی کالج (ادوہ یونیورسٹی) سلطان پور